جنت کے لیے سرگرداں

ضیاء الدین سردار

ترجمہ

مسعود اشعر

Ebook By

Anis ul Hassah Shah

https://web.facebook.com/Shah.AnisulHassan/

https://wa.me/message/923142893816

جنت کے لیے سرگرداں

ضیاء الدین سردار

ترجمہ

مسعود اشعر

فہرست

پیش لفظ

یہ ضیاء الدین سردار کی انگریزی کتاب Deparately Seeking Paradise کا اردو ترجمہ ہے، جو تین سال ہوئے لندن سے شائع ہوئی۔

تقریباً سب مذاہب نے انسان کو جنت کا تصور دیا ہے، یعنی اس دنیا کے بعد ایک ایسی جگہ کا تصور جہاں اسے ہر طرح کا عیش و آرام میسّر ہوگا اور اس دنیا کے سارے دکھ اور کلفتیں پیچھے رہ جائیں گی۔ اسلام نے جنت کا جو تصوّر قرآن میں پیش کیا ہے وہ ایک تو بہت مفصل ہے دوسرے وہ بہت تکرار کے ساتھ پڑھنے والے کے سامنے آتا ہے۔ چنانچہ ہر مسلمان کے دل میں عمر بھر یہ خواہش دبی رہتی ہے کہ مرنے کے بعد اسے جنت نصیب ہو اور ایک روایت سے اس امر کا اشارہ ملتا ہے کہ ایک مسلمان چاہے اس نے زندگی میں برے کام ہی زیادہ کیے ہوں، کچھ عرصہ سزا بھگتنے کے بعد بالآخر جنت میں ہی جائے گا۔

جنت کی خواہش ضیاء الدین سردار کے دل میں بھی ضرور موجود ہوگی۔ ایسے میں ایک دن کیا ہوا کہ دو داڑھی والے صاحبان نے ان کے گھر پر دستک دی۔ جب انھوں نے دروازہ کھولا اور علیک سلیک کے بعد وہ لوگ اندر آئے تو اگلے ہی لمحے میں فرمایا کہ ”اللہ کے فضل و کرم سے ہم یہاں آپ کو جنت کا راستہ دکھانے آئے ہیں۔“ اس کے بعد کچھ تعارف ہوا اور اس موضوع

پر کچھ باتیں ہوئیں اور آخر انہوں نے اپنے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا "ہمیں اور آپ کو دعوت پر نکلنا چاہیے، یہی جنت کا راستہ ہے۔" یہ تبلیغی جماعت کے لوگ تھے۔ دعوتِ تبلیغ کے عمل کی برکتوں کے بارے میں ان کی لمبی چوڑی تقریر سننے کے بعد ضیاء الدین سردار کو قدرتی طور پر تجسس ہوا کہ ان کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر دیکھا جائے کہ کیا واقعی ان کا راستہ جنت کی طرف جانے والا ہے۔ چنانچہ کئی دن وہ ان کے تبلیغی دوروں، ان کی عبادات اور ان کے ذکر واذکار کی مجلسوں میں ان کے ساتھ رہے۔ اس دوران میں ان کے ایک اور مبلّغ کے ساتھ ہی ان کا تبادلۂ خیال ہوا۔ لیکن اس ساری مشقت سے گزرنے کے بعد وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ "جب ان لوگوں نے میرے گھر دھاوا بولا تھا اُس کے بعد سے اب تک نہ تو میں جنت کے قریب پہنچا ہوں اور نہ میرے دماغ میں جنت کا تصور واضح ہوا ہے۔ میں وہیں ہوں جہاں اس سے پہلے تھا۔ میں نے ان سے جو سیکھا وہ یہ تھا کہ ان کا فارمولا میرے کام کا نہیں۔"

ان کا فارمولا یہ تھا کہ دنیا بھر میں اور خاص طور پر مسلم ملکوں میں ناانصافی اور ظلم وستم کا جو دور دورہ ہے، جس نے کروڑوں لوگوں کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے اُس کے بارے میں کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں اور نہ کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ بس "اگر مسلمان اپنی عبادات میں سچے ہوجائیں، خدا کو یاد کریں اور اس کائنات میں اپنے مقام کو پہچانیں تو پھر یہ ناانصافیاں خود بخود ختم ہوجائیں گی۔"

تبلیغی جماعت کے مقاصد اور ان کے طرزِ عمل سے مایوس ہوکر ضیاء الدین نے اپنی تلاش جاری رکھی۔ اس سے پہلے وہ برطانیہ اور آئرلینڈ کے طلبہ کی ایک اسلامی انجمن (FOSIS) کے ساتھ منسلک ہوچکے تھے۔ اس تنظیم کے لوگ اپنے عظیم الشان ماضی کے احیاء کے لیے سرگرمِ عمل تھے۔ ان کے رسالے The Muslim کے لیے عالمِ اسلام کے تمام ممتاز اسکالر اور اسلامی تحریکوں سے متعلق لوگ مضامین لکھ رہے تھے، ان لوگوں نے خاص طور سے اسلامی تحریکوں کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کر رکھا تھا۔ ان میں دو عالم گیر تحریکیں ایسی تھیں جو انہیں اپنا گرویدہ بنانے کے لیے ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ ان میں ایک تھی، مصر کی اخوان المسلمون اور دوسری تھی پاکستان کی جماعتِ اسلامی۔

ضیاء الدین نے ان دونوں تحریکوں کو بہت قریب سے دیکھا۔ انہوں نے نہ صرف مولانا مودودی کی تحریروں کا مطالعہ کیا بلکہ ان سے ملاقات بھی کی اور جماعت کے کچھ دوسرے

سربرآوردہ اصحاب سے بھی ملے۔ لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ مولانا مودودی کے نزدیک اسلامی شریعت ایسا بنا بنایا فریم ورک ہے جو امت کے سارے مسائل حل کر سکتا ہے۔ ان کی فکر میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جو اسلام کے عالمی تصورِ حیات کے ضمن میں کوئی نئی بات بتا سکے۔ علاوہ ازیں عورتوں کے بارے میں ان کی رائے یہ تھی کہ وہ پیدائشی طور پر کم تر مخلوق ہیں جنہیں گھر کی چار دیواری میں ہی رہنا چاہیے۔ پھر یہ کہ جماعت والے فکری جہاد اور علم کے ساتھ وابستگی کی باتیں تو بہت کرتے تھے، لیکن جماعت کے جن ارکان سے بھی وہ ملے ان کا علمی معیار بہت کم تر درجے کا تھا۔

کچھ اسی طرح کا تجربہ ضیاء الدین کو اخوان المسلمون کے بارے میں ہوا کہ ان کے جتنے ارکان سے بھی ان کی ملاقات ہوئی وہ سب انہیں مذہبی جنونی معلوم ہوئے۔ ان کا عقیدہ دراصل ان کا ہتھیار بن گیا تھا۔ وہ اپنی لڑائی میں موت سے نہ صرف یہ کہ ڈرتے نہیں تھے، بلکہ پاگل پن کی حد تک اس کو گلے لگانے کے لیے بے قرار رہتے تھے۔ یہ ان کے سادہ لوح دماغوں پر مذہب کا طلسماتی اثر تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ انہیں مرنے کے بعد جنت میں دودھ، شہد، شراب اور خوبصورت حوریں ملیں گی۔ ان کی آنکھوں میں عقیدے کی پختگی کی چمک دکھائی دیتی تھی۔ ضیاء الدین کہتے ہیں ''اخوان کے ارکان کے ساتھ میرا یہی جھگڑا تھا۔ وہ اپنے آپ کو کامل انسان سمجھتے تھے۔۔۔ ان کے نزدیک اسلام ایک نظریہ تھا، ایسا نظریہ جس میں نامکمل ہونے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس سے ذرا سا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوا جا سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں ان میں سے اکثر کو ناپسند کرتا تھا۔''

ضیاء الدین سردار جنت کی تلاش کا یہ سفر جاری رکھتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ایک کے بعد ایک ملک میں جاتے ہیں اور ہر ملک کے سیاسی و معاشرتی حالات اور وہاں کے اربابِ اختیار اور عام لوگوں کے ساتھ ان کے تعامل کو قریب سے دیکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس سفر میں زندگی اور آخرت کے بارے میں مختلف نظریات اور مذہبی عقائد اور تعلیمات، نیز تصوّف کے مخصوص طبقوں سے بھی آشنائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے اس زمانے کی ایک Pilgrim's Progress تھی۔ اس فرق کے ساتھ کہ جان بنیان کی یاترا ایک تمثیل (allegory) کی صورت میں تھی جس میں اس نے اپنے روحانی تجربات کو ایک خیالی اور ڈرامائی شکل دی تھی جبکہ ہمارے اس یاتری کا سفر حقیقی دنیا میں کھلی آنکھوں اور سوچنے والے ذہن کے

ساتھ ہوا۔

اوپر کے دو تجربوں کے بعد ضیاء الدین اسلامی علوم (قرآن، حدیث، فقہ) کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس کے لیے انہیں ایک عالم و فاضل استاد جعفر شیخ ادریس میسّر آتے ہیں، جو انہیں پڑھانے کے ساتھ ساتھ تنقیدی فکر کی راہ پر ڈال دیتے ہیں۔ لیکن یہی فاضل استاد ایک عرصے کے بعد جب سعودی عرب جاتے ہیں تو وہاں رہتے ہوئے وہ کچھ اور ہی بن جاتے ہیں اور گھسے پٹے راستے پر چل پڑتے ہیں۔ تقریباً اسی زمانے میں پاکستانی علماء کا ایک فتویٰ شائع ہوا کہ سوشلزم کفر ہے اور سوشلسٹوں کی مدد کرنا حرام ہے۔ یہ فتویٰ سن کر ضیاء الدین بھونچکے رہ گئے اور اس کا اثر ان پر یہ ہوا کہ وہ دو عملی کا شکار ہوگئے۔ کہتے ہیں "ہفتے کے پانچ دن میں FOSIS کے لیے کام کرتا اور اس کے کارکنوں کے ساتھ رہتا۔ لیکن سنیچر اور اتوار کو میں سوشلسٹ بن جاتا۔" چنانچہ اسلامی تحریکوں میں شامل وہ اپنے بھائیوں کے مخصوص اور محفوظ حلقے کے اندر نہ رہ سکے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ سوشلزم کی بدولت مذہب کی تعلیمات اور اس کے بتائے ہوئے راستوں پر بہتر طریقے سے عمل کیا جاسکتا ہے۔ نقطۂ نظر کی اس تبدیلی کی بنا پر انہیں ناقابل اعتبار قرار دیتے ہوئے رسالے The Muslim کی ادارت سے فارغ کردیا گیا۔ اس موقع پر ان کے ایک دوست نے ان کا ہاتھ تھاما اور ان سے کہا کہ تم زیادہ روادار اور زیادہ انسان دوست اسلام سے ہی خوش رہ سکتے ہو۔ چنانچہ وہ ان کو ایک صوفی شیخ ناظم کے پاس لے گیا۔

اس طرح ضیاء الدین اپنے شکّی مزاج کے باوجود تصوّف کی راہ پر چل نکلے۔ تصوّف کے ماحول میں اور صوفیہ کی عبادتوں اور ریاضتوں کے درمیان رہتے ہوئے وہ جن گوناگوں تجربات سے گزرے وہ ایک لمبی کہانی ہے۔ لیکن دو باتیں ایسی ہوئیں جنھوں نے ان کو تصوّف سے بھی برگشتہ کردیا۔ ایک یہ کہ تصوّف میں انسان اپنے آپ کو مرشد کی رضا کے اس طرح حوالے کردیتا ہے کہ وہ اس راہ میں اپنی زندگی داؤ پر لگا دیتا ہے۔ ضیاء الدین سردار کے بھائی نے جب شیخ ناظم کے ہاتھ پر بیعت کی تو ان کی ہدایت پر اس نے اپنی اکونومسٹ کی اچھی خاصی ملازمت چھوڑ دی اور بڑھئی کا کام شروع کردیا۔ اس طرح اس نے اپنے آپ کو معاشی طور پر تباہ کرلیا۔ دوسرے یہ کہ کچھ عرصہ ضیاء الدین کی نگرانی کرنے کے بعد ایک دن صوفی شیخ احمد نے نہایت سکون کے ساتھ ان سے یہ الفاظ کہے کہ "تم جس فردوس کی تلاش میں ہو وہ ایک علامتی فردوس ہے۔ دودھ اور شہد کے باغوں اور نہروں سے بھری ہوئی۔ تمہارا جو جی چاہے ان کا مطلب نکال

لو۔ لیکن ہم فردوس سے بھی بالا کسی چیز کی تلاش میں ہیں۔ ہم رضوان یا خدا کی قربت کی تلاش میں ہیں۔ اللہ کا رضوان فردوس سے بھی عظیم ہے۔''

اپنے سفر کے اس مرحلے کے آخر میں ضیاء الدین اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ''میں تصوف کو رد تو نہیں کرسکتا کہ اس کی تہہ میں کوئی گہری اور مسحور کن چیز موجود ہے۔ لیکن موجودہ زمانے کے جن صوفیوں سے میرا واسطہ پڑا مجھے ان میں وہ روشنی اور چمک نہیں ملی ۔۔۔ یہاں مطلق العنانی اور مرشد کے گرد گھومنے والی فرقہ بندی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ جنت کو جانے کا یہ میرا راستہ نہیں ہوسکتا۔''

یہ کتاب کے پہلے چار ابواب کا ایک نہایت سرسری سا جائزہ تھا۔ کتاب کے باقی گیارہ ابواب میں لکھنے والے نے جو حالات اور تجربات بیان کیے ہیں وہ اتنے متنوع اور جزئیات سے بھرپور ہیں کہ ان کا ایک نہایت مختصر سا احوال بھی اس پیش لفظ کی حدود سے نکل جائے گا۔ بس اتنا جان لیجیے کہ ضیاء الدین سردار اس کے بعد پہلے ایران جاتے ہیں اور پھر یکے بعد دیگرے مشرق وسطیٰ کے تین چار ملکوں کی سیاحت کرتے ہیں۔ پھر پاکستان جاتے ہیں، اس کے بعد چین اور آخر میں ملائیشیا جا کر وہ اپنا یہ سفر ختم کرتے ہیں۔

ایران وہ اُس زمانے میں جاتے ہیں جب شہنشاہیت وہاں آخری دموں پر ہے اور لوگ آنے والے انقلاب کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ ''جس کے بعد حقیقی انصاف اور مساوات کا دور دورہ ہوگا اور زمین پر جنت کا نمونہ پیدا ہوجائے گا'' لیکن امام جس کی وہ لوگ بات کرتے ہیں اس کا معاملہ ضیاء کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر کوئی آدمی فرشتہ نہیں بلکہ انسان ہے تو وہ خطا سے مبرا اور بالکل معصوم کیسے ہوسکتا ہے۔

ایران کے بعد ضیاء الدین بغداد، شام، عمان اور دبئی تک جاتے ہیں۔ دبئی ''جہاں سب کچھ ہے لیکن روح نہیں ہے'' وہاں ان کی ملاقات ایک وزیر صاحب سے ہوتی ہے جن کے متعلق پتا چلتا ہے کہ انہیں سائنس اور ٹیکنالوجی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پوچھنے پر وہ فخر سے کہتے ہیں ''اس لیے کہ اگر ہم ہر چیز خرید سکتے ہیں تو اس کے بارے میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔'' اس باب کے آخر میں ضیاء کہتے ہیں ''مشرق وسطیٰ کے سفر میں میں نے خاصے فاصلے طے کیے لیکن وہ فاصلے اس سے زیادہ نہیں تھے جو وہاں کے حکمرانوں اور محکوموں کے درمیان ہیں۔''

ہمارے مسافر کی اگلی منزل مکہ اور سعودی عرب ہیں۔ وہ ایران میں دوسری مرتبہ جانا چاہتے ہیں، وہاں اسلامی انقلاب کے وہ اثرات دیکھنے کے لیے جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ''زمین پر جنت کا نمونہ پیدا ہوجائے گا۔'' لیکن لندن میں ایران کا ویزا حاصل نہ کرسکنے کی وجہ سے وہ ایران میں داخل نہیں ہوسکتے اور اس کوشش میں وہاں کے ایک وزیر کا تعلق بھی ان کے کام نہیں آتا۔ ان پر جاسوسی کا الزام لگایا جاتا ہے اور انہیں یہ کہہ کر جہاز میں سوار کردیا جاتا ہے کہ ان کی اگلی منزل کراچی ہے حالانکہ وہ جہاز زیورچ جارہا ہوتا ہے۔

ان کی بعد کی منازل میں پاکستان ہے، جس میں وہ اسلام آباد اور وہاں سے پشاور اور اکوڑہ خٹک جاتے ہیں۔ اکوڑہ خٹک کے دینی مدرسے میں وہ آج کل کی بنیاد پرستی کے نمونوں کو بہت قریب سے دیکھتے ہیں۔ اسلام آباد میں ان کی ملاقات اسلامی شریعت کے علم بردار صدر ضیاء الحق سے ہوتی ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: ''رات کے کھانے کے دوران میں انہوں نے پھر زور شور سے شریعت کے ساتھ اپنی محبت پر لیکچر دینا شروع کیا۔ جب کھانا آیا تو وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور کہا ''کیا میں آپ کو پاگل ڈکٹیٹر نظر آتا ہوں؟'' اور اپنے اس سوال کا پس منظر بتانے کے لیے انہوں نے میری کتاب Islamic Future کا ایک اقتباس پڑھ کر سنایا۔ کتاب بند کرنے کے بعد وہ ہنسے اور ان کے گرد بیٹھے ہوئے وہ تمام لوگ بھی ان کی ہنسی میں شامل ہوگئے۔''

ضیاء الدین چین جاتے ہیں اور وہاں کے مسلمانوں سے ملتے ہیں۔ وہاں سے پھر اسلام آباد واپس آتے ہیں اور یہاں انہیں زنا کے ایک کیس کے سلسلے میں ایک ایسے شرعی فیصلے سے سابقہ پیش آتا ہے جس میں مرد پر لگے الزام میں عورت کی گواہی کو تسلیم نہیں کیا جاتا اور ان معاملات میں عورت اور مرد کے درمیان مساوات نہیں برتی جاتی۔ یہ دیکھ کر ان کا یہ خیال پختہ ہوجاتا ہے کہ ''شریعت کی اصلاح کے بغیر ایک ایسا مسلم معاشرہ قائم ہونے کا خواب کبھی پورا نہیں ہوسکے گا جسے ارضی جنت کہا جاسکے۔۔۔ بہشت کی طرف جانے والا راستہ یہ ہے کہ الوہی قوانین پر نئے سرے سے غور کیا جائے۔''

جنت کی تلاش کے آخری مرحلے میں ضیاء الدین سردار مسلم ملک ملائیشیا جاتے ہیں اور وقفوں وقفوں سے وہاں ایک عرصہ گزارتے ہیں۔ رنگا رنگ ثقافتوں کی اس سرزمین کے کھلے ماحول میں وہ بہت خوش ہوتے ہیں اور بڑے جوش وخروش کے ساتھ ان امکانات کا جائزہ لیتے

ہیں کہ مسلم سپین کا ماحول دوبارہ کیسے پیدا کیا جاسکتا ہے۔ ایک اور غرناطہ اور ایک اور مسلم ملائیشیا نے بھی اسلامی اثرات کے تحت مختلف نسلوں، مختلف زبانوں اور مذہبوں کی ایک گل کاری پیدا کی ہے۔ ملائیشیا کے اسلام کو مالے کے باشندوں کی طرح نرم خو، معتدل اور متوازن کہا جاتا ہے اور یہ توازن اور نرمی تصوّف کی وجہ سے آئی ہے۔ اسپین کے اسلام پر بھی تو تصوف کے اثرات تھے۔ بعض ضرورتوں سے وہ کچھ عرصے کے لیے ملائیشیا سے چلے جاتے ہیں۔ اس دوران میں گلف کی جنگ اور دوسرے کئی واقعات رونما ہوتے ہیں اور ایک بار پھر وہ ملائیشیا آتے ہیں اور اپنے اس خیال پر جمے ہوئے ہیں کہ اس ملک میں مسلم اسپین والا کھلا اور روشن خیال معاشرہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے ان کے لیے ملائیشیا کو سمجھنا مشکل ہوتا جاتا ہے۔ کوالالمپور جو پہلے ایک چھوٹا سا شہر تھا ان کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک گلوبل پوسٹ ماڈرن شہر بن جاتا ہے۔ چاروں طرف اونچی اونچی عمارتیں اور ہر سمت قدیم روایت ٹوٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکون ختم ہوگیا اور افراتفری کا دور دورہ ہوا۔ ہر طرف امریکی کلچر تھا۔ ہر جگہ میڈونا اور مائیکل جیکسن نظر آتے تھے۔ ہر آدمی اندھا دھند بھاگ رہا تھا— اسی زمانے میں ملائیشیا کے وزیراعظم مہاتیر محمد اور ان کے سینئر وزیر انور ابراہیم کے درمیان چپقلش شروع ہوئی۔ ۱۹۹۷ء میں تھائی لینڈ، کوریا اور انڈونیشیا کے ساتھ ملائیشیا کی بظاہر طاقتور معیشت بھی بیٹھ گئی۔ انور ابراہیم کو جنسی سکینڈل میں ملوث کیا گیا اور ان پر کچھ اور الزام لگا کر انہیں گرفتار کرلیا گیا۔ انور کے قریبی ساتھی اور ان کی تقریریں لکھنے والے ایک دانشور بھی پکڑے گئے اور سلاخوں کے پیچھے ان پر تشدد کیا گیا۔ اب ملائیشیا میں رہنا مشکل ہوگیا۔ ضیاء کہتے ہیں ''یہ گویا ۱۴۹۲ء تھا اور ہم اسپین سے نکالے جا رہے تھے۔ مجھے بار بار سپین کے بن حزم یاد آرہے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ آپ کتنے ہی روشن دماغ اور سمجھدار ہوں مطلق العنانی کسی نہ کسی طرح ضرور آئے گی۔۔۔ نیز یہ کہ آپ صدیوں میں جو بہشت بناتے ہیں کوئی بھی پاگل انسان آکر اسے ایک دن میں تباہ کردیتا ہے۔''

ضیاء الدین سردار جنت کی تلاش کے سلسلے میں کئی ممالک میں گئے اور ان کے طرزِ حکومت اور وہاں کے حکام کی کارکردگیوں کا بہت قریب سے مطالعہ کیا اور اپنے تجربے سے یہ دیکھا کہ مسلم اربابِ اختیار اپنے رویّوں میں کتنے سفاک، کتنے بے حس اور ایذا پسند ہوسکتے ہیں۔ وہ اپنے کارِ منصبی کے بجالانے میں کتنی سستی، کتنی بے پروائی اور کتنی نالائقی کا ثبوت دے

سکتے ہیں۔ اس فن میں دو واقعات انہوں نے ایسے بیان کیے ہیں جنہیں پڑھتے ہوئے انسان کا دم گھٹنے لگتا ہے۔۔۔ ایک سعودی عرب میں ان کے اخراج کے ویزے کے حصول کا واقعہ جس کے لیے وہ انتظامیہ کے ایک ڈائریکٹر عبدالعزیز الترکی کے سامنے پیش ہوئے اور اپنی درخواست پر ان کی طرف سے مسلسل پندرہ دن تک ان شاء اللہ، الحمداللہ اور بکرہ (کل صبح) کی گردان سنتے رہے۔ خدا خدا کر کے آخر میں جب شیخ الترکی مناسب کارروائی کے لیے ان کے کاغذات تلاش کرنے لگے تو معلوم ہوا کہ وہ کہیں کھو گئے ہیں اور سارے کاغذات اب پھر سے تیار کرنے پڑیں گے۔

دوسرا واقعہ ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد کے زمانے میں پیش آیا۔ جب ضیاء الدین ایران میں دوبارہ داخل ہونے کے لیے گئے تو چونکہ وہ لندن میں ایرانی ویزا حاصل نہیں کر سکے تھے اس لیے کہ ایرانی سفارت خانے کا کسی نے محاصرہ کر رکھا تھا، انہیں ایران میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی گئی۔ جب انہوں نے اپنا عذر پیش کیا تو جواب ملا "تم جاسوس ہو، تمہیں ملکہ نے بھیجا ہے۔ اُدھر انگریزوں نے ہمارے سفارت خانے پر قبضہ کر لیا ہے اور اِدھر تمہیں جاسوسی کے لیے بھیج دیا ہے۔" اس سلسلے میں ضیاء الدین کی کوئی وضاحت اور کوئی دلیل قبول نہ ہوئی۔ وہ لوگ ان کو ٹھوکریں مارتے ہوئے پہلے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئے اور پھر ٹرمینل کی عمارت کے باہر ایک کمرے میں انہیں دھکیل دیا گیا۔ جس میں نہ کوئی کھڑکی تھی اور نہ کہیں سے روشنی آتی تھی۔ یہاں ان کے ساتھ سوال و جواب کا ایک طویل سلسلہ چلا اور انقلاب کے ایک ابتدائی رہنما بنی صدر کے بارے میں ان کی اچھی رائے پر ان کی سخت سرزنش کی گئی۔ ان میں سے ایک آدمی کہنے لگا "بنی صدر اب کچھ دن کا مہمان ہے۔ میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم انقلاب کے حامی ہو یا نہیں۔" دوسرا بولا "تمہارے اندر انقلاب دشمنی کا بہت بڑا رجحان پایا جاتا ہے۔ لہٰذا تمہیں واپس چلے جانا چاہیے"۔۔۔ پھر جیسا کہ اوپر ذکر ہوا انہیں زبردستی ایک جہاز میں سوار کرا دیا گیا۔

ضیاء الدین سردار (پیدائش ۱۹۵۱ء) لندن میں مقیم ایک اہلِ قلم ہیں جو اسلام کے مستقبل نیز اسلامی سائنس اور ٹیکنالوجی سے متعلق موضوعات پر لکھتے رہتے ہیں۔ ان کے کالم اتوار کو شائع ہونے والے برطانوی اخبار The Observer میں، نیز ایک دوسرے ہفت روزہ

New Statesman میں چھپتے ہیں۔ اس وقت وہ سٹی یونیورسٹی لندن میں ایک وزٹنگ پروفیسر ہیں اور اسلام، سائنسی پالیسی، ثقافتی امور اور ان سے وابستہ موضوعات پر چالیس سے زیادہ کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ انہیں ۲۰۰۵ء میں یونیورسٹی آف ایسٹ لندن سے ڈاکٹر آف لیٹرز کی اعزازی ڈگری بھی دی گئی۔ وہ رسالے Futures کے مدیر ہیں اور ایک اور رسالے Third Text میں بھی وہ دوسروں کے ساتھ مل کر ادارت کا کام کرتے ہیں۔

ان کا ایک مضمون ابھی ۱۹ جون ۲۰۰۸ء کو Fatwa Against Terrorism کے عنوان سے لندن کے رسالے New Statesman میں شائع ہوا ہے۔ اس فتوے میں دو ٹوک الفاظ میں یہ بتایا گیا ہے کہ ''اسلام کے نزدیک سوسائٹی کے اندر فساد اور بدامنی پیدا کرنا، امن کو پامال کرنا، بلوا کرنا، خون خرابہ کرنا، لوٹ مار کرنا اور دنیا میں کسی بھی جگہ بے گناہ انسانوں کو قتل کرنا —— یہ سب اعمال انتہائی غیر انسانی جرائم ہیں'' —— یہ فتویٰ دیوبند کے مفتیٔ اعظم مولانا حبیب الرحمٰن نے ہی جاری نہیں کیا بلکہ اس پر ان کے تین نائب مفتیوں کے دستخط بھی ہیں۔ چنانچہ یہ فتویٰ ایک فرد کی طرف سے نہیں بلکہ ایک مسلمہ دینی اور علمی ادارے کی طرف سے آیا ہے۔ ہمارے خیال میں پاکستان کے اندر اور خصوصیت کے ساتھ اس کے شمالی اور قبائلی علاقہ جات میں آج کل کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اس فتوے کی زیادہ سے زیادہ تشہیر کی بے حد ضرورت ہے۔ یہ کام پاکستان کی حکومت بھی کر سکتی ہے اور یہاں کے امن پسند علماء بھی! تاکہ اُن علاقوں میں انتہا پسندی اور خودکش حملوں کی جو وبا چل پڑی ہے اس کا سدِ باب کیا جاسکے۔

محمد کاظم

باب۔ ا

جنت کا راستہ

میں اندر داخل ہوا تو ایک تیز جانی پہچانی سی خوش بو نے میرا خیر مقدم کیا۔ آدھی رات گزر چکی تھی اور مسجد میں موجود اکثر لوگ سو چکے تھے۔ بریانی، قورمے اور کھیر کی مہک ہوا میں تیر رہی تھی۔ یہ وہ کھانا تھا جو ان لوگوں نے رات کو کھایا تھا۔ اس میں اس پرانی دھرانی، ٹوٹی پھوٹی اور فلاکت زدہ عمارت کی زہریلی بو بھی شامل تھی جسے کھینچ تان کے مسجد بنا لیا گیا تھا۔ چٹ پٹے کھانوں کی مہک میں بوسیدہ دیواروں کی سیلن، سوکھی ہوئی پھپھوندی اور اس قالین کی بساندھ بھی آرہی تھی جس پر ایک طویل عرصے تک نہ جانے کتنے بھیگے پاؤں پڑتے رہے ہوں گے۔ ایک خاص عمر کے آدمی کے لیے جو برطانیہ میں پلا بڑھا ہو یہ ماحول جانا پہچانا اور اپنے گھر کا سا تھا۔ پاکیزہ اور متبرک۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ آدمی مسلمان ہو اور مسجد اور اس کے ماحول سے واقف ہو۔ گلاسگو کی اس مسجد کی طرح برطانیہ کی تمام مسجدیں ابتدا میں ایسی ہی خستہ عمارتوں میں قائم کی گئی تھیں۔ جتنی رقم اکٹھی ہوتی تھی اسی کے حساب سے عمارت حاصل کرلی جاتی تھی۔ ایک ایسے انسان کو مسجد ہی سہارا دیتی تھی جو ایک نئی سرزمین کو اپنا گھر بنانے کے لیے تگ و دو کر رہا ہو۔ ایسے مقامات پر سارا ماحول ہی مایوس کن حالات میں انسانی جدو جہد اور بنتی بگڑتی آرزوؤں کی تاریخ معلوم ہوتا ہے۔ جہاں بھی مسجد ہوتی وہاں کوئی نہ کوئی ایک رات کے لیے ٹھہرا ہوا ضرور ملتا۔ یہ عام سی بات ہے کہ جب ہر جگہ سے مایوسی ہو جاتی ہے تو مسجد ہی پناہ

دیتی ہے۔ یہ پناہ مادّی بھی ہوتی ہے اور روحانی بھی۔ حقیقی بھی ہوتی ہے اور استعاراتی بھی۔ لیکن یہ منظر کہ کئی درجن آدمی آرام سے سو رہے ہیں، ایک ہی لے میں ان کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آوازیں آرہی ہیں اور ان کے سوٹ کیس ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں کچھ اور ہی ظاہر کرتا ہے۔

یہ مطمئن اور راضی برضا لوگ بے مقصد گھومنے پھرنے والے انسان نہیں ہیں اور نہ یہ مایوس اور بے گھر آوارہ گرد ہیں۔ یہ لوگ جب نیند سے بیدار ہوں گے تو وہ ایک خاص مقصد اور ایک خاص مشن کے لیے مستعد انسان نظر آئیں گے۔ مگر میں جو تنہا اور مضطرب تھا، میرے لیے دور دور نیند کا پتہ نہیں تھا۔ بیس سال کی پختہ عمر تک پہنچتے پہنچتے مجھے بہت سے ایسے مسلمان گروپوں کا کافی تجربہ ہو چکا تھا جو میری زندگی کو کوئی مقصد اور کوئی نصب العین دینا چاہتے تھے۔ لیکن میرے لیے ان میں سے کوئی اتنا خوف ناک اور اتنا پریشان کن نہیں تھا جیسا واقعات کا وہ سلسلہ ثابت ہوا جس نے مجھے یہاں پہنچا دیا تھا۔

یہ 1972ء کی گرمیاں تھیں اور میں چاہتا تھا کہ اس اتوار کی صبح آرام اور سکون کے ساتھ گھر میں ہی گزاروں۔ مگر صبح ہی صبح دروازے کی گھنٹی نے مجھے اٹھا دیا۔ کونسل فلیٹ کی ساتویں منزل پر کوئی عام آنے جانے والا اتفاق سے ہی آتا تھا۔ یہ ٹاور بلاک فن تعمیر کے ماہروں، شہری منصوبہ سازوں اور ان بلدیاتی افسروں کے غیر ارادی تصور کا نمونہ تھا جو ہیکنی کی خستہ حال گلی میں رہنے والوں کو اس گندگی سے نکال کر ایک نئی تعمیر کی ہوئی جنت میں بسانے کا تہیہ کر چکے تھے۔ سیٹن پوائنٹ جہاں ہم رہتے تھے، اس کے عقب میں کلیپ ٹن تالاب تھا اور وہ مشرقی لندن کا بہت ہی اہم مقام مانا جاتا تھا۔ اسے نئے دور کے لحاظ سے تعمیر کیا گیا تھا۔ لیکن وہاں رہنے والوں کا انحصار ایک ایسی لفٹ پر تھا جو اپنی مرضی سے چلتی تھی اور کبھی کبھی تو چلنے سے انکار ہی کر دیتی تھی۔ اس لیے بہت ہی بیوقوف، یا انتہائی محبت کرنے والے عزیزوں اور دوستوں، یا پھر نہایت ڈھیٹ لوگوں کے سوا اور کوئی بھی اتنی بہت سی سیڑھیاں چڑھ کر ہمارے دروازے تک آنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو ایک نہایت پر جوش السلام علیکم و رحمت اللہ نے میرا استقبال کیا۔ ڈھیلے ڈھالے کرتے شلوار میں ملبوس الجھی داڑھیوں والے دو آدمیوں نے ایک ساتھ اپنے ہاتھ میری طرف بڑھا دیئے۔ ''جی، فرمایئے؟'' میں نے ان کے پنجوں سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

''اللہ کے فضل و کرم سے ہم یہاں آپ کو جنت کا راستہ دکھانے آئے ہیں۔'' لمبے قد

کے گورے آدمی نے کہا۔

ڈاکٹر احمد زمان خاں کا چہرہ کچھ جانا پہچانا سا تھا۔ اصل میں وہ ''ڈاکٹر'' تو نہیں تھے ڈینٹسٹ تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ پاکستان کے شمالی علاقوں کے رہنے والے ہیں۔ ان کا چہرہ عام انگریزوں کے مقابلے میں کاکیشیا کا زیادہ نظر آتا تھا۔ وہ بولے تو اندازہ ہوا کہ انہوں نے انگلستان کے مغربی علاقوں کا لہجہ خوب اپنا لیا ہے۔ میں نے انہیں مسلمانوں کے اجتماع میں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ بڑے جوش وخروش کے ساتھ کسی کے ساتھ گفتگو میں الجھے ہوتے تھے۔ میں جب بھی ان کے پاس گیا تو مجھے گفتگو سے زیادہ بسم اللہ، الحمدللہ، انشاء اللہ اور استغفراللہ کا ورد ہی سنائی دیا۔ کبھی کبھی ان کے سے نعوذباللہ اور لاحول ولاقوۃ الا باللہ کے الفاظ بھی سنائی دے جاتے۔ ان کی جو باتیں کان میں پڑتیں ان سے معلوم ہوتا کہ خان صاحب اس پرانے قول کا چلتا پھرتا نمونہ ہیں کہ مسلمان کی روح اس موزیک کی طرح ہے جو قرآن کے اصولوں پر بنائی گئی ہے۔ وہ اسی میں سانس لیتا ہے اور اسی میں زندگی گزارتا ہے۔ مجھے کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا کہ جب سے میں ان اجتماعات میں جا رہا ہوں خان صاحب میری حرکات وسکنات پر خاص نظر رکھ رہے ہیں اور انہوں نے تاڑ لیا ہے کہ میری ظاہری شکل وصورت متقی مسلمانوں والی نہیں ہے۔

میں نے مہمانوں کو اندر بلایا اور ناشتہ پیش کیا۔ ادب آداب کے معاملے میں میری اچھی تربیت ہوئی ہے اور مہمانوں کی خاطر تواضع میں بھی میں کبھی پیچھے نہیں رہتا۔ ڈاکٹر خان نے اپنے ساتھی کا تعارف کرایا۔ ''یہ مسعود صاحب ہیں۔ یہ کراچی سے اتنا لمبا سفر کر کے تبلیغ کی غرض سے یہاں آئے ہیں۔'' معلوم ہوا کہ مسعود صاحب اپنا مرچ مسالے کا کاروبار ہی نہیں اپنی بیوی اور آٹھ بچوں کو بھی پاکستان میں چھوڑ آئے ہیں تاکہ یورپ میں تبلیغ کا کام کر سکیں اور مسلمانوں کو مسجد میں بلا سکیں۔ تبلیغ کا یہ کام ان امریکی عیسائیوں کی طرح ہے جن کا کوئی نہ کوئی گروہ اس مقصد کے لیے اپنے سال دو سال وقف کر دیتا ہے۔ یہ لوگ مورمن کہلاتے ہیں اور شہر شہر گھوم کر اجنبی لوگوں کے دروازے کھٹ کھٹا کر اپنا رٹا رٹایا وعظ سناتے ہیں اور اپنے عقیدے کا قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے مہمانوں کی طرف سے اب میرے لیے کیا تحفہ آنے والا ہے اور میں نے اس کے لیے اپنے نیم خوابیدہ حواس کو تیار بھی کر لیا تھا۔

''پیارے بھائی'' انہوں نے کہنا شروع کیا۔ ''ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ نماز کی پابندی نہیں کرتے۔''

یہ جملہ میرے لیے بہت ہی خطرناک تھا۔ میں نے شرمندگی سے سر ہلایا۔

''آپ جانتے ہیں کہ نماز جنت کی کنجی ہے۔ آپ کو معلوم ہے صحیح طریقے سے نماز کیسے پڑھی جاتی ہے۔''

''جی میں جانتا ہوں نماز کیسے۔۔۔''

''صحیح اصول وضوابط کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔'' مسعود صاحب نے مجھے اپنا جملہ پورا نہیں کرنے دیا۔ ''برادر، آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ کتنے ہی مسلمان ایسے ہیں جو صحیح طریقے سے نماز ادا نہیں کرتے۔ ہمارے بہت سے بھائی اور بہنیں تو یہ بھی نہیں جانتیں کہ صحیح طریقے سے وضو کیسے کیا جاتا ہے۔''

''جی، مگر میں ان میں سے۔۔''

اب خان صاحب کی باری تھی، انہوں نے مجھے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔ میری پیٹھ پر پیار سے ہاتھ مارتے ہوئے بولے، ''برادر، برادر، ہاں ہاں۔ آپ تو سب کچھ جانتے ہیں۔ لیکن آپ کے لیے اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ آپ وقت پر اور صحیح طریقے سے نماز ادا کریں۔ اپنے دل و دماغ کو تمام دنیاوی آلودگیوں سے پاک صاف رکھنے اور اپنے خالق حقیقی کو یاد رکھنے کی عادت ڈالنے کے لیے ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اکثر و بیشتر ذکر بھی کرے۔''

بالکل درست فرمایا آپ نے۔'' مسعود صاحب نے ان کی تائید کی۔ ''لیکن اتنا بھی کافی نہیں ہے۔ ہمیں اس سے بھی آگے قدم بڑھانا اور اپنے دوسرے بھائی بہنوں کو بھی اس کی دعوت دینا چاہیے۔ اس کے لیے ان کی رہنمائی کرنا چاہیے کہ وہ نماز، ذکر اور مراقبے کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیں۔''

''چھوٹے بھائی، کیا آپ جانتے ہیں۔'' مسعود صاحب برابر خان صاحب کی بات کو آگے بڑھا رہے تھے۔ ''دعوت ہر مسلمان پر فرض ہے۔ قادر مطلق نے۔۔۔''

قادر مطلق کا لفظ بول کر مسعود صاحب نے ورد شروع کر دیا ''اللہ اللہ۔۔''

ڈاکٹر خان سر جھکائے یہ ورد سنتے رہے۔ پھر بولے۔ ''خداوند قدوس نے ہر مسلمان پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ دنیاوی ذمہ داریوں سے اپنا کچھ وقت نکالے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے سفر کرے۔ گھر گھر جائے، شہر شہر گھومے اور مسلمانوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرے۔ آپ سمجھتے ہوں گے کہ دعوت اور تبلیغ صرف پیشہ ور علما کا ہی کام ہے۔ جی نہیں، یہ

ہر مسلمان پر فرض ہے۔ ہمیں اور آپ کو مل کر دعوت پر نکلنا چاہیے۔ یہی جنت کا راستہ ہے۔''

جی، مگر۔۔۔''

''آپ جنت میں نہیں جانا چاہتے؟''مسعود صاحب نے میری ہچکچاہٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''جی، کون نہیں چاہتا جنت میں جانا۔ لیکن چند ہفتے بعد میرے امتحان ہونے والے ہیں۔'' میں نے اس امید پر یہ عذر پیش کیا کہ اس سے میرے اوپر ان کے حملے بند ہو جائیں گے اور سچی بات بھی یہی تھی کہ میں سٹی یونیورسٹی میں فزکس پڑھ رہا تھا اور یہ میرا آخری سال تھا۔ میرے امتحان واقعی دو تین ہفتے میں ہونے والے تھے۔ لیکن مسعود صاحب پر میرے اس عذر کا کوئی اثر نہیں ہوا۔'' آپ محض ایک دنیاوی امتحان کے لیے بے چین ہیں، مگر اپنے آخری امتحان کی کوئی فکر نہیں ہے؟ کیا آپ اس امتحان کے لیے تیار ہیں؟''

''آپ دعوت میں شریک ہوکر''ڈاکٹر خان نے اضافہ کیا۔'' ان شاء اللہ، قیامت کے دن اپنے خالق حقیقی کے سامنے پیش ہونے اور اپنا آخری امتحان دینے کی تیاری پوری تن دہی سے شروع کریں گے۔''

میری ساری ترکیبیں ناکام ہوتی نظر آرہی تھیں۔ ادھر مجھے یہ بھی احساس تھا کہ میرے پیچھے ایک اور محاذ بھی کھلنے والا ہے۔ میرے ابو اور امی دروازے کے پیچھے کھڑے ساری باتیں سن رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ میری امی اپنے عقیدے اور رسم ورواج کے مطابق کٹر مذہبی خاتون ہیں۔ وہ تو ان لوگوں سے یہ کہہ کر میرا بھانڈا پھوڑ دیں گی کہ آپ نماز کی بات کر رہے ہیں، یہ تو رمضان کے روزے بھی نہیں رکھتا اور جہاں تک میرے والد کا تعلق ہے وہ تبلیغی ٹائپ لوگوں سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ تبلیغی جماعت جیسے اور بھی کئی گروہ ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد نظریات رکھتے ہیں۔ اس دنیا اور آخرت میں جنت حاصل کرنے کے ان کے اپنے اپنے فارمولے ہیں۔ ہر گروپ اور ہر جماعت الگ الگ نظریات اور عقائد کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس لیے وہ ایک دوسرے کے لیے چیلنج بھی بن جاتی ہیں۔ ہر گروپ لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتا ہے اور چونکہ یہاں میں ہی ایسا نوجوان تھا جسے ہدایت کی ضرورت تھی اس لیے میرے اوپر ہر گروپ کی نظر تھی۔ مجھے خوشی بھی ہوتی تھی میرے اوپر اتنی توجہ دی جارہی ہے۔ مگر میں نے یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ میں بلا سوچے سمجھے کسی کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ میں

چاہتا تھا کہ میرے سامنے اسلام کی جو مختلف تعبیریں پیش کی جا رہی ہیں میں خود ان کا تجربہ کروں، ان کا تجزیہ کروں اور دیکھوں کہ مجھے کس قسم کی جنت کی راہ دکھائی جا رہی ہے۔ چنانچہ یہ بن بلائے مہمان مجھے یہ موقع فراہم کر رہے تھے اور پھر ایک اور بات بھی تھی کہ میرے والد عمر کے آخری حصے میں ایک اور مذہبی جماعت کے سرگرم حامی بن گئے تھے۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ اگر اس وقت وہ یہاں آ گئے تو گھمسان کا رن پڑ جائے گا۔ اس کے بعد ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہنے اور ایک دوسری کی غلطیاں نکالنے کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ میں اسلام کے متعلق مختلف رویوں کی اس جنگ میں کسی کا بھی ہدف نہیں بننا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے اس جنگ و جدال میں جنت کا کوئی کیسے سوچ سکتا تھا۔ میرے لیے ایک ہی راستہ تھا کہ میں جلدی سے اس قضیہ کو نبٹا دوں۔ ''ٹھیک ہے'' میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ ''میں آپ کے ساتھ تبلیغ کے لیے چلوں گا۔''

''الحمد للہ'' مسعود صاحب اور ڈاکٹر خان نے ایک ساتھ نعرہ بلند کیا۔ ''آپ تین دن کے لیے اپنی خدمات پیش کر کے یہ متبرک کام کر سکتے ہیں۔'' مسعود صاحب نے کہا۔ ''اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ کل شیفیلڈ میں ایک بہت بڑی تبلیغی کانفرنس شروع ہو رہی ہے۔ آپ اس میں پورا ''چلّہ'' بھی گزار سکتے ہیں۔''

''چلّہ؟

''مسعود صاحب نے دیکھا کہ میری سمجھ میں بات نہیں آئی تو انہوں نے وضاحت کی ''چالیس دن کی دعوت۔''

''چالیس دن؟'' اب میں اپنے اوپر قابو نہیں رکھ سکا۔ میں اندر ہی اندر ڈر رہا تھا کہ اب میرے والد کی آنکھوں سے آگ برسنے لگی ہوگی اور وہ کسی وقت بھی یہاں آ سکتے ہیں۔ ''چالیس دن؟'' میں نے ان مہمانوں کو دروازے کی طرف لے جاتے ہوئے سرگوشی کی۔

''مگر آپ ہمیں باہر کیوں نکال رہے ہیں'' ڈاکٹر خان نے احتجاج کیا۔ ''آپ بھی تو ہمارے ساتھ چل رہے ہیں۔''

آپ کا مطلب ہے ابھی اسی وقت؟''

''جی برادر۔ ابھی، اسی وقت، شیفیلڈ میں کل کانفرنس شروع ہو رہی ہے۔ ہمارے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔''

''ٹرین اور بس کی طرح جنت بھی کسی کا انتظار نہیں کرتی'' مسعود صاحب نے اپنی طرف

سے مذاق کیا۔

اب منظر بدلتا ہے۔ میں پرانی ٹرائمف کار کی پچھلی نشست پر بیٹھا ہوں اور ڈاکٹر خان شیفیلڈ کی طرف گاڑی دوڑائے چلے جا رہے ہیں۔ کم سے کم لندن سے نکلتے وقت مجھے یہی بتایا گیا تھا۔ لیکن اب میرا جغرافیے کا چھوٹا موٹا علم مجھے بتاتا ہے کہ ڈاکٹر خان تو غلط سمت میں جا رہے ہیں۔

''ڈاکٹر خان،'' میں کہتا ہوں ''شیفیلڈ تو شمال میں ہے۔''

''درست فرمایا آپ نے'' وہ سڑک پر نظریں جمائے ہوئے ہیں۔

''تو پھر ہم جنوب کی سمت کیوں جا رہے ہیں؟''

''اس لیے میرے پیارے بھائی کہ ہم پلائی متھ جا رہے ہیں۔ وہاں ہمیں کچھ اور بھائیوں سے ملنا ہے۔ انشاء اللہ وہ بھی ہمارے ساتھ شیفیلڈ جائیں گے۔''

انہوں نے جس انداز میں انشاء اللہ کہا تھا اس میں اور بھی بہت کچھ پوشیدہ تھا۔ انشاء اللہ کا لفظ اپنے اندر انسانی عقل وشعور سے باہر کئی امکانات رکھتا ہے۔ اس کا مطلب ہے اگر اللہ نے چاہا۔ اب مجھے بتایا گیا کہ جن بھائیوں کے پاس ہم جا رہے ہیں انہیں ہمارے آنے کی بالکل خبر نہیں ہے۔ ان کے فرشتوں کو بھی نہیں پتہ کہ وہ ہمارے ساتھ تبلیغی کانفرنس میں شیفیلڈ جا رہے ہیں۔

اب میرا ''دعوت'' کا کورس شروع ہوا۔

''آپ تبلیغی جماعت کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟'' مسعود صاحب نے پوچھا۔

باہر بارش شروع ہو گئی تھی۔ میں نے بلا سوچے سمجھے اور ان کی طرف دیکھے بغیر کہا ''نہیں۔''

مسعود صاحب اپنے اردگرد سے بالکل بے نیاز تھے۔ انہوں نے سفر کی خاموشی کو اپنی جماعت کی تاریخ سے پر کرنا شروع کر دیا۔ ''اس کا آغاز ۱۹۲۶ء میں دہلی کے نزدیک ایک قصبے میوات سے ہوا۔ اس زمانے میں ہندوستان کے مسلمان بہت بری حالت میں تھے۔''

مسلمان کب بری حالت میں نہیں تھے؟ میں نے اپنے دل میں کہا۔ مجھ جیسا انسان مسلمانوں کے زوال، ان کے باہمی جھگڑوں سے کیسے غافل رہ سکتا ہے۔ اسی وجہ سے تو نسل ہا نسل سے غربت، افلاس، بے توجہی اور قوت ارادی کا فقدان مسلمانوں کی قسمت بن چکا ہے۔

اربوں مسلمانوں کو یہ پڑھایا جاتا ہے کہ اسلام ہی نجات کا واحد راستہ ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اسلام کے پاس ہی ہر سوال کا جواب ہے۔ لیکن آپس میں کسی ایک بات پر بھی اتفاق نہیں ہے۔ یعنی کس راستے پر چلا جائے؟ اس دن میرے ساتھ جو واقعات پیش آئے وہ اس کی ایک روشن مثال تھے۔ غلط وجوہ کی بنا پر اور غلط موڈ کے ساتھ ہم ان معصوم لوگوں کی طرف چل کھڑے ہوئے تھے جنہیں میری طرح کسی بھی پروگرام کا علم نہیں تھا۔

''برادر برادر،'' مسعود صاحب نے میری طرف دیکھا اور نہایت میٹھی آواز میں بولے ''آپ کو دوسروں کی بات سننے کی عادت ڈالنا چاہیے۔ ایک طالب علم اور مستقبل میں بننے والے ایک داعی کی حیثیت سے دوسرے لوگوں کو سچائی کے راستے پر بلانے سے پہلے آپ کو خود اپنا ذہن شک وشبہ کی آلودگی سے پاک کرنا ہوگا۔ جس طرح جب تک آپ کا جسم گندگی سے صاف نہیں ہوتا اس وقت آپ کی عبادت پوری نہیں ہوتی اسی طرح جب تک آپ کا دماغ شکوک وشبہات اور غلط فکر سے پاک نہیں ہوگا اس وقت تک آپ علم بھی حاصل نہیں کرسکیں گے۔'' وہ خاموش ہوئے۔ باہر بارش تیز ہوگئی تھی۔ ہلکی ہلکی بوندیں اب موسلا دھار بارش میں بدل چکی تھیں۔

باہر بارش ہو رہی تھی اور اندر میں تبلیغی جماعت کی تاریخ سے شرابور ہو رہا تھا۔ اس تحریک کی بنیاد مولانا محمد الیاس نے شمالی ہندوستان کے اس علاقے میں رکھی تھی جہاں راجپوت مسلمان رہتے تھے۔ یہ لوگ میو کہلاتے ہیں۔ کئی صدی پہلے یہ مسلمان ہوئے تھے لیکن یہ نام کے ہی مسلمان تھے۔ مولانا نے دیکھا کہ ان کے سارے رسم ورواج ہندوانہ ہیں۔ ان کی پیدائش، شادی بیاہ اور موت کی رسمیں ہندوؤں والی ہیں۔ وہ ہندو تیوہار مناتے ہیں حتیٰ کہ وہ ہندو دیوی دیوتاؤں کو پوجتے بھی ہیں۔ اس سے بھی زیادہ افسوس کی بات یہ تھی کہ وہ آسانی سے ہندوؤں کا نشانہ بن جاتے تھے اور دوبارہ ہندو بن رہے تھے۔ اس زمانے میں انگریزوں کی حکومت تھی اور وہ اس معاملے میں دخل نہیں دیتی تھی۔ ہندو بنانے کی تحریک جسے اس وقت شدھی کرن کہا جاتا تھا ایک سیاسی تحریک بن چکی تھی اور مسلمانوں کے ساتھ اس کا مقابلہ ہو رہا تھا۔

''ہندو مبلغوں کا مقابلہ کرنے کے لیے نچلی سطح تک تحریک چلانے کی ضرورت تھی۔ اس کے ساتھ ہی میو قوم کو اسلام کی بنیادی تعلیم سے آگاہ کرنا بھی ضروری تھا۔'' مسعود صاحب نے کہا اور مزید تفصیل بتانے کے لیے اپنے آپ کو تیار کیا۔

لیکن اسی وقت ڈاکٹر خان نے لقمہ دیا۔ ''ظہر کی نماز کا وقت ہوگیا ہے۔'' یہ کہتے ہی

انہوں سڑک کے ایک طرف گاڑی کھڑی کرلی۔ وہ جلدی سے نیچے اترے۔ ان کے ہاتھ میں جائے نماز تھی۔ مسعود صاحب بھی اسی تیزی سے اتر آئے۔

''آپ ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھیں گے؟''ان دونوں نے بیک وقت سوال کیا۔

''مگر یہاں تو بہت تیز بارش ہو رہی ہے۔'' میں نے کہا۔''اس کے علاوہ ہم سفر میں ہیں۔ ہم اپنی نماز بعد میں بھی ادا کرسکتے ہیں۔''

''آسان راستے تلاش نہ کرو۔'' مسعود صاحب نے جواب دیا اور ڈاکٹر خان نے مفکرانہ انداز میں اضافہ کیا۔''آسان راستے تلاش کرنے والوں نے ہی ہمارے مذہب کو خراب کیا ہے۔''

مجبوراً میں بھی کار سے اتر آیا۔ مسعود صاحب جائے نماز بچھانے کے لیے مناسب جگہ دیکھنے لگے تو خان صاحب نے اذان دینا شروع کردی۔

اذان ختم ہوئی تو مسعود صاحب نے پوچھا قبلہ کس طرف ہے؟ ظاہر ہے قبلہ معلوم کیے بغیر تو نماز ہی نہیں ہوسکتی۔ ڈاکٹر خان نے بتایا کہ کسی بھی شک وشبہ سے بچنے کے لیے ہم نے جائے نماز میں ہی کمپاس لگا لیا ہے۔ لیکن اس وقت تو کمپاس کی سوئی بھی نظر نہیں آرہی تھی۔

گرم گرم کار سے ٹھنڈی بارش میں نکلنے سے چاروں طرف بھاپ پھیل گئی تھی۔ جائے نماز کے کمپاس پر بھی بھاپ چھائی ہوئی تھی۔ ہم بھی بھیگ رہے تھے۔ اب ڈاکٹر خان جائے نماز پر اس طرح جھکے کہ جائے نماز پر بارش پڑنا بند ہوگئی۔ انہوں اپنے جسم کو مختلف انداز میں ادھر ادھر کیا اور کمپاس کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ آخر وہ کھڑے ہوئے اور اعلان کیا کہ قبلہ کی سمت معلوم ہوگئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے جنوب مشرق کی سمت جائے نماز کا رخ کردیا۔ پھر ہم تینوں نے باجماعت نماز ادا کی۔ ہم نماز پڑھ رہے تھے اور ہمارے اوپر باران رحمت کا نزول ہو رہا تھا۔ جس وقت ہم بارش میں شرابور اپنا دینی فریضہ ادا کررہے تھے اور ادھر سے گزرنے والوں کو تفریحِ طبع کا سامان مہیا کررہے تھے اس وقت مجھے مشہور انگریز ڈرامہ نگار اور ایکٹر نوئیل کاورڈ یاد آگیا۔ اس نے گرم ملکوں میں انگریزوں کی ایسی ہی مضحکہ خیز حرکتوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔

اب ہم پھر روانہ ہوئے تو مسعود صاحب کا بیان پھر شروع ہوگیا۔ یہ تبلیغی جماعت کی تاریخ کا سبق تھا۔ انہوں نے کچھ زیادہ ہی تفصیل کے ساتھ مجھے بتایا کہ احیائے اسلام کی تحریکوں میں ان کی جماعت کا کیا مقام ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس جماعت کے ہر کارکن نے

اصل اور صحیح اسلام کے احیا اور اس کی تقویت کے لیے کیسے اپنی زندگی وقف کیے رکھی ہے۔ ویسے یہ بھی درست ہے کہ تبلیغی جماعت نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ کوئی فکری یا دانشورانہ جماعت ہے۔ ہاں، وہ یہ کہتے ہیں کہ دینی تعلیم کے روایتی نظام میں یہ کمی ہے کہ وہ ایسے عالم پیدا کرتا ہے جو عام کسانوں اور مزدوروں کی ضرورتوں اور ان کی تشنگی کو نہیں سمجھتے۔ چنانچہ اس جماعت نے اسلام کے چھ بنیادی اصولوں کو اپنی تبلیغ کا مرکز و محور بنایا اور گھر گھر جا کر ان اصولوں کی تبلیغ کرنے لگے۔

''اس مشن میں انہیں بہت ہی کامیابی نصیب ہوئی۔ اس کے بعد مولانا الیاس نے سوچا کہ اس کا دائرہ دنیا کے دوسرے ملکوں تک بھی بڑھایا جائے۔ چنانچہ تبلیغی کارکن یورپ بھی پہنچ گئے۔ اب دنیا بھر میں ان کے بے شمار پیروکار موجود ہیں۔ گزشتہ سال رائے ونڈ کے اجتماع میں دس لاکھ سے زیادہ لوگوں نے شرکت کی۔'' مسعود صاحب نے میرا ردِ عمل جاننے کے لیے یہ بات کچھ زیادہ ہی زور دے کر کہی۔ ''ہم پوری دیانت داری کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ حج کے بعد دنیا بھر کے مسلمانوں کا یہ سب سے بڑا اجتماع ہوتا ہے۔''

''الحمدللہ،'' ڈاکٹر خان بھی خاموش نہ رہ سکے۔ ''الحمدللہ۔ ہم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلائیں گے۔''

اس وقت مجھے بھی چند نعمتیں یاد آئیں۔

جلد ہی عصر کا وقت بھی ہو گیا اور بارانِ رحمت میں ہی ہم نے یہ فریضہ بھی ادا کیا۔ اب مجھے مغرب کی نماز کی فکر ہوئی۔ حیرت کی بات تھی کہ کتنی جلدی دینی فرائض کی ادائیگی کا یہ سلسلہ میری خاص توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ شکر ہے کہ ہم مغرب سے پہلے ہی پلائی متھ پہنچ گئے۔ یہاں ڈاکٹر خان ہمیں ایک گھر کی طرف لے گئے جو پلائی متھ پولی کلینک کے قریب تھا۔ یہ مکان مسجد اور طلبہ کے ہوسٹل دونوں کے کام آتا تھا۔ اس کا انتظام ملائیشیا کے ایک شخص کے ہاتھ میں تھا۔ اور جلد ہی ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ڈاکٹر خان کو اس علاقے کی طرف راغب کرنے کا مجرم بھی وہی شخص ہے۔ اسی شخص نے ڈاکٹر خان کو یہ اطلاع پہنچائی تھی کہ کچھ طلبہ اپنے دینی فرائض پوری طرح ادا نہیں کر رہے ہیں۔ انہیں ڈاکٹر صاحب کی مربیانہ توجہ کی اشد ضرورت ہے۔ یہ تمام باتیں اسی وقت ہمارے علم میں آ گئی تھیں جب ہم جلدی جلدی نماز پڑھنے اندر جا رہے تھے۔ نماز ختم ہوتے ہی امام صاحب نے اعلان کیا کہ پاکستان سے ایک محترم مہمان تشریف لائے

ہیں۔ اب وہ خطاب فرمائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مسعود صاحب کو خطاب کی دعوت دی۔

''میرے عزیز بھائیو،'' مسعود صاحب نے اپنا خطاب شروع کیا۔ ''میرے علم میں آیا ہے کہ آپ میں سے بہت سے بھائی صحیح طور سے نماز ادا نہیں کرتے۔'' حاضرین میں زیادہ تر ملائیشیا کے طلبہ تھے۔ وہ پوری توجہ سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''لیکن صرف نماز پڑھنا ہی کافی نہیں ہے۔ نماز کے ساتھ اپنے خالق حقیقی کو بھی ایسے یاد کرنا ضروری ہے جیسے ہمارے پیارے نبیؐ یاد فرمایا کرتے تھے۔'' اپنے خطاب کے آخر میں انہوں نے دعوت کی اہمیت اور اس کی افادیت پر بھی روشنی ڈالی۔ اب یہ باتیں مجھے سنی سنائی معلوم ہونے لگی تھیں۔ اب آخری بات یہی رہ گئی تھی کہ وہ تمام حاضرین کو شیفیلڈ کے اجتماع میں شرکت کی دعوت دیں۔ ''شیفیلڈ میں برطانیہ کی تاریخ کا سب سے بڑا تبلیغی اجتماع ہو رہا ہے۔''

اب میں نے ایک عجیب وغریب منظر دیکھا۔ وہ طلبہ انتہائی توجہ اور عقیدت کے ساتھ مسعود صاحب کا خطاب سن رہے تھے لیکن جیسے ہی خطاب ختم ہوا ایک دم وہ وہاں سے ایسے غائب ہوئے جیسے وہ کبھی وہاں تھے ہی نہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنی تیزی سے لوگوں کو غائب ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ لگتا تھا کہ اس وقت کوئی بھی جنت میں جانے پر آمادہ نہیں تھا۔ تاہم ایک ذات ایسی تھی جو واقعی جنت میں جانے کے لیے بے چین نظر آتی تھی۔

ہم نے اس کی طرف توجہ ہی نہیں دی تھی۔ وہ عورتوں کے لیے مخصوص جگہ پر پردے کے پیچھے بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے جسم پر جو کپڑے لاد رکھے تھے اور جس طرح اس نے اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا اس میں وہ کپڑوں کی گٹھڑی نظر آتی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ کپڑوں کے اس ڈھیر میں کوئی انسان بھی ہو سکتا ہے۔ یہ ڈاکٹر خان ہی تھے جنہوں نے اسے پہچانا اور یہ جانا کہ اس گٹھڑی میں کوئی عورت بھی چھپی ہوئی ہے۔ انہوں نے پردے کی طرف مُنہ کیا اور آواز لگائی۔ ''بہن، آپ کا کیا ارادہ ہے؟ آپ اس دعوت پر لبیک کہیں گی؟''

''میں؟'' اندر سے گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

''جی، بہن آپ؟'' ڈاکٹر خان گرجے۔ ''آپ ہمارے ساتھ تبلیغ پر چلیں گی؟''

کپڑوں میں لپٹی صوفیہ بہن لنکا شائر کی رہنے والی تھیں۔ انہیں ملائیشیا کے ایک طالب علم سے محبت ہو گئی تھی اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ شادی کے بعد وہ دونوں بلائی متھ آ گئے

تھے۔ لیکن یہ شادی زیادہ دیر نہیں چل سکی۔ البتہ صوفیہ بہن کی اسلام سے وابستگی اسی طرح برقرار رہی۔ مجھے وہ ایک پاکیزہ مسلمان عورت کا مثالی نمونہ نظر آئیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو سر سے پاؤں تک ڈھانپ رکھا تھا، وہ جب بھی بولتیں تو ان کے ہر جملے میں بسم اللہ، الحمد للہ اور اللہ اکبر کی فراوانی ہوتی۔

آخر دوسرے دن پو پھٹنے سے پہلے ہی ہم شیفیلڈ روانہ ہوگئے۔ صوفیہ اپنے عورت ہونے کے استحقاق کی وجہ سے ڈاکٹر خان کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھیں۔ مسعود صاحب میرے ساتھ پیچھے بیٹھے تھے اور چونکہ کار کی ڈکی میں زیادہ جگہ نہیں تھی اس لیے صوفیہ بہن کا سوٹ کیس بھی ہمارے ساتھ ہی رکھا تھا۔ ابھی اندھیرا ہی تھا اور آسمان میں اِکا دُکا ستارے دکھائی دے رہے تھے۔ مگر جیسے ہی ہم موٹر وے پر پہنچے بارش پھر شروع ہوگئی۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ کتنا اچھا ہوتا اگر اللہ میاں مجھے لولا لنگڑا بونا بنا دیتے۔ کم سے کم اس کار میں آرام سے تو بیٹھ جاتا۔

ہم راستے میں جگہ جگہ رکتے، لوگوں کو اجتماع میں شرکت کی دعوت دیتے (جو کبھی کامیاب ہوتی تھی اور اکثر ناکام) آخر کار شیفیلڈ پہنچ گئے۔ ڈاکٹر خان کو پلائی متھ میں خاصی مایوسی ہوئی تھی کہ وہاں اجتماع میں شرکت کرنے والی ایک ہی ذات ملی تھی۔ راستے میں بار بار رکنے کی وجہ سے ہم شیفیلڈ اس وقت پہنچے جب تقریب ختم ہونے والی تھی۔ صرف تبلیغی جماعت کے روحانی پیشوا مولانا انعام حسن کا خطاب باقی تھا۔ مولانا کو سب حضرت جی کہتے تھے۔ انہوں نے نہایت فصیح و بلیغ اردو میں خطاب کیا اور کلمہ طیبہ کی اہمیت وافادیت پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی۔ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں۔ اسلام کے چار ارکان نماز، روزہ، زکوۃ اور حج کے بارے میں بھی انہوں نے بہت سی باتیں کیں اور کہا کہ ''ہمیں پابندی کے ساتھ پانچوں وقت کی نماز پڑھنا چاہیے، رمضان میں پورے روزے رکھنا چاہئیں، ہر سال زکوٰۃ دینا چاہیے اور زندگی میں کم سے کم ایک بار ضرور حج کی سعادت حاصل کرنا چاہیے۔ یہ وہ بنیادی فرائض ہیں جن پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔'' حضرت جی نے پُرزور انداز میں کہا۔ ''اس کی جزا ہمیں آخرت میں ملے گی۔ خداوند قدوس کی بے پایاں رحمت آپ کو جنت میں لے جائے گی۔''

یہ نچوڑ تھا تبلیغی جماعت کی تعلیم کا۔ اپنے دینی فرائض ادا کرو گے تو اللہ کی طرف سے آپ

کو ضرور جنت ملے گی۔'' اس کا مطلب تھا کہ آپ بنے بنائے فارمولے پر عمل کرتے رہیں اور پھر اس یقین کے ساتھ آرام سے بیٹھ جائیں کہ اب آپ کو جنت تو مل ہی جائے گی۔ گویا اس طرح آپ نے اپنی زندگی بھر کا کام مکمل کر لیا۔ ایسا لگتا ہے کہ تبلیغی جماعت کے پاس ایسا کوئی پیغام نہیں ہے اور نہ کبھی اس نے اس بارے میں سوچنے کی زحمت گوارا کی ہے کہ دنیا بھر میں اور خاص طور سے مسلم ملکوں میں ناانصافی اور ظلم وستم کا جو دور دورہ ہے اور جس نے کروڑوں اور اربوں لوگوں کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے، اس کے متعلق کیا کیا جائے۔ وہ اس دنیا کے مصائب و آلام کو نہایت سہل پسندی کے ساتھ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ میں نے سوچا۔ کیا ہمیں اپنی موجودہ زندگی کو سب کے لیے جنت بنانے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے۔ ہم اپنے اور دوسروں کے لیے اس دنیا کو جتنا آسان اور آرام دہ بنائیں گے اتنا ہی دوسری دنیا کی جنت کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔

کانفرنس بذات خود کوئی مقصد نہیں تھی۔ ہم سب جو وہاں جمع ہوئے تھے ان کے لیے ایک پروگرام اور ایک لائحہ عمل تیار کیا گیا تھا۔ ہمیں چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا تاکہ ہم برطانیہ کے مختلف علاقوں میں پھیل جائیں۔ ہر گروہ کو مختلف مسجدوں میں جانا تھا۔ میرے گروپ کا مشن تھا گلاسگو جانا۔ اگر آپ کے دل میں کوئی سوال ہے اور آپ اس کا جواب بھی چاہتے ہیں تو آپ کو اس کے شواہد اکٹھے کرنا چاہئیں اور انہیں پرکھنا چاہیے اور پھر اس کی صداقت پر غور کرنا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ میں تبلیغی جماعت کو خیر باد کہوں میرے لیے ضروری تھا کہ میں اپنے آپ کو اس پروگرام کے لیے پیش کر دوں۔ چنانچہ گلاسگو میری منزل ٹھہری۔

کار کا ایک اور سفر شروع ہوا۔ بارش رک رک کر پڑ رہی تھی۔ بھلا ہو برطانیہ کے موسمِ گرما کا کہ نماز کے وقت بارش تھم جاتی تھی۔ گلاسگو میں خالد صاحب نے ہمارا استقبال کیا۔ وہاں وہ ہمارے گروپ کے لیڈر تھے اور ہم سے پہلے وہاں پہنچ چکے تھے۔ وہ پینتالیس سال کے قریب نظر آتے تھے۔ دبلے پتلے، چھدری داڑھی اور کالی شیروانی اور کالی ٹوپی میں ملبوس۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں شماریات کے لیکچرر تھے۔ اس وقت گھسے ہوئے پرانے اور ٹھنڈے قالین پر ننگے پاؤں کھڑے وہ ہر آنے والے کا پُرجوش خیر مقدم کر رہے تھے۔ صوفیہ بہن نہایت فرماں برداری کے ساتھ ہم سے الگ ہو چکی تھیں۔ خالد صاحب نے ہمیں خوش خبری سنائی کہ پہلے کچھ کھا پی لیں پھر آرام کریں۔

میرے ارد گرد خرّاٹوں کی آوازیں آرہی تھیں مگر میری آنکھوں میں نیند کا نام ونشان تک نہ تھا۔ میں حضرت جی کے خطاب کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ان کے خطاب کا ایک حصہ میرے دماغ میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ تھا علم کے بنیادی وصف کے بارے میں۔ جاننے اور سمجھنے پر اصرار اور غور وفکر کرنے کی اہمیت ایسے موضوع ہیں جن کا ذکر قرآن میں بار بار آتا ہے۔ سوال کرنے اور جواب حاصل کرنے کی خواہش کو میں نے پہلے ہی اپنی زندگی کا مطمح نظر بنا رکھا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اس دنیا اور غالباً دوسری دنیا میں بھی نجات پانے کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ علم مسلمانوں کی میراث ہے جو مجھے اگر اپنی ماں کے دودھ کے ساتھ نہیں ملی تو ان کی نصیحت سے ضرور ملی کہ اسلام صرف روزہ نماز کا نام ہی نہیں ہے۔ اسے علم سے ہی تحریک ملتی ہے۔ میرے دماغ میں حضرت جی کے الفاظ گونج رہے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہمارے علما کو علم کا صحیح وصف پہچاننا چاہیے اور ان کے اندر اصلی اور نقلی علم میں امتیاز کرنے کی اہلیت ہونا چاہیے۔ اصلی علم کی پہچان یہ ہے کہ اسے روبہ عمل لایا جاسکے۔ مساجد کے اماموں اور علما کا صرف یہ کام نہیں ہے کہ وہ نماز کی امامت کرادیں بلکہ ان کے اندر یہ صلاحیت بھی ہونا چاہیے کہ وہ عام مسلمانوں کو مسجد میں بلا بھی سکیں۔ وہ لوگوں کو دین کی طرف بلائیں۔'' میرے لیے سونا مشکل ہو رہا تھا۔ اس بیان میں ایک محدود دائرے کا حوالہ تھا جس میں بند ہو کر آپ اپنے دینی فرائض ادا کرتے رہیں۔ اس فکر نے مذہب کو بلا سوچے سمجھے مذہبی رسوم کی ادائیگی تک محدود کر دیا ہے اور دنیا اور اس کے مسائل کو اس دائرے سے خارج کر دیا ہے۔ میں تبلیغی جماعت کے تصور زہد وتقویٰ اور جنت کے بارے میں اپنے تصور اور ان دونوں کے باہمی تعلق پر جتنا غور کرتا اتنا ہی مزید الجھتا چلا جاتا۔

صبح فجر کی اذان سے ہی میں جاگا۔ برطانیہ میں گرمیوں کے اوقات ایسے ہوتے ہیں کہ رات کو مشکل سے ہی سونے کا وقت ملتا ہے کیونکہ فجر صبح چار بجے سے بھی پہلے ہی ہو جاتی ہے۔ فجر کی نماز پر پچاس کے قریب نمازی تھے۔ امامت خالد صاحب نے کرائی۔ نماز کے بعد مسعود صاحب سے درس کی درخواست کی گئی۔ توقع کے مطابق انہوں نے تبلیغی جماعت کے چھ بنیادی اصولوں کو ہی اپنے درس کا موضوع بنایا۔

درس کے بعد ناشتہ لگایا گیا۔ ناشتے میں انڈے پراٹھے اور حلوہ تھا۔ سب نے خوب جی بھر کے کھایا اور ہضم کرنے کا کام اپنے معدے پر چھوڑ دیا۔ ناشتے کے بعد کچھ لوگ ڈیوز بری چلے گئے جہاں حضرت جی ایک اور اجتماع سے خطاب کرنے والے تھے۔ مجھے تو اس میں بھی

ڈاکٹر خان کا ہی ہاتھ نظر آیا۔ ان کی حکمت عملی یہ تھی کہ وہ شیفیلڈ سے گلاسگو ہوتے ہوئے ڈیوزبری پہنچ جائیں۔ شکر ہے میرے گروپ کو گلاسگو میں ہی رہنا تھا۔ اگر اس بھاگ دوڑ سے فرصت ملتی تو میں یہ معلوم کرسکتا کہ اس تکرار کے علاوہ بھی تبلیغی جماعت کے پاس کچھ اور ہے؟ اب ہم جو وہاں رہ گئے تھے ہمیں اس دن کا پروگرام بنانے کے لیے بلایا گیا۔ بظاہر تو ہمیں مشورے لیے بلایا گیا تھا مگر وہاں ہمارے لیڈر نے ہر کارکن کو ایک بنا بنایا پروگرام دے دیا۔ کچھ لوگوں کے ذمہ کھانا پکانا تھا، کچھ مسجد کی صفائی پر مامور کیے گئے اور کچھ ارکان کو عورتوں کا خیال رکھنے کے لیے کہا گیا۔ مجھے تعلیم کی کلاس میں بھیجا گیا۔ اپنی تمام تر سادہ لوحی کے باوجود تبلیغی حضرات کو تیکنیکی اصطلاحات استعمال کرنے کا بہت شوق ہے۔

میں نہایت فرماں برداری کے ساتھ ابتدائی تعلیم کی کلاس میں پہنچ گیا۔ وہاں ہم ایک دائرے میں بیٹھ گئے۔ ہمارے بیچ میں ایک صاحب بیٹھے تھے جنہیں سب حافظ صاحب کہہ رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ لکھنؤ کے مشہور قفل ساز ہیں۔ انہوں نے تبلیغی جماعت کی مطبوعات میں سے ایک کتاب اٹھائی اور پڑھنا شروع کیا۔ کتاب کا وہ باب نماز کے بارے میں تھا۔ بعد میں ہمیں چھوٹے چھوٹے گروپوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یہاں سب کو قرآن کا صحیح تلفظ سکھایا جاتا تھا۔ ہمارے اس گروپ کا جو لیڈر مقرر کیا گیا تھا اس کا کام یہ بتانا تھا کہ نماز میں کس طرح کھڑا ہونا چاہیے، کیسے رکوع کرنا چاہیے اور کیسے سجدے میں جانا چاہیے۔ اس بات پر خاص زور تھا کہ نماز میں ہر حرکت پوری جماعت کے ساتھ ہی ہونی چاہیے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ظہر کی نماز پڑھی گئی۔ کھانے پر گھی میں تر بتر بریانی اور قورمہ تھا۔ مجھے اپنے جسم کی شریانوں میں یہ گھی جمتا ہوا محسوس ہوا۔ مزید کلاسیں شروع ہونے سے پہلے ہمیں تھوڑا آرام کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس انتہائی مصروف دن کی سہ پہر کو جو ہمارا درس ہوا اس کا نام تھا ''بیان۔'' یہ ہماری ابتدائی تعلیم کا ایک اور نام تھا۔ اس مرتبہ ایک حاجی صاحب کی باری تھی۔ ''آپ جیب کترے کو ذہن میں لائیے۔'' انہوں نے بیان شروع کیا'' وہ اپنے پیشے کو ایک غیر معمولی پیشہ تصور کرتا ہے اور وہ پوری دیانت داری کے ساتھ اپنے آپ کو اس فن کے لیے وقف کردیتا ہے۔ وہ دن رات محنت کر کے اس فن میں مہارت حاصل کرتا ہے۔ حکومت اس کے خلاف ہے، عوام اس کے خلاف ہیں اور پولیس اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ لیکن وہ اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ جب پکڑا جاتا ہے تو جیل بھی کاٹتا ہے۔ وہ اپنے کام

کے لیے ہر مصیبت برداشت کرتا ہے۔ تو میرے عزیز بھائیو، تبلیغ بھی ایک ضروری کام ہے، اس کے لیے آپ اپنا وقت نکالیے اور اپنے آپ کو اس فریضے کے لیے وقف کر دیجے۔ آپ آخرت میں اسی طرح کامیاب ہوں گے جیسے جیب کترا اس دنیا میں کامیاب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے گا اور آپ کی زندگی میں ایک انقلاب آجائے گا۔ آپ دوسروں کو اسلام کی دعوت دیں گے تو خود بھی اچھے مسلمان بن جائیں گے۔ اس بیان کے بعد خالد صاحب نے اعلان کیا کہ اب ہم ''گشت'' پر جائیں گے۔ اب میں تبلیغی جماعت کی وسیع اصطلاحات سے مانوس ہوتا جا رہا تھا۔ ''ہمیں شہر بھر میں گھوم پھر کر لوگوں کو دعوت دینی چاہیے۔''

گشت پر جانے والے میرے گروپ میں خالد صاحب اور حاجی صاحب تھے۔ انہوں نے سمجھایا کہ ہم جن علاقوں میں جائیں گے وہاں ہم عام لوگوں سے ملیں گے، انہیں اسلام کے بنیادی اصولوں سے آگاہ کریں گے اور تبلیغی مشن پر چلنے کی دعوت دیں گے۔ گشت کے چھ بنیادی ضابطے ہیں۔ انہوں نے کہا۔ ''میں آپ سے اس سے زیادہ کی توقع نہیں کرتا۔ آپ جب کسی کے گھر جائیں تو بلند آواز میں السلام علیکم کہیں جب تک کوئی بلائے نہیں گھر کے اندر نہ جائیں، ہمیشہ نرمی اور خوش اخلاقی سے بات کریں، کسی سے بحث میں نہ الجھیں۔ بے کار اور فضول باتیں نہ کریں۔ سیاست پر کبھی بات نہ کریں۔ انہوں نے بتایا کہ آج ہم دو آدمیوں کے پاس جا رہے ہیں جو گلاسگو سے باہر رہتے ہیں۔

ہمارا پہلا نشانہ ایک میڈیکل ڈاکٹر تھے جو حیدرآباد دکن سے آئے تھے۔ انہوں نے نہایت گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں چائے پیش کی۔ خالد صاحب نے ان سے سوال شروع کر دیئے۔ ''آپ پابندی سے نماز پڑھتے ہیں؟'' ''کوشش کرتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''یہ تو اچھی بات ہے۔''

حاجی صاحب زیادہ ہی جوش میں نظر آرہے تھے۔ ''تو پھر آپ کو ہمارے ساتھ تبلیغ کے لیے چلنے پر تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟'' انہوں بے چینی کے ساتھ سوال کر ڈالا۔

''میں کرتا رہتا ہوں۔''

''کرتا رہتا ہوں؟'' خالد صاحب اور حاجی صاحب دونوں حیرت سے انہیں دیکھنے لگے۔

''آپ یقیناً یہ تو جانتے ہوں گے کہ تبلیغ ایسا کام ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان پر فرض کیا ہے۔''

''برصغیر پاک و ہند میں کتنے مسلمان بستے ہیں؟'' ڈاکٹر نے سوال کیا۔

خالد صاحب نے ایک منٹ سوچا پھر بولے ''ہندوستان اور پاکستان ملا کر آدھا ارب تو ہوں گے۔''

''اور ہر شخص کسی نہ کسی پریشانی میں گھرا ہوا ہے۔'' ڈاکٹر بولا۔'' بجائے اس کے کہ آپ انہیں ٹھیک کریں، انہیں صحیح راستہ دکھائیں اور ان کے مسائل حل کریں آپ ہزاروں میل دور یہاں آئے ہیں تبلیغ کرنے۔ ہمیں ہماری غلطیاں بتانے۔ پہلے تو آپ کو اپنا گھر ٹھیک کرنا چاہیے۔''

خالد صاحب نے میری طرف دیکھا۔ میں الماری میں رکھی ڈاکٹر کی کتابیں دیکھ رہا تھا۔

''خیرات گھر سے شروع ہوتی ہے'' میں نے بلا سوچ کہہ دیا۔

خالد صاحب نے دیکھ لیا تھا کہ میں مولانا مودودی کی کتاب ''خلافت و ملوکیت'' کی ورق گردانی کر رہا ہوں۔ وہ جلدی سے اٹھے اور جھپٹ کر وہ کتاب میرے ہاتھ سے چھین کر ایسے الماری میں رکھ دی جیسے گرم گرم آلو ان کے ہاتھ میں آ گیا ہو۔

''آپ مولانا مودودی کو پسند نہیں کرتے؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''یہ پسند اور ناپسند کا سوال نہیں ہے'' خالد صاحب بولے۔ اس وقت مجھے گشت کا ضابطہ نمبر تین اور چار یاد آیا۔'' سیاست اور خطابت میں پڑنے کے بجائے ہمیں اسلام کے بنیادی اصولوں پر توجہ دینا چاہیے۔''

''مگر ہم سیاست میں پڑے بغیر دنیا سے ناانصافیوں کا خاتمہ کیسے کر سکتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''اگر مسلمان اپنی عبادات میں سچے ہو جائیں، خدا کو یاد کریں اور اس کائنات میں اپنے مقام کو پہچانیں تو پھر یہ ناانصافیاں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔'' اس کے بعد خالد صاحب نے اس بات کا جواب سننے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی اور کسی تمہید کے بغیر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''الحمدللہ۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ ہمیں اور کہیں بھی جانا ہے۔''

ہمارا دوسرا پڑاؤ ایک مزدور کا گھر تھا جو پنجاب سے تعلق رکھتا تھا اور کئی سال سے یہاں رہتا تھا۔ خالد صاحب نے بڑے پیار سے پوچھا کہ وہ باقاعدگی سے نماز پڑھتا ہے اور اسے برطانیہ میں رہتے ہوئے اپنی عبادات میں کوئی مشکل تو پیش نہیں آتی۔

''نہیں تو'' مزدور نے اتنے زور سے کہا کہ تبلیغی بھائی ایک ساتھ چونک پڑے۔ پھر خالد صاحب نے اپنے حواس درست کیے اور ایمان کے بارے میں اسے بتانا شروع کیا ''ایمان

جنت کی کنجی ہے۔ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ اس کا ایمان درست ہو اور اس ایمان پر وہ صحیح طریقے سے عمل کر رہا ہو۔''

''آپ کو کیسے معلوم کہ میرا ایمان صحیح نہیں ہے یا میرا ایمان کمزور ہے۔ آپ کے پاس ایمان ناپنے کا کوئی میٹر ہے؟ وہ پیمانہ کہاں ہے، میں بھی تو دیکھوں۔'' وہ مزدور بول رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت بھری ہوئی تھی۔

''میرے عزیز بھائی، میں تو کہہ رہا ہوں کہ ایمان۔ یعنی خدا کی مرضی کے آگے سپردگی ہی فہم و ادراک کی کنجی ہے اور جنت میں جانے کی پہلی شرط بھی یہی ہے۔'' خالد صاحب نے اس شخص کی آنکھوں کی شرارت دیکھ لی تھی مگر وہ اپنے لہجہ کی نرمی کم کرنے کو تیار نہیں تھے۔

''آپ نے طوائف کی کہانی سنی ہے؟'' مزدور نے سوال کیا۔

''طوائف؟ کیسی طوائف؟'' خالد صاحب کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ یہ کیا کہہ رہا ہے۔

''ایک دن'' اس شخص نے کہنا شروع کیا۔ ''حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طوائف کو کنویں کے پاس سے گزرتے دیکھا۔ وہ جا رہی تھی تو اس نے دیکھا ایک کتا پیاس سے مرا جا رہا ہے۔ اس نے کنویں سے پانی نکالا اور اپنے جوتے میں بھر کر اس کتے کو پلا دیا۔ آنحضرتؐ اس طوائف کی رحم دلی سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے فرمایا اس کی اسی رحم دلی کی وجہ سے اس کے سارے گناہ معاف کر دیے جائیں گے اور وہ جنت میں جائے گی۔''

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' حاجی صاحب نے بے صبری سے پوچھا۔ مجھے لگا کہ تبلیغی جماعت کا اصول نمبر چار خطرے میں ہے۔ ''اگر میں اس طوائف کی طرح نمازوں کا پابند نہیں ہوں تو آپ یقین کے ساتھ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ مجھے ان نیک کاموں کی وجہ سے معاف نہیں کر دیا جائے گا جو میں کر چکا ہوں یا آئندہ کروں گا۔''

اب خالد صاحب نے سوچا کہ اصول نمبر چار کو فراموش کرو اور اپنی حکمت عملی تبدیل کر کے بحث کا مقابلہ بحث سے ہی کرو۔ ''اچھا تو عزیز بھائی، میں بھی آپ کو حضرت محمد ﷺ کی حیات طیبہ سے ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔'' انہوں نے اپنی کرسی اس شخص کے اور قریب کر لی۔ ''ایک دن آں حضور ﷺ باہر بیٹھے تھے کہ ایک شخص جس نے سفید لباس پہنا ہوا تھا، جس کی داڑھی بھی سفید تھی اور جس کے چہرے پر تھکن کے آثار بھی نہیں تھے۔ آپ کے پاس

آیا اور سوال کیا۔ ''ایمان کیا ہے؟'' آپ نے فرمایا۔ ایمان یہ ہے کہ آپ اللہ اور اس کے فرشتوں کو مانتے ہوں اور اس کے رسول اور روز آخرت پر یقین رکھتے ہوں۔'' اس کے بعد اس شخص نے سوال کیا۔ ''اسلام کیا ہے۔'' آپ نے فرمایا۔ اسلام یہ ہے کہ آپ اللہ کی عبادت کرتے ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ مانتے ہوں، نماز پڑھتے ہوں، زکوٰۃ دیتے ہوں اور رمضان کے روزے رکھتے ہوں۔ اس کے بعد اس شخص نے سوال کیا احسان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا۔ احسان یہ ہے کہ جب آپ نماز پڑھیں تو یہ سمجھیں جیسے آپ اللہ کو دیکھ رہے ہیں۔ یا آپ اللہ کو نہیں دیکھ رہے ہیں تو وہ آپ کو دیکھ رہا ہے۔'' خالد صاحب ٹھہرے اور پھر بولے۔ ''آپ کو معلوم ہے وہ شخص کون تھا؟ وہ جبریل تھے۔'' اس کے بعد انہوں نے پھر توقف کیا اور کہا۔ ''ظاہر ہے آپ پیغمبرِ اسلام کی ہی پیروی کریں گے، طوائف کی تو نہیں کریں گے نا۔''

حاجی صاحب نے فخر سے میری طرف دیکھا، جیسے کہہ رہے ہوں۔ ''دیکھا، مُنھ بند کر دیا نا۔'' مزدور نے ایک ایک کر کے ہم تینوں کو دیکھا۔

''مجھے آنحضرتؐ کی ایک اور حدیث یاد آگئی ہے۔'' وہ بولا۔ ''آپ نے فرمایا ایمان کی ساٹھ ستر سے زیادہ شاخیں ہیں۔ ان میں سب سے بہتر یہ اقرار ہے کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے اور سب سے کم یہ ہے کہ آپ دوسروں کے راستے میں پڑی وہ چیزیں ہٹا دیں جن سے کسی کو تکلیف پہنچ سکتی ہو۔ میں صفائی کرتا ہوں، اسی سے روزی کماتا ہوں۔ بارش ہو یا دھوپ میں ہفتے میں پانچ دن سڑکیں صاف کرتا ہوں۔ اس لیے میرا ایمان پکا ہے۔ مجھے کسی کے سرٹیفکیٹ کی یا اپنا ایمان چیک کرانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

اب خالد صاحب کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ وہ بڑی تکلیف کے ساتھ اٹھے اور ہم سلام کر کے جلدی سے وہاں سے نکل آئے۔

ہم مسجد کی محفوظ چہار دیواری کی طرف جا رہے تھے تو خالد صاحب بڑبڑائے۔ ''یہ مسلمان بھی کتنے جھکی ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ اس سے ہوشیار رہیے۔'' انہوں نے نہایت معصومیت کے ساتھ شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ ''ورنہ آپ بھی ایسے ہی ہو جائیں گے۔'' کسی مظلوم شخص کو تکلیف پہنچانا چونکہ میری عادت نہیں ہے اس لیے میں خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ وہ مجھے مشورہ دے رہے تھے کہ میں جماعت کے چھ اصولوں پر سختی کے ساتھ کار بند رہوں ''ابھی آپ کو بہت کچھ سیکھنا ہے۔ آپ کو ہمارے ساتھ زیادہ وقت گزارنا چاہیے۔ مجھے اندازہ

ہوگیا تھا کہ ان کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا مطلب ہے وہی باتیں بار بار سننا جو اب تک میں سنتا آرہا تھا۔ وہی چھ اصول، وہی چھ ضابطے۔ میں نے سوچا ان لوگوں نے جب میرے گھر دھاوا بولا تھا اس کے بعد سے اب تک نہ تو میں جنت کے قریب پہنچا ہوں اور نہ میرے دماغ میں جنت کا تصور واضح ہوا ہے۔ میں وہیں ہوں جہاں اس سے پہلے تھا۔ میں نے ان سے جو سیکھا وہ یہ تھا کہ ان کا فارمولا میرے کام کا نہیں ہے۔

مسجد کے اندر جاتے ہوئے مجھے صوفیہ بہن کی جھلک دکھائی دی۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور کچھ بولے بغیر اشاروں میں ہی انگریزی کا ہندسہ 8 بنادیا۔ تھوڑی دیر کے لیے میری توجہ کسی اور طرف بٹ گئی۔ مڑ کر دیکھا تو وہ وہاں نہیں تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے آٹھ بجے اس وقت ملنا چاہتی ہیں جب مغرب کی نماز ہورہی ہو۔ میں اس وقت تک وضو کرتا رہا جب تک تمام لوگوں نے نماز کی نیت نہ باندھ لی۔ پھر میں وہاں سے نکلا اور صوفیہ بہن کو تلاش کرنے لگا۔ وہ مسجد کے عورتوں والے حصے میں نہیں تھیں۔ راہداری میں بھی وہ نظر نہ آئیں تو میں باہر نکل آیا اور کار پارک میں انہیں تلاش کرنے لگا۔ ہوا میں پھولے ہوئے لہراتے کپڑوں سے معلوم ہوا کہ وہ کار (وین) کے پیچھے کھڑی میرا انتظار کررہی ہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو پُرجوش انداز میں سلام کیا۔ ''کیا آپ وہی سوچ رہے ہیں جو میں سوچ رہی ہوں؟'' انہوں نے مجھ سے پوچھا ''بالکل۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو پھر کیوں نہ یہاں سے بھاگ نکلیں۔''

باب۔ ۲

راہِ نجات کے مسافر

صوفیہ بہن اور میں وہاں سے سیدھے جنوب کی طرف جانے والی کوچ کے اڈے پر پہنچے۔ شاید متانت کا تقاضہ تھا کہ راستے بھر وہ بہت کم بولیں۔ ہم دونوں کوچ کی پچھلی نشستوں پر خاموش بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر تو وہ یوں ہی بیٹھی رہیں پھر نہ جانے کیوں انہوں نے اپنے سر سے اسکارف اتارا اور اپنے لمبے اور بھورے بال سنوارنے لگیں۔ اب میرے دماغ نے انہیں نیا روپ دینے کی کوشش کی۔ اب وہ بہن یا سسٹر نہیں رہی تھیں۔ میں نے پہلی بار انہیں اپنی مخالف صنف کی ایک شخصیت کے روپ میں دیکھا۔ اپنا سنگھار مکمل کرنے کے بعد انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا بازو پکڑا اور میرے کاندھے پر سر رکھ کر فوراً ہی گہری نیند کی آغوش میں چلی گئیں۔ شاید کوچ نے بھی ڈاکٹر خان سے ہی سبق سیکھا تھا کہ ہم بہت ہی الٹے سیدھے راستوں سے ہوتے ہوئے دوسری رات کے پچھلے پہر لندن پہنچے۔ میں نے صوفیہ کو اپنے گھر چلنے کی دعوت دی۔

سیٹن پوائنٹ پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہم فلیٹ کے دروازے پر پہنچے تو روشنیاں بند تھیں اور سب سو رہے تھے۔ جب بھی میں گھر سے کہیں جاتا ہوں تو اپنے ساتھ فالتو سامان لے کر نہیں جاتا اور اب تو میں تبلیغ کے مشن پر بھاگا تھا اس لیے میرے پاس گھر کی چابی نہیں تھی۔ میں نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ گھنٹی کی آواز پورے ٹاور بلاک میں گونجی۔ ہم نے انتظار کیا۔ روشنی ہوئی اور میری ماں نے دروازہ کھولا۔ وہ سفید نائٹ گاؤن پہنے ہوئے تھیں۔

''ممی۔'' میں نے زمین پر نظریں گاڑے گاڑے کہا۔ ''یہ صوفیہ بہن ہیں۔'' ممی نے مجھے دیکھا۔ پھر صوفیہ کو دیکھا اور پھر میرے اوپر نظریں گاڑ دیں۔ ان کی نظروں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ غلط سمجھ رہی ہیں۔ اس گونجتی خاموشی میں میں نے ایک اچھلتی سی نظر ممی پر ڈالی۔ ان کا رنگ آہستہ آہستہ اپنے گاؤن کی طرح سفید ہوتا جا رہا تھا۔

صبح میں سو کر اٹھا تو صوفیہ جا چکی تھی۔ یہ مجھے کبھی معلوم نہیں ہو سکا کہ اسے اس گھر سے کس طرح نکالا گیا تھا۔ ویسے تو میں بہت متجسس اور ہر بات کی ٹوہ لینے والا انسان ہوں لیکن اس وقت عقل مندی اسی میں تھی کہ میں خاموش رہوں اور پھر بڑوں کے ادب کا تقاضہ بھی یہی تھا اور میرے سامنے ایک اور بھی مسئلہ تھا۔ یہ تو واضح ہو گیا تھا کہ تبلیغی جماعت کا راستہ میرا راستہ نہیں ہے لیکن میں جنت میں جانے کی آرزو کو بھی اتنی آسانی سے نہیں ٹال سکتا تھا۔ میں نے گلاسگو میں جو راتیں آنکھوں میں کاٹی تھی اس نے مجھے ایک نیا شعور دیا تھا کہ جنت ایک ایسا امتیازی نشان یا موتیف ہے جس کے ارد گرد کلچر، معاشرہ، سیاست اور آرٹ اور مسلم اور برطانوی تہذیب کا لبادہ چڑھا ہوا ہے۔ یہ ایک ایسا آئیڈیل ہے جو میری ان شناختوں میں جاری و ساری ہے جنہوں نے میری زندگی کی تشکیل کی ہے۔ جنت ان چیزوں سے ماورا بھی ہے اور ان سے مربوط بھی ہے جو میری ہیں اور غالباً دونوں دنیاؤں میں وہ ایسے امکانات کی حامل ہے جو معمولی اور روایتی فکر سے ٹھوس اور گہرے علم و دانش کی طرف ہمیں لے جاتی ہے۔ وہ ایسے ذہنی روّیہ کی عکاسی کرتی ہے جو اپنے اردگرد کی دنیا اور اس کے حالات سے غیر مطمئن ہے۔ یہ اس باغی انسان کی جستجو ہے جو حالات کو بہتر بنانا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر خان اور مسعود صاحب نے مجھے دعوت دی اور یہ دعوت میرے لیے ایسا پتھر ثابت ہوئی جو تالاب کے کھڑے پانی میں ہلچل مچا دیتا ہے۔ میرے شعور میں بھی ایسی ہی ہلچل مچ گئی تھی۔ مجھے ان کے چھ نکات خواہ کتنے ہی محدود اور ایک دائرے میں بند نظر آئے لیکن انہوں نے سوالات کا ایک سلسلہ میرے سامنے کھڑا کر دیا۔ جنت کے بارے میں سوالات۔۔۔ کہ وہ کیا ہے؟ اس کا مطلب کیا ہے؟ اور اسے کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے؟ آئندہ میں اسے کوئی معمولی چیز نہیں سمجھوں گا۔

میری پرورش ایسے ماحول میں ہوئی تھی کہ میں ہر بات میں مین میخ نکالتا تھا۔ اسے شاید اس زمانے کا تقاضہ بھی کہا جا سکتا ہے جس زمانے میں میں پیدا ہوا۔ میں پنجاب کے ایک دور

افتادہ گاؤں میں اس وقت پیدا ہوا جب حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔اس وقت میرا گاؤں متنازع علاقہ تھا۔ یہ کوشش کی جارہی تھی کہ میری اس وراثت کو تقسیم کرنے کے لیے کہاں سرحدیں قائم کی جائیں جو وراثت اس سے پہلے میرا پورا وجود تھی۔ میں اب پاکستانی کہلاؤں گا یا ہندوستانی؟ یہ طاقت کا استعمال اور یہ دو شناختوں کے درمیان کھلی جنگ تھی اور یہ دونوں شناختیں مجھے اپنی اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ یہ تقسیم کے طویل اور ہیجان خیز عمل کا نیا دور تھا۔ جس گاؤں میں میں پیدا ہوا وہ کبھی اس طرف تھا تو کبھی اس طرف۔ ہندوستان کی تقسیم ایک ایسی وجہ تھی جس نے مجھے پیدا ہونے سے پہلے ہی متنازع شناختوں کی پیچیدہ تاریخ کا حصہ بنا دیا تھا۔ جسے میں اپنی میراث سمجھتا تھا یہ تقسیم اسے ایک نئی منفرد اور مضبوط شناخت دینے کی کوشش تھی۔ لیکن جیسے ہی برصغیر میں نئی بین الاقوامی سرحدیں کھینچی گئیں اور نئی شناختوں نے اپنے آپ کو منوانا شروع کیا۔ میرا خاندان ایک جگہ سے اکھڑا اور دوسری جگہ پہنچ گیا۔ میرا گاؤں پاکستان کا حصہ بن گیا۔ اسے مسلم شناخت مل گئی اور وہ قوم کی تعمیر میں شریک ہوگیا۔

لیکن انہی دنوں یہ ہوا کہ میرے والد نے اس قوم کی تعمیرِ نو کے لیے اپنی محنت اور صلاحیت وقف کردی جس قوم نے ایک سامراجی طاقت کی حیثیت سے برصغیر سے واپس جاتے جاتے یہ تحفہ دیا کہ اس خطے کے حصے بخرے کردیے۔ انہوں نے میری والدہ اور تین بچوں کو پاکستان میں چھوڑا اور جنگ سے تباہ حال برطانیہ کی تعمیر و ترقی کے لیے وہاں پہنچ گئے۔ انہیں کاریں بنانے والی ایک فیکٹری میں کام ملا تھا۔ وہاں انہوں نے ایک ٹوٹی پھوٹی سی اونچی نیچی گلی میں چھوٹا سا فلیٹ لیا اور ہمیں وہاں بلا لیا۔ اب ہمیں اپنی نئی شناخت پیدا کرنے کے لیے نئے سرے سے ایک نئے عمل کا حصہ بننا پڑا۔

اتنے بڑے شہر کی گم نام سی زندگی میں مجھے ایک نئی شے ایک نئی چیز کے طور پر فوراً ہی پہچان لیا جاتا تھا۔ وہاں مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ مجھے اپنی مرضی کے بغیر ہی ایک آزادی سی مل گئی ہے۔ بچوں میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی نئے ماحول میں فوراً ہی گھل مل جاتے ہیں۔ اسی لیے وہ نئے علاقے کو اپنا گھر بنانے اور اسے اپنا سمجھنے کی کوشش میں سب سے آگے ہوتے ہیں۔ مجھے ہیکنی کی خطرناک گلیوں کے پار ایک اسکول میں داخل کرایا گیا تھا۔ یہی زمانہ تھا جب پاکستانیوں کو مارنے پیٹنے اور ذلیل کرنے (Paki bashing) کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ مجھے اکثر اس کھیل کا نشانہ بننا پڑا۔ پیدائشی مسلمان ہونا، مسلمان بننا اور اپنی شناخت قائم کرنا

ایک ایسا مسئلہ تھا جس کا مجھے ہر جگہ سامنا کرنا پڑا، چاہے وہ لندن ہو یا اپنا پرانا گھر۔ تقسیم شدہ ہندوستان۔ وہ آزادی جو میرے اوپر مسلط کی گئی تھی وہ اسکول جانے کی وجہ سے نہیں تھی۔ میں چونکہ اس سرزمین کی زبان جانتا تھا اس لیے مجھے دکان داروں، بس کنڈکٹروں اور ان بھانت بھانت کے سرکاری ملازموں کے لیے اپنی ماں کا ترجمان بننا پڑتا جن سے ہمارا واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ میرے ذمہ یہ کام بھی تھا کہ میں نئے اُبھرتے ہوئے ایسے کونے کھدرے بھی تلاش کروں جہاں ہم جیسے لوگوں نے اپنے وطن کی عادات و اطوار زندہ رکھنے کے لیے ایسی دکانیں کھول لی تھیں جہاں حلال گوشت، مرچ مسالے، دالیں، آٹا اور مناسب سائز کے چاول کے تھیلے ملتے تھے چونکہ میرا خاندان وہاں اپنی جڑیں گاڑ رہا تھا اس لیے میرا ادھر ادھر گھومنا پھرنا ضروری تھا۔

میری بڑھتی ہوئی عمر تھی اس لیے مجھے زندہ رہنے کے لیے نئے اصولوں پر جلد سے جلد دسترس حاصل کرنا تھی۔ یہ تارکین وطن کے بچے ہی ہوتے ہیں جو حیرتوں سے بھری نئی دنیا کے بارے میں نئی نئی معلومات اپنے ساتھ گھر لاتے ہیں اور اپنے بڑوں کو ان میں شریک کرتے ہیں۔ بالغوں کے برعکس یہ بچے ہی ہوتے ہیں جو نئی اور عجیب و غریب چیزوں کو بھی عام قدرتی مظاہر ہی سمجھتے ہیں اور ان سے بہت جلد مانوس ہوجاتے ہیں۔ بڑی عمر کے لوگوں کا دماغ کسی دوسرے انداز میں پہلے ہی پختہ ہوتا ہے اس لیے وہ نئے اثرات قبول کرنے میں ہچکچاتے ہیں یا ان کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں۔ بچے ہی عام مقامات اور عام اشیا جیسے اسکول، سڑکیں، ٹیلی وژن، نئے فیشن، نئے رسم و رواج اور نئے عادات و اطوار اپنے گھر میں داخل کر دیتے ہیں۔

میرے والدین اکثر اپنے دوستوں کو گھر بلاتے تھے۔ شام کی یہ محفلیں عام طور پر مشاعرہ کی شکل اختیار کرلیتی تھیں۔ اردو زبان سے محبت کرنے والوں کی یہی ایک تفریح تھی۔ میری والدہ بڑی پابندی سے ہندوستانی فلمیں دیکھتی تھیں اور وہاں انہیں جو مکالمہ، جو لفظ یا جو خیال اچھا لگتا وہی ہمارے گھر کی محفل کا موضوع بن جاتا۔ اکثر اتوار کو میں انہیں لندن کے ان سینما گھروں میں لے جاتا جہاں ہندوستانی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ ہم ایک ایک وقت میں دو دو فلموں کے مزے لوٹتے۔ سینما ہال کے اندھیرے میں میں اپنا رشتہ اپنی اس مشترکہ میراث سے جوڑنے کی کوشش کرتا جہاں اب میں موجود نہیں تھا۔ یہ تمام فلمیں گانوں سے بھری ہوتی تھیں۔ وہ گانے اپنے زمانے کے مشہور و معروف شاعروں نے لکھے ہوتے تھے۔ میرے ماں باپ اور ان کے دوست بھی ایسی ہی شاعری کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ گنگناتے ہوئے غنائی لفظوں کی شاعری۔ یہ بھی

میری عام زندگی کا حصہ تھی۔ بچے بہت سی مختلف چیزوں کو اکٹھا کرنا اور ملانا بھی خوب جانتے ہیں۔ وہ ساسجز، میش اور فش اینڈ چپس کو ساگ گوشت اور پراٹھے کے ساتھ ملا کر کھا سکتے ہیں اور انھیں یہ خیال بھی نہیں آسکتا کہ وہ یہ کیا ملغوبہ بنا رہے ہیں۔ کسی بھی بچے کے لیے یہ کہنا ایک نارمل اور معمولی بات ہے کہ میں اس نئی جگہ اور نئی چیز کا وارث ہوں اور یہ سب میرا ہی ہے۔ یہ تھی وہ دنیا جس میں میری پرورش ہوئی۔

میں بالکل ہی ایک نئی قسم کا مہم جو تھا کیونکہ میری کئی دنیائیں تھیں۔ لیکن میں جن دنیاؤں میں زندہ تھا وہ ایک دوسرے کو مشکل سے ہی پہچانتی تھیں۔ ہر طرف سے یہ دباؤ تھا کہ ہر چیز کو الگ الگ خانوں میں بانٹا جائے اور ہر وہ دنیا جس کا میں حصہ تھا میرے لیے مخصوص کردی جائے اور اس طرح مجھے ان بے شمار امکانات سے محروم کر دیا جائے جن کے دروازے میرے سامنے کھلے ہوئے تھے۔ دوسری جانب میں اپنی نئی زندگی میں دوسری جنگ عظیم کے بعد پیدا ہونے والی برطانیہ کی اس چمکتی دمکتی نسل سے بھی تعلق رکھتا تھا جس کے سامنے نئے نئے افق پھیلے ہوئے تھے۔ یہ وہ کھیتی تھی جس میں بے شمار سوالوں کی فصل اُگی ہوئی تھی اور میں ساری عمر یہی فصل کاٹتا رہا۔ اپنی نئی زندگی میں مجھے ایک فلاحی ریاست کے روشن مواقع میسر تھے۔ جس وقت میں پروان چڑھ رہا تھا اس وقت کنزیومر سوسائٹی کو وہ عروج نصیب ہو رہا تھا جو عام آدمی نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ چیزوں اور خریداروں کی فراوانی تھی۔ میری شخصیت ٹیکنالوجیکل انقلاب کی بھٹی میں تپ کر نکلی تھی۔ میں کلیپٹن پونڈ میں بروک ہاؤس سیکنڈری ماڈرن اسکول کا لڑکا تھا جو Sixth Form Opinion کا سائنس ایڈیٹر بن گیا۔ یہ اسکول کے طلبہ کا نیشنل میگزین تھا۔ یہ موقع مجھے اتفاق سے ہی مل گیا۔ ادھر ادھر مُنھ مارنے کی اپنی عادت کی وجہ سے میری ملاقات ایک نہایت ہی شریف آدمی سے ہوگئی۔ یہ صاحب اس میگزین کے روح رواں تھے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ کیا میں آپ کے ساتھ کام کرسکتا ہوں؟ میرے لیے اس سے زیادہ کشش کی بات اور کیا ہوسکتی تھی کہ مجھے اپنی دنیا کی تحقیق اور تفتیش کرنے کی اجازت مل جائے۔

مجھے یاد ہے کہ ہم نے ٹونیبین کا ایک طویل انٹرویو شائع کیا تھا۔ ٹونی ایک ٹیکنالوجیکل جنت کا انقلابی خیال مقبول بنانے کی دھن میں لگا ہوا تھا۔ ہم ایک ایسے وقت اور ایک ایسے زمانے میں تھے جب ایک دوسرے سے متصادم اور متضاد معانی اور متضاد نظریات اور جھگڑے میری نسل کی تشکیل نو کر رہے تھے۔ ان دنوں بغاوت ایک ایسا کھیل بن چکی تھی جس میں تمام

نوجوان حصہ لے رہے تھے۔ احتجاج، مارچ، سٹ، ماؤزے تنگ کی لٹل ریڈ بک اور چے گویرا کی شکل والی ٹی شرٹ عام فیشن میں شامل ہوچکی تھیں۔ میں نے احتجاج کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ اپنے اسکول میں اسلامی سوسائٹی قائم کرلی۔ اس طرح مجھے FOSIS سے رابطے کا موقع ملا۔ اس کا پورا نام تھا فیڈریشن آف اسٹوڈنٹس اسلامک سوسائٹی برطانیہ اینڈ آئرلینڈ۔ وہ یونیورسٹی طلبہ کی تنظیم تھی۔ لیکن جیسے اس قسم کی تمام تنظیموں میں ہوتا ہے، میں اسکول کا طالب علم ہوتے ہوئے بھی اس کی سرگرمیوں میں شریک ہونے لگا۔

جس زمانے میں تبلیغیوں کے ساتھ میرا واسطہ پڑا اس سے چند سال پہلے سے ہی میں FOSIS سے منسلک چلا آرہا تھا۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی کے اوائل میں اس تنظیم کے جلسوں میں شرکت کرنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ کیسے مختلف قسم کے لوگ اس کے ساتھ ہیں۔ برطانیہ کے مسلم طلبہ اپنے علاقائی اور جغرافیائی حوالوں اور روایات، جدیدیت، انقلاب اور اصلاح کے بے جوڑ ملغوبہ ہمیں مسلم دنیا کا ایک بہت ہی چھوٹا سا حصہ تھے۔ اس تنظیم کے ارکان کی دو نمایاں قسمیں تھیں۔ ایک تو تارکین وطن طلبہ تھے جو مختلف یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے تھے۔ دوسرے وہ مقامی اور امریکی ہپی تھے جنہوں نے انتہائی مشکل اور محنت طلب جستجو کے بعد تصوف کی آغوش میں پناہ لی تھی اور مسلمان ہوگئے تھے۔ تیسری لہر ابھی موج نہیں بنی تھی۔ میں بھی اپنے آپ کو آنے والے طوفان کے چند قطروں میں شمار کرتا تھا۔ یعنی مسلمان تارکین وطن خاندانوں کے ان بچوں میں جو برطانیہ میں پیدا ہوئے یا پلے بڑھے اور وہیں تعلیم حاصل کی بلکہ وہ اعلیٰ تعلیم کے درجات تک پہنچ گئے۔

وہ تنظیم ۱۹۶۲ء میں مختلف یونیورسٹیوں کے ان مسلم طلبہ نے برمنگھم میں بنائی تھی جو برطانیہ بھر کی مسلم تنظیموں کے درمیان رابطہ پیدا کرنا چاہتے تھے اور یہ اس زمانے کے طلبہ کے باغیانہ مزاج سے مطابقت رکھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ برطانیہ کے مسلم طلبہ اس کی طرف بہت راغب ہورہے تھے۔ لیکن اس تنظیم نے ویت نام کی جنگ کے خلاف مظاہروں اور طلبہ کے حقوق کی جدوجہد سے اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھا۔ ہماری توجہ ان مسائل کی طرف تھی جن کا تعلق مسلمان طلبہ سے تھا۔ یہ بات ان دنوں زیادہ فیشن میں نہیں تھی۔ ہم نے ۱۹۶۶ء میں جمال عبدالناصر کی حکومت کے خلاف اس وقت مظاہرے کیے جب اس نے اخوان المسلمون کے رہنما سید قطب کو موت کی سزا دی۔ پھر ۱۹۶۷ء میں فلسطین پر اسرائیلی حملے، ۱۹۶۹ء میں بیت المقدس

پر اسرائیلی قبضے اور ۷۰۔۱۹۶۹ء میں ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات کے خلاف مظاہرے کیے۔ اس تنظیم نے کلبرن میں اپنا مستقل دفتر بنالیا تھا جہاں سے تیس کے قریب انجمنوں کا نظام چلایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ سال میں دو بڑے اجتماع بھی ہوتے تھے۔ ایک تو سالانہ کانفرنس تھی دوسرے موسم سرما میں ایک کیمپ لگایا جاتا تھا۔

جو اصحاب میرے مربّی اور مرشد بن گئے تھے ان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس تنظیم کے ارکان میں کتنے مختلف النوع افراد شامل تھے۔ ان میں ایک تو نائجیریا کے عبداللہ اویکن تھے جن میں بلا کا حس مزاح تھا۔ وہ امپیریل کالج میں انڈسٹریل کیمسٹری پڑھ رہے تھے۔ دوسرے تھے ابراہیم محمد۔ یہ ملائیشیا سے تعلق رکھتے تھے نہایت شریف اور انتہائی بے غرض انسان۔ یہ قانون کی تعلیم حاصل کررہے تھے۔ ایک اور تھے ٹرینیڈاد کے عبدالواحد حامد جو مورّخ تھے اور اسکول آف افریکن اینڈ اورینٹل اسٹڈیز میں پڑھ رہے تھے۔ پھر تھے سری لنکا کے محمد رزاق جو چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بن رہے تھے اور پاکستان کے غیاث الدین صدیقی تھے۔ وہ انڈسٹری پولیوشن میں پوسٹ گریجویشن کررہے تھے۔ خاموش طبع محمد اقبال اساریا یوگنڈا کے ایشیائی تھے جو مانچسٹر یونیورسٹی میں معاشیات کے طالب علم تھے اور پھر سعودی عرب کے عبداللہ نصیف تھے جو ہر وقت مسکراتے رہتے تھے۔ وہ لیڈز یونیورسٹی میں ارضیات میں پی ایچ ڈی کررہے تھے۔ ان میں سب سے کم عمر اور آنے والے طوفان کے چند قطروں میں سے ایک پاکستانی جمیل شریف تھے جو اپنی جگہ خود اعتمادی کا مکمل نمونہ تھے اور لندن کی سٹی یونیورسٹی میں کیمسٹری پڑھ رہے تھے۔ یہ سب میرے مربّی تھے۔

طلبہ کے اندر دوستی اور باہمی اخوت کی جو فراوانی ہوتی ہے اس کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کے جڑواں بھائی بنے ہوئے تھے۔ ہم ایک دوسرے کے گھروں میں بیٹھ کر کام کرتے اور نمازیں پڑھتے۔ میری والدہ خوشی خوشی ہمارے کھانے پینے کا انتظام کرتیں۔ اس زمانے کی دوسری طلبہ تنظیموں کی طرح ہمیں بھی اپنی برادری کے لیے اپنی ذمہ داریوں کا پورا احساس تھا۔ ہم کئی اعتبار سے ان اصولوں پر عمل کررہے تھے جو گیارھویں صدی کے مسلم مفکر الغزالی نے مسلمانوں کے لیے وضع کیے تھے۔ انہوں نے لکھا ہے "یاد رکھو، دو انسانوں کے درمیان اخوت کے رشتے میں بندھنے کا معاہدہ ایسا ہی ہے جیسے میاں بیوی کے درمیان شادی کا قول وقرار۔ کیونکہ جس طرح شادی آپ کو چند ذمہ داریاں سونپتی ہے اسی طرح اخوت اور برادری کا رشتہ

بھی کچھ ذمہ داریاں عائد کرتا ہے۔آپ کی شخصیت، آپ کی زبان اور آپ کا دل عفو و درگزر، عبادت، دیانت، وفاداری اور صلۂ رحمی کے لحاظ سے سب برابر کے شریک ہوجاتے ہیں۔"

اور اگر ہمارے لیے یہ بھی ناکافی ہوتا تھا تو ہم سچ مچ شادی کا انتظام بھی کر دیتے تھے۔ ہمارے ہاں شادی ہمیشہ سے ماؤں کی ذمہ داری اور ان کا استحقاق رہا ہے۔دنیا بھر کے مسلمان خاندانوں میں یہ بزرگ خواتین ہی ہوتی ہیں جو اپنے بچوں کی شادی کے لیے رشتوں کی چھان بین کرتی ہیں۔آج کل موزوں اور مناسب جوڑے ملانے کے لیے جو کمپیوٹر سافٹ ویئر تیار کیے گئے ہیں یہ خواتین ان سے بھی زیادہ اپنے فن میں ماہر ہوتی ہیں۔انسانی شخصیت کے ذاتی، نفسیاتی اور سماجی عوامل کا تجزیہ کرنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ ماں باپ کی پسند سے کی جانے والی شادی میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ جس لڑکے لڑکی کا جوڑا ملایا جارہا ہے ان میں ایسی مناسبت ضرور ہونا چاہیے جو مستقبل میں ان کے درمیان انس و محبت کو پروان چڑھائے۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ لڑکا اور لڑکی خواہ کتنے ہی قریبی عزیز ہوں ایک دوسرے کو بہت زیادہ نہیں جانتے۔ ۱۹۶۰ءاور ۷۰ء کی دہائی کے اوائل میں برطانیہ میں رہنے والی مسلم خواتین اپنی جڑوں سے اکھڑی ہوئی تھیں۔ وہ ایک ایسے مضبوط اور بنے بنائے معاشرے سے نکل کر یہاں آئی تھیں جہاں نسل ہا نسل سے پورے کے پورے گاؤں اور پورے محلے ایک دوسرے کے ساتھ رشتوں میں جڑے ہوتے تھے۔ برطانیہ کے نئے ماحول میں وہ ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھیں اور ان کے پاس وہ ذرائع نہیں تھے جو ماں باپ کی طرف سے طے کی جانے والی شادیوں کے لیے ضروری ہیں کہ ان کے ذریعہ لڑکے لڑکی یا ان کے خاندان کے بارے میں معلومات حاصل کی جاسکیں۔ ابھی یہ بات نئی نئی شروع ہوئی تھی کہ مختلف خاندانوں سے مل کر چھوٹی سی ایشیائی برادری کے ایک ہی پس منظر کے لوگوں میں سے صحیح اور مناسب لڑکے لڑکی کو چنا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ کہیں کوئی بدمعاش گھر میں نہ آجائے اور اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اس اجنبی ماحول کا نوجوانوں پر کیا اثر ہوا ہے؟ یہ سب کچھ ابھی ابتدائی مراحل میں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ جو ان اسرار سے زیادہ واقف تو نہیں تھے لیکن نوجوان تھے اور وسیع تعلقات رکھتے تھے وہ شادی کرانے اور جوڑے ملانے کے کاروبار میں خوب چمک رہے تھے۔ ہماری تنظیم کی یہ ذمہ داری تو نہیں تھی کہ جسے بیوی کی ضرورت ہو ہم اسے وہ تلاش کر دیں لیکن ہم یہ فرض بھی ادا کر رہے تھے۔

بظاہر ایسا لگتا تھا کہ ہماری تنظیم جن مقاصد کے لیے کام کر رہی ہے وہ اس وقت کے بڑے مظاہروں اور احتجاج کے سامنے معمولی تھے۔ لیکن حقیقت میں ایسا تھا نہیں۔ باہر کی دنیا میں سیاست کا جو بڑا دھارا تھا اس میں تیسری دنیا کے مسائل سب سے زیادہ موضوع بحث بنے ہوئے تھے۔ سامراجی طاقتوں کے ضمیر نو آبادیوں پر قبضہ کے احساسِ جرم سے زخمی تھے۔ نئے سے نئے ملک آزاد ہو رہے تھے۔ بہت سی پرانی نو آبادیاں نئی قوم بن گئی تھیں۔ لیکن انہیں وراثت میں غربت و افلاس اور نا اہلی ملی تھی جس کی وجہ سے ان کے اندر ترقی کرنے کی صلاحیت ہی مفقود تھی۔ افلاس اور فاقہ کشی کے بارے میں جو فکر و پریشانی پیدا ہو رہی تھی اس سے سیاسی اور معاشی ڈھانچہ کے ناانصافی اور غریب و امیر خطوں میں بٹی ہوئی دنیا کے بارے میں سوالات سر اٹھا رہے تھے۔ ترقی میں ناکامی کو قسمت کا لکھا سمجھنے کے بجائے سسٹم کی ناکامی کہا جا رہا تھا۔ FOSIS کے ارکان کے لیے یہ سب پرانی باتیں تھیں۔ یہ نئے نئے خیالات پرانی باتیں ہی تھیں۔ ہم ترقی کی کلاسیکی تھیوری کی کمزوریوں کو اچھی طرح جانتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ یہ تھیوری کن حقائق کو نظر انداز کرتی ہے، وہ تمام پیچیدہ حقائق جن سے وہ لوگ واقف نہیں تھے اور وہ تمام غلط بنیادیں جن پر یہ تھیوری کھڑی تھی۔ کیونکہ ہم اسی دنیا میں رہتے تھے۔ یہیں پلے بڑھے تھے اور اس کے ساتھ مختلف شکلوں میں ہم وابستہ تھے۔ ہمیں اس متبادل طرز زندگی پر شبہ تھا۔ اس لیے نہیں کہ کسی متبادل طرزِ حیات کی فوری ضرورت نہیں تھی بلکہ اس لیے کہ یہ لوگ روایت کا ایک رومانی تصور رکھتے تھے اور ہم کم ترقی یافتہ ملکوں کے باشندے اور اس تنظیم سے وابستہ لوگ جانتے تھے کہ ہمارے سوا اور کوئی اس بات کو تسلیم نہیں کرے گا کہ زمانے کو بدلنا بہت ہی مشکل کام ہے۔

ہمارے درمیان یہ جو اَن کہی مفاہمت تھی اس نے ہمیں ایک دوسرے کے اور بھی قریب کر دیا تھا۔ ہم پورے وثوق کے ساتھ جانتے تھے کہ مسلمانوں کی جس نسل سے ہم تعلق رکھتے ہیں وہ اپنی تعلیم نامکمل چھوڑنے کی عیاشی نہیں کر سکتی اور یہ کہ ہمارا اخلاقی جوش و خروش، ہمارا احتجاج اور ایک حقیقت پسندانہ متبادل کی تلاش ہمارے لیے فیصلہ کن حیثیت کی حامل ہوگی۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ ہمیں اسے سمجھنا اور اسے ٹھیک کرنا تھا۔ یہ ہماری ذمہ داری تھی کہ اسلامی تاریخ کی عظیم گاڑی کو صحیح راستے پر ڈالا جائے۔ اس تنظیم کے بہت سے ارکان جنہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی، بڑی بڑی ڈگریاں لیں انہوں نے اپنے اپنے ملکوں میں جا کر کارخانے

چلائے، سیاست داں بنے اور ممتاز ماہر تعلیم یا بڑے سرکاری افسر بنے۔ ہماری نسل کے طلبہ اور ان کی احتجاجی تحریکوں میں جو آرزوئیں، جو امنگیں اور پختہ عزم کی جو ایک لہر موج زن تھی وہ اکٹھی ہو کر ہمارے ارکان کے دلوں میں بھی بھر گئی تھیں۔ ہم مسلمانوں کی عالمی برادری کا مستقبل تھے اور اپنے عظیم الشان ماضی کے احیا کے لیے سرگرم عمل تھے۔ پوری مسلم دنیا کے حق خود ارادی اور آزادی کی امنگیں اور امیدیں ماضی میں مسلم تاریخ کی عظیم کامیابیوں کے افتخار کی کشش پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ ہم مسلمانوں کے عظیم کارناموں اور علم وسائنس میں ان کی قابل قدر خدمات کی کہانیاں سن سن کر بڑے ہوئے تھے۔ ہم آزادی کے بعد ہوش سنبھالنے والی پہلی نسل تھے۔ ہم سے پہلی والی نسل آزادی کی طغیانی میں ایسی بہہ گئی تھی کہ وہ ہمیں نئے روشن افق تک پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ ہمارے ساتھ ہر خیال کے لوگ شامل تھے۔ ہر وہ شخص جس کے پاس مسلمانوں کے مستقبل کے لیے کوئی پلان، کوئی خواب یا کوئی کیمیائی فارمولا تھا ہم اس کا خیر مقدم کرتے تھے۔ ہمارے رسالے The Muslim کے لیے عالم اسلام کے تمام ممتاز اسکالر اور اسلامی تحریکوں سے متعلق تمام لوگ مضامین لکھ رہے تھے۔ وہ ہمارے موسم سرما جلسوں میں تقریریں کرتے تھے۔ اخوان المسلمون کے سابق سیکریٹری سعید رمضان جو ان دنوں جنیوا میں اسلامی سنٹر کے ڈائریکٹر تھے ہمارے مستقل مقرر تھے۔ میلکم ایکس حج کے لیے مکہ جاتے ہوئے ہمارے پاس ٹھہرے تھے اور ہمارے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ انہوں نے کہا تھا ''میرے لیے چھری کانٹے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنے بڑے بڑے کالے ہاتھوں سے کھاؤں گا۔'' الجزائر کے اسکالر مالک بن نبی، جنہیں دوسری جنگ عظیم کے بعد مسلم دنیا کا سب سے بڑا فلسفی مانا جاتا تھا وہ بھی ہمارے ہاں آئے اور انہوں نے Colonizibility کے موضوع پر اپنا مقالہ پڑھا۔ انہوں نے کہا کہ کسی قوم کی نو آبادی بننے والے کسی بھی معاشرہ کی مادی اور ذہنی کیفیت ایسی ہو جاتی ہے کہ اس کا نو آبادی بننا قریب قریب لازمی ہو جاتا ہے۔ بن نبی الیکٹریکل انجینئر تھے۔ انہوں نے پیرس میں تعلیم حاصل کی تھی اور یورپ میں تیس سال گذارے تھے۔ انہوں نے مغربی کلچر اور مغربی تہذیب کا جو عمیق مطالعہ کیا تھا اس سے وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ عالم اسلام کے نو آبادی بننے کے عمل کو سمجھنے کے لیے صرف یورپ کی فوجی برتری اور اس کی سامراجی ذہنیت کو ہی سمجھنا کافی نہیں ہے۔ مسلم علما جو یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے زوال کا اصل سبب استعماری طاقتوں کی غلامی ہے تو یہ خیال درست نہیں۔ اصل میں مسلم ملکوں کے اندر صدیوں کی افراتفری

سے ایسی صورت حال پیدا ہو چکی تھی کہ وہ پکے ہوئے پھل کی طرح استعماری قوتوں کی جھولی میں گر گئے۔ مسلم معاشروں کی اپنی خامیوں اور کمزوریوں کے بارے میں ان کی تھیوری سے یہ متھ پاش پاش ہوگئی کہ مغربی طاقتیں ناقابل شکست ہیں اور اسی بات نے مسلم طلبہ کو زیادہ متاثر کیا۔ اس سے ہماری توجہ اپنی طرف مبذول ہوگئی۔ ان معاملات کی طرف جن پر ہماری گرفت ہوسکتی تھی، یہ ایسا کام تھا جو ہم اپنے ہاتھوں سے کر سکتے تھے۔

ہم نے خاص طور سے اسلامی تحریکوں کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کیا ہوا تھا۔ تمام مسلم دنیا میں آزادی کی جو تحریکیں چل رہی تھیں وہ سب اسلام سے ہی اثر لے رہی تھیں۔ ان تنظیموں کا دعویٰ تھا کہ سچی آزادی اسی وقت مل سکتی ہے جب ہم اپنے معاشرے کو اسلام کی راہ پر ڈال دیں۔ وہ کہتے تھے کہ مسلم تہذیب کے طویل زوال کا مقابلہ بھی اسلامی اصولوں پر عمل کر کے ہی کیا جا سکتا ہے۔ صحیح معنی میں قومی تعمیر کرنے کے لیے سیاسی اور اقتصادی طور پر اسلامی طرز حیات کو ہی نمونہ بنانا ضروری ہے۔ ہمیں اپنا گرویدہ بنانے کے لیے دو عالم گیر تحریکیں ایسی تھیں جو ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ ان میں ایک تھی مصر کی اخوان المسلمون اور دوسری تھی پاکستان کی جماعت اسلامی۔

جماعت اسلامی کے رہنماؤں میں خورشید احمد بہت ہی نمایاں شخصیت کے حامل تھے۔ بھاری بھرکم جسم اور صاف ستھری گول داڑھی والے یہ صاحب ۱۹۶۸ء میں برطانیہ آئے تھے۔ جماعت اسلامی اگست ۱۹۴۱ء میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے لاہور میں قائم کی تھی۔ اس کا نصب العین اسلامی ریاست کا قیام تھا۔ مولانا مودودی نے جو صحافی کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے مسلمانوں کی زبوں حالی پر برسوں غور وفکر کیا تھا اور اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ مسلمانوں کی کوئی جماعت اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک وہ اسلام کے اخلاقی ضابطے کے اعلیٰ معیار کو بروئے کار نہ لائے۔ انہوں نے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ اپنے دینی فرائض پورے خلوص اور دیانت کے ساتھ ادا کریں۔ وہ اس لیے بھی طلبہ برادری کے لیے ایک زندہ شہید کی حیثیت حاصل کر گئے کہ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۷ء کے درمیان انہیں کم سے کم چار بار قید کیا گیا اور ۱۹۵۳ء میں مارشل لا حکومت نے ایک باغیانہ پمفلٹ لکھنے کے الزام میں انہیں موت کی سزا سنائی۔

خورشید احمد جو جماعت کے ایک اعلیٰ عہدے دار تھے اپنے مرشد کا وقار بلند کرنے میں

ہر وقت کوشاں رہتے تھے۔ ہمیں احساس ہوا کہ وہ خود بھی مولانا کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ وہ بھی نو مہینے کی جیل کاٹ آئے ہیں۔ وہ بھی اپنی تحریروں کے ذریعہ اور انتخابات میں حصہ لے کر اسلامی مملکت کے قیام کی جد وجہد کر رہے ہیں۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ مولانا مودودی اپنے ذاتی زہد وتقویٰ، اپنی سیاسی جدوجہد، اسلامی مقاصد کے ساتھ اپنی وابستگی اور ہر قسم کے دشمنوں کے سامنے سینہ سپر ہو جانے کی جرأت کے اعتبار سے ایک اسلامی اسکالر کا صحیح ماڈل ہیں۔ ہمیں ان کی ہر ہر بات کی پیروی کرنی چاہیے۔

آخر ۱۹۷۱ء کے موسم سرما میں مولانا مودودی سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ اپنا علاج کرانے برطانیہ آئے تھے اور میں ہزاروں طلبہ کے ساتھ ان کا استقبال کرنے ہیتھ رو ائیر پورٹ پہنچا تھا۔ FOSIS نے ان کے اعزاز میں ہلٹن ہوٹل میں ایک زبردست استقبالیہ دیا۔ وہاں ان سے ہاتھ ملانے، ان کی خیریت دریافت کرنے اور ان سے عقیدت کا اظہار کرنے والوں کا ایسا تانتا بندھا کہ مولانا خود بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

رسالہ The Muslim کے لیے ان کا طویل انٹرویو لیا گیا۔ ان سے ان کی زندگی، برطانیہ میں رہنے والے مسلم تارکین وطن، قوم پرستی اور اسلامی تحریک، پاکستان میں سوشلزم، طلبہ کی طاقت، رمضان کا چاند دیکھنے کے مسئلے اور سب زیادہ مسلح بغاوت کے بارے میں سوالات کیے گئے۔ ان سے سوال کیا گیا۔ ”کیا آپ کے خیال میں مسلح بغاوت کے ذریعہ اسلامی حکومت قائم کی جاسکتی ہے؟“ انہوں نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر جواب دیا۔ ”میرے خیال میں ہمارے لیے یہ راستہ اختیار کرنا درست نہیں ہے۔ یہ پالیسی بہتری پیدا کرنے کے بجائے نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے۔“ انہوں نے اس کی وضاحت اس طرح کی کہ ”اگر آپ مسلح بغاوت سے حکومت قائم بھی کر لیتے ہیں تو آپ اسے اسلامی طرز پر چلائیں گے کیسے۔ کیونکہ اسلام جن اخلاقی اقدار اور عادات کا تقاضہ کرتا ہے معاشرہ اور اس کے مختلف طبقوں کو تو آپ نے اس کے لیے پوری طرح تیار کیا نہیں ہوگا۔ مسلح انقلاب دوسروں کے لیے بھی یہی راہیں کھولتا ہے۔ اس لیے خطرہ یہ ہے کہ اس کے بعد مسلم ممالک انقلابوں، جوابی انقلابوں، سازشوں اور جوابی سازشوں کے شیطانی چکر میں پھنس جائیں گے۔ اس کے علاوہ مسلح انقلاب کے لیے آپ کو اپنی تحریک خفیہ تنظیموں کی طرز پر منظم کرنا پڑے گی۔ ان تحریکوں کا اپنا ہی مزاج ہوتا ہے۔ وہاں اختلاف رائے برداشت نہیں کیا جاتا۔ وہاں اختلاف طاقت سے دبا دیا جاتا ہے اور

آزادانہ بحث وتمحیص کی وہاں گنجائش نہیں ہوتی۔ ایسی خفیہ تنظیمیں اپنے کارکنوں کو جھوٹ بولنے، دھوکہ دینے، فراڈ کرنے اور کشت وخون کی اجازت بھی دیتی ہیں اور اسلام اس کی بالکل اجازت نہیں دیتا اور پھر بندوق کی گولی سے لانے والے انقلاب کو قائم رکھنے کے لیے بھی بندوق کا ہی سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس طرح ایسی فضا بن جاتی ہے کہ پُرامن طریقہ سے اسلامی نظام قائم کرنا عملاً ناممکن ہوجاتا ہے۔

میں ان دلائل سے بہت متاثر ہوا۔ یہ صحیح معنی میں ان حالات کا جائزہ تھا جو ساری اسلامی دنیا بلکہ پوری تیسری دنیا میں پیش آرہے تھے یا آسکتے تھے۔ یہ دعوت تھی سیاسی، سماجی، اخلاقی فکر کے متبادل پہلو پر غور کرنے کی، ایک نئے نظام کی طرف پیش رفت کی۔ یعنی جنت میں جانے کا پاسپورٹ۔

چنانچہ مولانا مودودی کی جتنی تحریریں بھی مجھے مل سکتی تھیں میں نے ان کا مطالعہ شروع کردیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کی عام پسند کی تحریریں انقلابی سے زیادہ اصلاحی ہیں اور ان کا مقصد اسلام کے متعلق عام آدمی کا شعور بیدار کرنا ہے۔ ان کی نظر میں اسلام ایک ایسا نظام ہے جس کا تعلق فرد کی زندگی کے ہر پہلو سے ہے اور وہ پورے معاشرہ کو بدلنا چاہتے ہیں۔ ان کا اصرار ہر فرد کی ذاتی کردار سازی اور ذاتی اصلاح پر تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ہر فرد ذاتی طور پر نیک اور پرہیزگار ہوجائے تو معاشرہ خود بخود سدھر جائے گا اور اسلامی نظام قائم ہوجائے گا۔

لیکن بہت جلد مجھے چند دشواریاں نظر آنے لگیں۔ مودودی صاحب اسلام کا جو مکمل خاکہ پیش کررہے تھے اس میں معاشرت، معیشت، سیاست اور بین اقوامی تعلقات سب ہی شامل تھے اور یہ کچھ یوٹوپیا سا معلوم ہوتا تھا۔ میرے اوپر یہ واضح نہیں تھا کہ جو اسلام ہم جانتے ہیں اس میں وہ تمام اصول موجود ہیں جو جدید دنیا کے بحران کا مقابلہ کرسکتے ہوں۔ یہ ایسا مسئلہ تھا جس پر میں مزید بات چیت کرنا چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ اس پر یقین کرنے سے پہلے مزید غور وخوض کروں۔ ان کے دلائل فیصلہ کن نہیں تھے اور انہیں موجودہ معاشرہ کے تلخ حقائق کی کسوٹی پر پرکھا بھی نہیں گیا تھا۔ مودودی بار بار کہتے تھے کہ روایتی علما جدید دنیا سے رابطہ توڑ چکے ہیں۔ مگر مجھے ایسا لگتا تھا کہ وہ خود بھی ان علما کی طرح ہیں۔ ان کے نزدیک اسلامی شریعت ایسا بنا بنایا فریم ورک ہے جو تمام مسائل حل کرسکتا ہے۔ ان کی فکر میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جو اسلام کے عالمی تصور حیات کے بارے میں کوئی نئی بات ہمیں بتاسکے۔ کیا واقعی ایسا ہوسکتا ہے کہ قوانین

کے ایک ایسے پرانے نظام کو جو سینکڑوں سال سے کسی بھی معاشرہ میں موثر طور پر کام نہ کر رہا ہو الماری سے جھاڑ پونچھ کر نکالا جائے اور اسے حکومت کے انتظام، ترقیات اور جدیدیت کے پیچیدہ مسائل سے نبٹنے کے لیے نافذ کر دیا جائے؟ حالانکہ یہ ایسے مسائل ہیں جنہیں ابھی تک حل نہیں کیا جاسکا ہے اور وہ ابھی تک جدید معاشروں میں بحث وتمحیص کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔

سب سے زیادہ مجھے جو چیز پریشان کر رہی تھی وہ عورتوں کے بارے میں مودودی کے خیالات تھے۔ کسی بھی مصنف یا مفکر کے لیے یہ ایک کسوٹی ہے۔ اسلام میں عورت کا مقام اور مسلمانوں کی نصف آبادی کی قسمت کے بارے میں ان کی رائے انتہائی نازک مسئلہ تھا۔ اس سے ان مفکروں کی طرزِ فکر کا اندازہ ہوتا تھا کہ مسلم معاشروں میں عورتوں کے بارے میں جو موروثی رسم ورواج اور روایات چلی آرہی ہیں کیا وہ اس پر اعتراض کر رہے ہیں اور کیا وہ اسے چیلنج کر رہے ہیں یا نہیں اور یہاں اس مغربی سوسائٹی کے بارے میں ان کی سوجھ بوجھ کا امتحان بھی تھا جہاں عورتوں کی آزادی کی تحریکیں تیزی کے ساتھ فروغ پا رہی تھیں اور عورتوں کی زندگی اور معاشرہ میں ان کے مقام کے امکانات پر نئے سرے سے غور کیا جا رہا تھا اور یہی وہ مقام تھا جہاں میں نے محسوس کیا کہ اس دنیا کو جانے دیجیے جس دنیا میں میری والدہ، میری بہنیں، میری جاننے والی اسکول ٹیچرز، نرسیں اور مختلف سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے ملازم، میرے ہم جماعت اور دوسرے طلبہ رہتے ہیں، مودودی صاحب تو اس دنیا کو بھی نہیں سمجھ سکے ہیں جس دنیا میں میں رہتا ہوں۔ اپنی کتاب "پردہ" اور دوسری تحریروں میں انہوں نے خواہ کتنے ہی مضبوط دلائل دینے کی کوشش کی ہو لیکن حقیقت یہی ہے کہ ان کی نظر میں عورت پیدائشی طور پر کمتر مخلوق ہے جسے کفن میں لپیٹ کر گھر کی چہار دیواری میں بند رکھنا چاہیے۔ کیونکہ اس کی فطرت ہی ایسی ہے کہ وہ معاشرہ کی اخلاقی صحت کے لیے ہر وقت خطرہ بنی رہتی ہے۔ میں انہیں جتنا بھی پڑھتا جاتا تھا اتنا ہی میرے اوپر یہ واضح ہوتا جاتا تھا کہ مودودی صاحب کے خیالات صحیح معلومات سے عاری ہیں، ان کے دلائل بودے ہیں انہوں نے ایک یوٹوپیا (خیالی یا مثالی دنیا) بنا رکھا ہے جو انسانوں کے لیے نہیں ہے۔

دو اور باتیں بھی ایسی تھیں جو میرے لیے کافی الجھن کا باعث تھیں۔ وہ فکری جہاد (مسلسل جدوجہد) اور علم کے ساتھ وابستگی کی باتیں تو بہت کرتے تھے لیکن میں جماعت کے جن ارکان سے بھی ملا وہ بالکل ہی جاہل تھے اور مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ دہشت زدہ

کیا وہ جماعت اسلامی میں گرو یا پیرو مرشد ماننے کی بیماری تھی۔ مودودی صاحب محض اس جماعت کے بانی اور تاحیات اس کے رہبر ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایسا ہر دم موجود اور ہر دم روشن سورج تھے جو اس کے ارکان کے ہر عمل کو روشن کرتا تھا۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ اپنے گرو کے ساتھ خورشید احمد کی تنگ نظر وفاداری اور جماعت کے بانی کے نظریات کی بلا جھجک فرماں برداری سے کہیں ان کی اپنی فکری نشو ونما تو نہیں رک گئی ہے؟ اور اس نے انہیں اپنے گرو کا بے لچک چیلا اور کاٹھ کا پتلا تو نہیں بنا دیا ہے۔

اسلامی تحریکوں کی جن دوسری تنظیموں نے ہمیں متاثر کیا تھا ان میں ایک تھی اخوان المسلمون۔ یہ ۱۹۲۸ء میں ایلمنٹری اسکول کے ایک نوجوان استاد حسن البنا نے مصر میں قائم کی تھی۔ یہ ایک یوتھ کلب تھا۔ حسن البنا کے نزدیک اسلام محض نماز روزے کا نام نہیں ہے۔ ان کے خیال میں اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، جس میں مذہب اور ریاست ایک وحدت ہیں اور قرآن اور فوجی جہاد ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ ہم طلبہ بھی اس کا ورد کرتے رہتے تھے۔ اخوان کے تمام ارکان کے لیے یہ لازمی قرار دیا گیا تھا کہ وہ فوجی تربیت کو اپنی تعلیم کا حصہ بنائیں۔ ۱۹۳۶ء میں جب اخوان المسلمون نے سیاسی جماعت کی شکل اختیار کی اس سے پہلے ہی اس کے کئی ارکان فلسطین میں یہودی آبادکاروں کے خلاف بغاوت میں حصہ لے رہے تھے۔ حسن البنا خود بھی اسلام کے بارے میں بہت ہی سہل پسندانہ اور سادہ لوحی والا نظریہ رکھتے تھے۔ اپنے پمفلٹ ''ہمارا پیغام کیا ہے'' (جو شاید ان کی واحد تحریر ہے) میں انہوں نے اسلام کے فروغ کو پانچ مرحلوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا مرحلہ وہ تھا جب مسلمان کمزور تھے اور معزز اور اشرافیہ طبقے کا ایک گروہ اس جابر آقا کی غلامی میں تھا جو اللہ کا نافرمان تھا۔ دوسرا مرحلہ رہبری اور رہنمائی کا تھا جب ایک رہبر اٹھتا ہے اور اس جابر آقا کو للکارتا ہے۔ تیسرا مرحلہ وہ تھا جب روشنی کی طاقتیں تاریکی کے خلاف صف آرا ہوتی ہیں۔ چوتھا مرحلہ صبر و استقلال کے ساتھ حق و صداقت کا پرچم بلند کرنے کا تھا۔ جب ہر قسم کی ذلت و خواری کے سامنے مسلمان حق پر ڈٹے رہے۔ پانچواں اور آخری مرحلہ کامیابی اور کامرانی کا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کے دشمنوں پر فتح دلائی۔ حسن البنا کے نزدیک یہ آخری مرحلہ شریعت کی فتح کا مرحلہ ہے۔ جس کے بارے میں ان کا عقیدہ ہے کہ وہ قطعی اور مکمل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلامی شریعت اور وہ قوانین جو فقہا نے وضع کیے ہیں ان میں بہت سی پرانی خامیاں دور کردی گئی ہیں تاکہ وہ زمانے

کی ہر ضرورت پوری کرسکیں۔ ان کے نزدیک کلچرل سرگرمیاں اپنی مختلف شکلوں میں ایک لاقانونیت اور افراتفری ہیں جس کی جڑیں ہر راستے، ہر مقام، ہر محفل اور موسم سرما اور موسم گرما کے ہر تفریحی مقام سے اکھاڑ پھینکنا چاہئیں۔

حسن البنا بابائے اخوان المسلمون تھے تو سید قطب اس کے فکری اور روحانی پیشوا تھے۔ سید قطب کی تربیت تو تعلیمی اداروں کے منتظم کی حیثیت سے ہوئی تھی لیکن انہوں نے ادبی نقاد کے طور پر زیادہ شہرت حاصل کی۔ وہ پہلے نقاد تھے جنہوں نے سب سے پہلے نجیب محفوظ کی ادبی قدر و قیمت کو پہچانا تھا۔ نجیب محفوظ کو ادب کا نوبیل انعام بعد میں ملا۔ سید قطب اور نجیب محفوظ بہت گہرے دوست بھی تھے۔ سید قطب جمال عبدالناصر کے دوست بھی تھے جو ۱۹۵۶ء میں مصر کے صدر بنے۔ کہا جاتا ہے کہ سید قطب میں تبدیلی اس وقت آئی جب وہ ۱۹۴۰ء کی دہائی میں دو سال امریکہ میں رہے۔ کولیریڈو میں انہوں نے وہ امریکہ دیکھا جو اس امریکہ سے بالکل ہی مختلف تھا جو انہوں نے امریکی ادب کے مطالعے یا وہاں کے عام کلچر سے معلوم کیا تھا۔ انہیں امریکہ بہت ہی پرانے زمانے کا اور دقیانوسی لگا۔ بعد میں انہوں نے لکھا۔ ''حیرت کی بات ہے کہ اتنی تعلیمی ترقی اور ہر کام میں درجۂ کمال حاصل کرنے کے باوجود امریکہ زندگی کے بارے میں اپنے خیالات میں انتہائی دقیانوسی نظریات رکھتا ہے۔ ان کی عادات سے ہمیں غاروں میں رہنے والے انسان یاد آجاتے ہیں۔ وہ جس انداز سے اقتدار اور طاقت کا بھوکا ہے وہ قدیم انسانوں کی خصلت تھی۔ اس کے لیے وہ اپنے تمام آئیڈیل، تمام آداب اور اصول فراموش کردیتا ہے۔ کولیریڈو میں کلیساؤں کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن سید قطب کو وہاں روحانیت کا فقدان نظر آیا۔ انہوں نے لکھا کہ وہاں عبادت گاہوں اور تفریحی مرکزوں میں فرق کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔

اس وقت تک اخوان المسلمون تشدد کی سرگرمیوں میں زیادہ سے زیادہ ملوث ہوتی جارہی تھی۔ اس کے ارکان کو مصر کے اندر دہشت گردی کا ملزم گردانا جارہا تھا۔ دسمبر ۱۹۴۸ء میں اس وقت کے وزیراعظم محمود فہمی کو اخوان کے ایک رکن نے قتل کردیا۔ اس کے جواب میں حکومت کے کارکنوں نے حسن البنا کو فروری ۱۹۴۹ء میں قتل کردیا۔ امریکہ میں اس قتل کی خبر پر جو ردعمل ہوا اس پر سید قطب دہشت زدہ رہ گئے۔ اس وقت تک انہوں نے اپنے آپ کو اخوان کے ساتھ زیادہ منسلک نہیں کیا تھا۔ لیکن امریکہ کے تجربہ نے انہیں ایک دم بدل دیا۔

سید قطب کی بہترین کتاب ''اسلام میں سماجی انصاف'' اس وقت شائع ہوئی تھی جب وہ

امریکہ میں تھے۔ اس کتاب میں انہوں نے اسلام کی جو تصویر پیش کی وہ ایک ایسی عالمی تہذیب کی ہے جس کی بنیاد رحم، محبت، ایک دوسرے کی مدد اور مسلمانوں کے درمیان بالخصوص اور عام انسانوں کے درمیان بالعموم باہمی میل جول اور تعاون پر قائم ہے۔ وہ سماجی تبدیلی پر اصرار کرتے ہیں جو ان کے خیال میں سیاسی عمل سے ہی آسکتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سماجی انصاف کو ضمیر کی آزادی اور انسانی برابری کی بنیاد پر استوار ہونا چاہیے اور یہ مقصد معاشی انصاف کے ذریعہ ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جن لوگوں کے پاس دولت اور طاقت ہے وہ اپنی ناجائز دولت اور طاقت آسانی کے ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ اس لیے جہاد کو سماجی انصاف کا وسیلہ بننا چاہیے۔ انہوں نے لکھا ''اسلام اللہ کی راہ میں جہاد کو ہر اس مسلمان کی ذمہ داری قرار دیتا ہے جو اس کے قابل ہے۔ کیونکہ اس سے معاشرہ کو انصاف ملتا ہے۔'' اللہ نے خرید لی مسلمانوں سے ان کی جان اور مال اس قیمت پر کہ ان کو بہشت ملے۔ وہ لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں اور پھر مارتے ہیں اور مرتے ہیں۔'' (قرآن، سورۃ ۹۔ آیۃ ۱۱۱۔ ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی) یہ وہی تھیسس اور فلسفہ ہے جو ماؤزے تنگ کی سرخ کتاب کی تبلیغ کرنے والے اور چے گویرا کی تصویر والی ٹی شرٹس پہننے والے پیش کررہے تھے۔ میرے زمانے میں مظاہرے کرنے والے اور دھرنا دینے والے اس سے بھی آگے جاچکے تھے اور اب وہ بادر مائن ہاف اور سمبیا نیز لبریشن آرمی کی گوریلا جنگ کی باتیں کررہے تھے۔ اس لیے سید قطب ان مسلم طلبہ کو کیسے قائل کرسکتے تھے جن کی شناسائی معاشی اور سماجی انصاف سے زیادہ قریبی اور براہ راست تھی۔

چند سال کے اندر ہی قطب نے مصر میں اسلامی تحریک کو انقلابی شکل دے دی اور اور اس کا اثر عرب دنیا سے نکل کر برصغیر پاک و ہند اور جنوب مشرقی ایشیا تک جا پہنچا۔ لیکن اس بدقسمت رات کو اخوان کی تقدیر کا فیصلہ ہوگیا جب ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو ان کے ایک رکن نے اسکندریہ میں جمال عبدالناصر کو اس وقت قتل کرنے کی کوشش کی جب وہ ایک بہت بڑے جلسے سے خطاب کررہے تھے۔ ناصر نے اس کا جواب یہ دیا کہ چھ سازشیوں کو تو موت کے گھاٹ اتار دیا اور ہزاروں کارکنوں کو گرفتار کرلیا۔ ان میں قطب بھی تھے۔ انہیں پندرہ سال قید کی سزا دی گئی۔

سید قطب کی صحت پہلے ہی اچھی نہیں تھی۔ جیل میں انہیں اور بھی اذیت دی گئی۔ تین ججوں کے سامنے مقدمے کی سماعت کے دوران میں قطب نے اپنی قمیص پھاڑ دی اور اپنے جسم پر تشدد کے نشان دکھائے۔ ان ججوں میں مستقبل کے صدر انوار السادات بھی تھے۔ انہیں ۱۹۶۴ء

میں رہا کر دیا گیا لیکن جلد ہی بغاوت کے الزام میں دوبارہ گرفتار کرلیا گیا۔ یہ مقدمہ ان کی کتاب ''سنگ میل'' کے بعض اشتعال انگیز حصوں کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا۔انہوں نے یہ کتاب جیل میں لکھی تھی اور حالانکہ وہ ۱۹۶۴ء میں قاہرہ سے شائع ہوئی لیکن اس کا مسودہ پہلے ہی لوگوں میں پہنچ چکا تھا اور لوگ اسے اسی شکل میں پڑھ رہے تھے۔ پروف کی بے شمار غلطیوں سے بھرا ہوا اس کا بہت ہی خراب انگریزی ترجمہ کویت میں شائع ہوا اور اسے FOSIS کے ارکان میں تقسیم کیا گیا۔ مجھے اس کی جو کاپی ملی اسے پڑھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ ناصر کی جیل میں ان کے تجربات نے انہیں غصیلہ اور منتقم مزاج بنا دیا تھا اور وہ صحیح صورت حال سمجھنے کے قابل نہیں رہے تھے۔انہوں نے اعلان کیا تھا کہ پوری دنیا جس میں مسلم ملک بھی شامل ہیں جہالت کا گڑھ بن چکی ہے۔ مسلم برادری کا اب کوئی وجود نہیں ہے اور وہ ظلمت، کفر اور جہالت کے اندھیرے میں غرق ہو چکی ہے۔انسانی اقدار صرف اسلامی تہذیب کے ذریعہ ہی حاصل کی جاسکتی ہیں اور اللہ کے قوانین ہی ساری دنیا میں رائج ہونا چاہئیں۔ان کی کتاب ''سنگ میل'' میں کسی بھی قسم کے اختلاف رائے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ اب جہاد کا مطلب تھا اخوان اور تمام دوسرے لوگوں کے درمیان مکمل جنگ۔قطب کو موت کی سزا سنائی گئی اور ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء کو انہیں پھانسی دے دی گئی۔ انہوں نے کہا۔ میں نے یہ شہادت پانے کے لیے پندرہ سال جہاد کیا ہے۔۱۶ اکتوبر 1981ء کو اخوان المسلمون نے بدلہ لیا اور انوار السادات کو قتل کر دیا۔

سید قطب جس آزمائش سے گزرے اور انہوں نے جو سختیاں جھیلیں اس میں ہمارے لیے بہت سے معانی پوشیدہ تھے۔ ہماری تنظیم کے بہت سے ارکان نے سید قطب کی زندگی کے واقعات کا صرف معائنہ ہی نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود بھی اس طرح کی زندگی گزاری۔ہم پابندی کے ساتھ ان کی لکھی ہوئی قرآن کی تفسیر پڑھتے تھے اور اخوان کے نعرے لگاتے تھے۔

اللہ ہماری غایت ہے
پیغمبر ہمارے رہبر ہیں
قرآن ہمارا قانون ہے
جہاد ہمارا راستہ ہے
اللہ کی راہ میں موت ہمارا منتہائے مقصود ہے۔

اب میں سوچتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ میں موت کے لیے ایسا بہت بے چین بھی نہیں تھا۔

میں تو دراصل ان لوگوں میں سے تھا جو اللہ کی راہ میں زندگی گزارنے کی تگ و دو کر رہے تھے اور اللہ کو اپنا منتہائے مقصود سمجھنے کے بجائے اپنا خالق مانتے تھے۔ قرآن کو قانون ماننا تو محض تخیل کی جولانی تھی کیونکہ قانون تو حرکی اور مسلسل تبدیل ہوتی رہنے والی چیز ہے جبکہ قرآن اپنے آپ کو دائمی ہدایت کی کتاب کہتا ہے۔ اسے صرف مقررہ اور مستقل بالذات قوانین تک محدود نہیں کیا جاسکتا اور پھر مجھے یقین تھا کہ جنگ جو یانہ جہاد کے علاوہ بھی موجودہ مسائل کا حل تلاش کیا جاسکتا ہے۔ حضرت محمد ﷺ نے اپنی حیات کے 23 سال اللہ کے پیغمبر کی حیثیت سے گزارے۔ اس عرصے میں چند مہینے ہی انہوں نے مسلح جہاد کیا باقی زندگی تو ایک اور قسم کے جہاد میں گزاری۔ وہ جہاد تھا اپنے زمانے اور اپنے مقام کے حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ایک منصفانہ معاشرہ کا قیام۔ جہاد کے لغوی معنی بھی سخت کوشش اور جدوجہد کے ہیں۔ میری نظر میں ہمارے زمانے کے مسائل حل کرنے کے لیے بھی ایسی ہی انتھک کوشش کی ضرورت ہے۔ اس بارے میں میں نے غور کیا تو ان کے بلا سوچے سمجھے نعرے مجھے آمریت اور مطلق العنانی کی طرف ہی لے جانے والے نظر آئے۔

اخوان کے جتنے ارکان سے بھی میری ملاقات ہوئی وہ سب مجھے مذہبی جنونی معلوم ہوئے۔ سوائے سعید رمضان کے، جو مجھے اچھے لگے۔ لیکن ان کی آنکھوں میں کوئی ایسی چیز تھی جو ٹھیک نہیں تھی۔ یہی وہ چیز تھی جو سید قطب کے چھوٹے بھائی محمد قطب کی آنکھوں میں بھی تھی۔ ان کی کتاب Islam the Misunderstood Religion طلبہ میں بہت مقبول تھی۔ وہ کیا چیز تھی؟ اس کا علم مجھے اس دن ہوا جس دن میں FOSIS کے صدر دفتر گیا۔

انہی دنوں سعید رمضان کا ایک مضمون The Muslim میں چھپا تھا۔ اس کا عنوان تھا A Lesson from the Battlefield۔ اس مضمون میں رمضان نے اپنے ایک دوست اور ایک اسرائیلی فوجی افسر کا مکالمہ نقل کیا تھا۔ وہ دوست ۱۹۴۸ء کی عرب اسرائیل جنگ میں گرفتار ہوگیا تھا۔ رہائی سے پہلے وہ اسرائیلی افسر سے ملا۔ ان کے درمیان یہ مکالمہ ہوا۔

''آپ میرے ایک سوال کا جواب دیں گے؟'' دوست نے اسرائیلی افسر سے پوچھا۔

''ایک فوجی ہونے کے باوجود مجھے اس کا جواب نہیں مل رہا ہے۔''

''جی، پوچھیے'' اسرائیلی افسر نے کہا۔ ''شاید میں آپ کے سوال کا جواب دے سکوں۔''

''آپ نے سور باہر پر حملہ کیوں نہیں کیا؟'' سور باہر یروشلم کے نزدیک ایک گاؤں تھا

جو یہودیوں کی دو بہت ہی مضبوط بستیوں تیل بیوت اور رامت راحل کے درمیان گھرا ہوا تھا۔

''بہت اچھا سوال کیا آپ نے۔'' اسرائیلی افسر بولا۔ ''آپ اس کا صحیح جواب چاہتے ہیں؟''

دوست نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ہم نے سور باہر پر حملہ اس لیے نہیں کیا کہ وہاں اخوان المسلمون کے ارکان کی بڑی تعداد موجود تھی۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا تھا؟ آپ نے تو اس سے بھی زیادہ مضبوط اور محفوظ علاقوں پر حملہ کیا ہے۔''

''اصل بات یہ ہے کہ اخوان کے رضاکار آپ کے باقاعدہ فوجیوں سے مختلف ہیں۔ ان کے لیے جنگ کوئی فرض، کوئی ڈیوٹی نہیں ہے کہ انہیں جو حکم ملے وہ اس کے مطابق دشمن سے لڑیں۔ ان کے لیے جنگ ایک عشق ہے جس کے لیے وہ وہ اپنی زندگی قربان کرنے کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ ان میں اور ہمارے فوجیوں میں فرق یہ ہے کہ ہمارے فوجی اسرائیلی مملکت قائم کرنے کے لیے لڑ رہے ہیں جبکہ ان کے رضاکار اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے لڑ رہے ہیں۔ ایسے لوگوں سے لڑنا جو صرف موت سے ہی نہیں ڈرتے بلکہ پاگل پن کی حد تک موت کو گلے لگانے کے لیے بے قرار رہتے ہیں، ایسا ہی ہے جیسے خوں خوار درندوں کے کچھار میں چلا جانا۔ یہ لوگ تو پوری نوع انسانی کو ہی للکار رہے ہیں۔ ہم ایسا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔''

''آپ کے خیال میں وہ کیا چیز ہے جس نے ان لوگوں کو موت کی خواہش پر آمادہ کیا ہے اور انہیں ایسی وحشی قوت بنا دیا ہے جو عقل و شعور سے بھی عاری ہے؟''

''سادہ لوح انسانوں کے دماغ پر مذہب کا طلسماتی اثر۔'' اسرائیلی افسر نے جواب دیا۔ ''یہ بے چارے قسمت کے مارے اس خوش فہمی کا شکار ہیں کہ انہیں مرنے کے بعد جنت میں دودھ، شہد، شراب اور خوبصورت حوریں ملیں گی۔ یہ لوگ ہمارے لیے ہی نہیں خود آپ کے لیے بھی خطرہ ہیں بلکہ آپ کے لیے زیادہ خطرہ ہیں۔''

رمضان کے دوست نے بتایا کہ اسرائیلی افسر کی باتیں سن کر میرا سینہ فخر سے پھول گیا۔ ایسا لگا جیسے مجھے نئی زندگی مل گئی ہے۔ اس وقت مجھے اس کارگر ہتھیار کی طاقت کا اندازہ ہوا جو ایمان اور شہادت کے تصور میں موجود ہے۔ اس واقعہ نے رمضان کے دوست کو اور بھی زیادہ پرہیز گار مسلمان بنا دیا۔ (یعنی وہ اخوان المسلمون کا رکن بن گیا۔) میں اخوان کے ارکان کی

بہادری کا تو قائل تھا مگر مجھے اسرائیلی افسر کی بات زیادہ معقول معلوم ہوئی۔ ''صرف جان دینے کے لیے موت کی آرزو اور وہ بھی جنگی حکمت عملی کی پروا کیے بغیر۔ کیا یہ بے وقوفی نہیں ہے؟'' یہ سوال میں نے سعید رمضان سے کیا جو لندن آئے ہوئے تھے۔

''نہیں نہیں۔'' انہوں نے کہا۔ ''یہ تو اس بات کی علامت ہے کہ اس کا عقیدہ اس کا ایمان ہی اس کی زندگی کا مرکز و محور ہے۔''

لیکن یہ تو اندھی عقیدت ہے، کسی بھی عقلی جواز کے بغیر۔ اسرائیلی افسر صحیح کہتا ہے کہ جو شخص اس طرح پاگل پن کا شکار ہو جائے وہ ایک دن اپنے بھائیوں پر بھی حملہ کر سکتا ہے کہ ان کا ایمان وہ نہیں ہے جو اس کا ہے۔ ان کا ایمان اس کے اپنے ایمان سے کم زور ہے۔'' رمضان نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

''اگر عقیدہ ہتھیار بن جائے تو وہ کون سی چیز ہے جو اس ہتھیار کو غلط استعمال کرنے سے روک سکتی ہے؟'' میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اور اگر عقیدہ ہتھیار بن جائے تو کیا پھر وہ عقیدہ رہ جائے گا۔''

''یہ ایمان کی طاقت کا سوال ہے۔'' رمضان نے جواب دیا۔ ''ہمارے بھائیوں کی آنکھیں اسی عقیدے کی روشنی سے چمکتی ہیں۔''

ان کے ان الفاظ نے مجھ پر وہ اسرار کھول دیا جو مجھے پریشان کرتا تھا۔ یہی چمک تھی جو رمضان کی آنکھوں میں تھی اور یہی چمک اخوان کے دوسرے ارکان کی آنکھوں میں دکھائی دیتی تھی۔ عقیدے کی پختگی کی چمک۔ سوائے اس کے کہ کوئی عقیدہ بھی ہمیشہ پختہ نہیں رہتا، ہر عقیدے کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے کہ تشکیک اس کے اردگرد منڈلاتی رہتی ہے۔ خیر، اپنا عقیدہ بھی ایسا ہی تھا جو یویو کی گیند کی طرح اوپر نیچے ہوتا رہتا تھا۔ ایک نامکمل انسان کی طرح میں نے سوچا کہ میں ایسا غیر کامل مگر نامیاتی عقیدہ اپناؤں گا جو مجھے ہر دم شک کے کنارے پر رکھے گا۔ صرف کامل انسان ہی کامل ایمان رکھ سکتے ہیں اور اخوان کے ارکان کے ساتھ میرا یہی جھگڑا تھا۔ وہ اپنے آپ کو کامل انسان سمجھتے تھے اور اپنے عقیدے پر ان کا ایمان کامل تھا۔ مختصر یہ کہ وہ نظریہ کے ماننے والے تھے۔ ان کے نزدیک اسلام ایک نظریہ تھا۔ ایسا نظریہ جس میں نامکمل ہونے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس سے ذرا سا بھی ادھر ادھر نہیں ہوا جا سکتا۔ گویا اس میں کہیں بھی انسانیت نہیں ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں ان میں سے اکثر کو ناپسند کرتا تھا۔

اخوان المسلمون اور جماعت اسلامی کے رہنماؤں اور ان کے پیرو کاروں کی تحریروں نے ہی میری نسل کے نوجوانوں میں جوش وخروش پیدا کیا تھااور ہمیں عمل پر اکسایا تھا۔ میرے لیے یہی سچے مسلمان تھے۔ ایک ایسا محور جس پر میری پیچیدہ شخصیت کا وجود قائم تھا۔ میرے سامنے سوال یہ تھا کہ مجھے کیسا مسلمان بننا چاہیے اور میری نسل جو ایک بہتر دنیا پیدا کرنا چاہتی ہے اس میں ایک مسلمان کی حیثیت سے میں کیسے اپنی جگہ بنا پاؤں گا۔

تبلیغی جماعت کے ساتھ اپنے تجربات اور جنت کے بارے میں اپنے نئے خیالات کے بعد مجھے اسی جانب رخ کرنا تھا جس جانب تمام مسلمان اپنا رخ کرتے ہیں۔ یعنی قرآن کی جانب۔ کیا میں یہاں کوئی جواب حاصل کرسکوں گا؟

باب ۔ ۳

اونچا پھل دار پیڑ

دوسرے مسلمان بچوں کی طرح میں نے بھی بچپن میں اپنی ماں سے قرآن پڑھا تھا۔ اس طرح قرآن پڑھنے سے اللہ کا کلام بچوں کے بڑھتے ہوئے شعور کا حصہ بن جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اس کا آغاز پاکستان سے ہوا جہاں کی فضائیں دن رات اذانوں کی صداؤں سے گونجتی رہتی ہیں۔ یہ اذانیں ہی صبح کی روشنی سے رات کے اندھیرے تک تمام اوقات کی نشان دہی کرتی ہیں۔ عبادت بذات خود اللہ کے کلام کی قرأت ہے۔ ہر نماز میں قرآن کی آیات ہی پڑھی جاتی ہیں۔ کسی نماز میں بآواز بلند تو کسی نماز میں خاموشی کے ساتھ۔ اس ماحول میں مائیں اپنے بچوں کو اس وقت سے ہی قرآن کی چھوٹی چھوٹی آیات یاد کرانا شروع کردیتی ہیں جب ابھی بچہ باقاعدہ قرآن پڑھنا بھی شروع نہیں کرتا۔

میرے لیے قرآن پڑھنے کا یہ سلسلہ پاکستان سے لندن کے علاقہ ہیکنی تک جاری رہا، جہاں کی روشنی، تاریکی، آوازیں اور سورج کا طلوع و غروب سب مختلف تھے۔ میں نو برس کا تھا جب میرا پاکستان والا اسلامی ماحول مجھ سے جدا ہوگیا۔ اب صرف گھر کی چہار دیواری ہی خدا کے کلام کی تعلیم کے لیے باقی رہ گئی تھی۔ ہماری زندگی میں تو تبدیلی آچکی تھی مگر میرے والدین کے دلوں میں مجھے اسلامی تعلیم دلانے کی خواہش زندہ تھی۔ برطانیہ میں ہمارا گھر ہل سی اسٹریٹ کے انتہائی تنگ علاقے میں گراؤنڈ فلور والا ایک فلیٹ تھا۔ شام کو جب میں اسکول کا ہوم ورک کرلیتا تو میری ماں مجھے قرآن پڑھانے بیٹھ جاتیں۔ وہ میرا تلفظ ٹھیک کراتیں اور کبھی کبھی کسی

لفظ یا کسی آیت کا مطلب بھی بتاتیں۔ جب تک میں چودہ برس کا ہوا اس وقت تک میں ناظرہ قرآن ختم کر چکا تھا۔ قرآن ختم ہوا تو آمین کی تقریب ہوئی۔ سب نے خوشیاں منائیں۔ اس کے بعد میں خود ہی کبھی کبھی قرآن کی تلاوت کرتا رہتا تھا۔ یا جب کبھی کوئی ضرورت پیش آتی تو میں قرآن سے رجوع کرتا۔ ہر مسلمان کی طرح میرے لیے بھی قرآن محض ایک کتاب نہیں ہے۔ یہ اللہ کا کلام ہے اور اللہ کے ساتھ براہِ راست تعلق قائم کرنے کا ذریعہ۔ قرآن اسلام کا مبدا اور منبع ہے جس سے مسلمان رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور جس میں ہر مسلمان اپنے مسائل کا حل تلاش کرتا ہے۔

مجھے یاد ہے میری ماں علامہ اقبال کا یہ قول دہرایا کرتی تھیں کہ قرآن کی تلاوت ایسے کرو جیسے وہ تم پر نازل ہو رہا ہے۔ چنانچہ جنت کی تلاش میں مجھے جب سوالات کا سامنا کرنا پڑا اور جو مشکلات پیش آئیں تو ان کے حل کے لیے میں نے قرآن سے ہی رجوع کیا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر جنت کے بارے میں میرے مذہب کا منبع اور ماخذ کیا کہتا ہے۔

یہ انتہائی نازک مرحلہ تھا۔ میں نے قرآن پڑھ کر ابتدائی مرحلہ مکمل کر لیا تھا۔ لیکن دنیا بھر کے اکثر مسلمانوں کی طرح میں بھی عرب کا رہنے والا یا عربی بولنے والا نہیں تھا۔ میری مادری زبان اردو تھی جو فارسی، ترکی، سنسکرت اور ہندی کے عربی الفاظ کے میل جول سے بنی ہے۔ انگلستان میں رہنے کے لیے میرے والد کی کوشش یہ تھی کہ میں انگریزی زبان میں پوری مہارت حاصل کر لوں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے انگریزی کے کلاسیکی ناولوں کی ایک کھیپ کی کھیپ میرے لیے خرید لی تھی۔ یہ ناول کتابوں کے اس سلسلے کی کڑی تھے جس کا نام نہایت بے شرمی کے ساتھ The Great Books of Mankind رکھا گیا تھا۔ انگریزی زبان پر تو مجھے خاصہ عبور حاصل ہو گیا تھا لیکن اب اپنے سوالوں کے جواب حاصل کرنے کے لیے قرآن سمجھنے کا مسئلہ پیش آیا تو مجھے دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ کوئی بہت بڑی رکاوٹ بھی نہیں تھی۔ بلکہ سالہا سال کے تجربے نے مجھے سکھایا تھا کہ ایک طرح سے یہ میرے لیے فائدہ مند ہی تھا۔ ترجمہ کے ذریعہ قرآن پڑھنے اور سمجھنے میں زیادہ ہی محنت درکار ہوتی ہے۔ یہاں ایک مجہول عمل نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے دماغ پر کچھ زیادہ ہی زور ڈالنا پڑتا ہے۔ گویا اصل معانی حاصل کرنے کے لیے پورا دماغ حرکت میں آجاتا ہے۔

میں قرآن کا انگریزی ترجمہ پڑھتا رہتا تھا۔ یہ ترجمہ مارمدوک پکتھال کا تھا۔ یہ صاحب

ان سنکی انگریزوں میں سے تھے جو برطانوی راج کے دور میں کچھ زیادہ ہی پیدا ہوتے رہتے تھے۔ وہ ناول نگار تھے جو مسلمان ہو گئے تھے اور مناظروں میں حصہ لینے لگے تھے۔ ان کا ترجمہ قرآن کا پہلا انگریزی ترجمہ تھا جو کسی انگریز نے کیا تھا۔ جنت کے بارے میں قرآن کی آیات پڑھنے کے لیے میں نے پکھتال کا ترجمہ دیکھا۔ جنت کے لیے عربی کا اصل لفظ فردوس ہے اور یہ قرآن میں صرف دو جگہ آیا ہے۔ لیکن انگریزی ترجمہ میں اس کی جگہ Paradise کا لفظ بار بار آیا ہے۔ قرآن میں ایک جگہ فردوس کا لفظ باغوں کے جھرمٹ کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔
''جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک کام کیے ہیں ان کے لیے ٹھنڈی چھاؤں کے باغات (جنت الفردوس) ہیں۔ (سورۃ ۱۸ آیت ۱۰۸) اور ایک جگہ تنہا فردوس کا لفظ آیا ہے۔
اس موضوع پر قرآن صرف اتنا ہی نہیں کہتا بلکہ، جیسے میں ہمیشہ سمجھتا رہا ہوں، قرآن کے متن میں جنت کا تصور کئی حوالوں سے کئی دوسری چیزوں کے ساتھ آیا ہے۔ اس میں بہت معانی پوشیدہ ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ تبلیغی جماعت میں دوسری تمام چیزوں سے الگ کر کے ایک ہی جنت میں گھر حاصل کرنے کا جو مراق تھا مجھے اس نے پریشان کر دیا تھا۔ قرآن نے جنت کے لیے کئی جگہ باغ کا استعارہ بھی استعمال کیا ہے۔ سورۃ رعد کی آیت ۳۵ کا ترجمہ پکھتال نے یہ کیا ہے۔ ''باغ کی ایک مشابہت جس کا وعدہ ان لوگوں سے کیا گیا ہے جو اللہ کے (عائد کیے ہوئے) فرائض ادا کرتے ہیں۔ اس کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ اس کی غذا دائمی ہے اور اس کا سایہ۔ یہ ان لوگوں کا انعام ہے جو اپنے فرائض ادا کرتے ہیں۔'' میں نے اپنی والدہ سے پوچھا، وہ اس آیت کا کیا مطلب سمجھتی ہیں۔
''جنت کا یہ بیان کہ وہ ایسا باغ ہے جس میں نہریں بہتی ہیں دراصل ایک تمثیل ہے۔'' انہوں نے کہا ''لیکن ایک ایسے ٹھکانے کے لیے جنت یا باغ کے لفظ کا استعمال جہاں روحانی اور جسمانی سکون میسر ہو نہایت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ ایسی اہمیت جس کی گہرائی تک ہم اپنی اس زندگی میں نہیں پہنچ سکتے۔ ہمارا دماغ اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ اس دنیا کی چیز ہی نہیں ہے۔'' میری والدہ لفظوں اور ان کے معانی کے ساتھ کھیلنے سے بہت لطف لیتی تھیں۔ انہوں نے توقف کے بعد کہا، ''قرآن نے ایک جگہ کہا ہے۔ کوئی روح نہیں جانتی کہ اس کی آنکھوں کے لیے کیسی روشنی چھپی ہوئی ہے: ایک انعام اس عمل کا ہے جو اس نے کیا۔'' پیغمبر نے اس آیت کی تشریح اس طرح کی ہے کہ ''اللہ کہتا ہے کہ میں نے اپنے متقی بندوں کے لیے وہ اشیا

تیار کی ہیں جنہیں کسی آنکھ نے دیکھا ہے اور نہ کسی کان نے سنا ہے اور انسانی دماغ جن کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔''

''مگر اس سے میرے سوال کا جواب تو نہیں ملا۔'' میں نے بے صبری سے کہا۔ ''جنت میں ملنے والی نعمتیں اگر اسی دنیا میں تلاش کرلی جائیں تو کیا ہرج ہے۔''

''تو پھر اس تمثیل میں موجود تشبیہ پر غور کرو۔''

''جیسے؟''

''جیسے لفظ ظل'' میں اس لفظ کا ترجمہ سوچنے کی کوشش کررہا تھا تو وہ اصل عربی لفظ کی خاصیت پر غور کررہی تھیں۔

''ظل کے معنی ہیں سایہ۔''

''ہاں، ظل کے معنی سایہ ہی ہیں۔'' وہ بولیں ''اور قرآن کہتا ہے کہ ظل جنت کی نعمتوں میں سے ایک ہے۔'' وہ ٹھہریں اور مناسب حوالہ یاد کرنے لگیں۔ ''وہ لوگ جو اپنے فرائض ادا کرتے رہے ہیں وہ سایہ اور فواروں کے درمیان ہیں۔ لیکن ہمیں تو یہ بتایا گیا ہے کہ جنت میں سورج ہی نہیں ہوگا تو پھر سایہ کہاں سے آئے گا۔ قرآن میں ہے کہ وہ جنت میں دھوپ دیکھیں گے نہ شدید سردی۔ اب سائے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

انگریزی ادب کے جغادری نقاد ایف آر لیوس کی طرح میری ماں بھی مجھے الجھن میں ڈال رہی تھیں۔ میں نے سوچا وہ مجھے پھر پریشان کرنے میں کامیاب ہوگئی ہیں۔ انہوں نے میرا چہرہ پڑھ لیا۔

''میں نے کتنی بار سمجھایا ہے کہ قرآن باہم مربوط اور مکمل متن ہے۔'' میری والدہ مابعد جدیدیت نقاد بنتی جارہی تھیں۔ ''تم اسے الگ الگ کرکے نہ پڑھو کہ ایک آیت ادھر سے پڑھ لی تو دوسری آیت ادھر سے پڑھ لی۔ تم اسے ایک مجموعہ سمجھ کے پڑھو۔''

''جی۔'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''اب ذرا غور کرو۔ قرآن میں جس جنت کا حوالہ ہے وہ تحفظ فراہم کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ یہاں سایہ کا جو تصور ہے وہ حفاظت دینے والا مقام ہے۔ قرآن میں جنت کے جس باغ کا ذکر ہے اس میں کہا گیا ہے کہ وہاں کبھی نہ ختم ہونے والی کھانے پینے کی چیزیں بھی ہوں گی۔ بھلا جنت میں ہمیں کھانے پینے کی کیا ضرورت ہوگی۔ یہاں کھانے پینے کی جن چیزوں کا

ذکر ملتا ہے در اصل وہ ہماری داخلی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہیں۔ عبادت کو بھی روحانی غذا ہی کہا جاتا ہے۔"

ہماری بات چیت غلط راستے پر جا رہی تھی۔ میری ماں کی عادت تھی کہ ایک طرف تو وہ مابعد جدیدیت کا سہارا لیتی تھیں تو دوسری طرف اپنے دلائل کو سادہ اور غیر متنازعہ بنانے کے لیے وہ سقراط بن جاتی تھیں۔ میں پابندی سے نماز نہیں پڑھتا تھا۔ ان کے لیے یہی وقت تھا کہ وہ اپنی پسندیدہ چال چلیں اور اس بات چیت کو زیادہ تسلی بخش راستے پر ڈال دیں۔

"لیکن انسان صرف عبادت کے سہارے تو زندہ نہیں رہ سکتا۔" میں نے کہا۔"میرا مطلب ہے کہ اگر آپ ہر روز دال کھائیں گے تو آخر ایک دن اس سے اکتا جائیں گے۔ بہر حال مجھے یہ بتایئے کہ کیا علم حاصل کرنا بھی عبادت کی ہی ایک شکل نہیں ہے۔ علم کی جستجو میں وقت گزارنا عبادت میں وقت گزارنے سے بہتر ہے۔ کیا ہم علم کی جستجو میں زندگی نہیں کاٹ سکتے؟"

"بالکل کاٹ سکتے ہیں۔" انہوں نے فوراً جواب دیا"جنت کا میوہ وہ نہیں ہے جسے آپ کسی دکان سے خرید لیں بلکہ وہ ہمارے اعمال کا پھل ہوگا۔ اچھے اور برے اعمال میں تمیز کرنے کے لیے علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جنت کے باغ سے ہمیں جو پھل ملے گا وہ علم ہوگا۔" ممی اب کچھ زیادہ ہی جوش میں آ گئی تھیں۔"اور اس تشریح کو مزید تقویت ملتی ہے فوارہ کے استعارہ سے۔ جنت کے باغ میں فوارے ہی فوارے ہوں گے یعنی علم کے خزانے ہی خزانے۔ تو یہ طے ہو گیا" انہوں نے گہری سانس لی۔"کہ اگر تم اس بدبخت زمین کو جنت بنانا چاہتے ہو تو تمہیں سائے کی ضرورت ہوگی۔ اس چیز کی جو تمہاری حفاظت کرے، تمہیں پناہ دے اور علم کی غذا کی جو نیک اعمال کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ ہمارے اعمال ہی وہ بیج ہیں جو آئندہ زندگی میں سایہ دار درخت بن جائیں گے۔"

اس بات چیت کے دوران میرے والد خاموش بیٹھے رہے۔ ان کی خاصیت یہ ہے کہ وہ خاموش بیٹھے غصے میں کھولتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ اس کا جسمانی اظہار بھی کر دیتے ہیں۔ ان کے سارے جسم سے ایسا دھواں اٹھتا ہے کہ ان کی پسندیدہ کرسی کو بھی دھواں دھواں کر دیتا ہے۔ اس وقت تو یہ محض اتفاق ہی تھا کہ وہ دھواں ان کے پائپ سے اٹھ رہا تھا جسے سلگانا وہ کبھی نہیں سیکھ سکے اور شکر ہے کہ دل کے پہلے دورے کے ساتھ ہی انہوں نے اسے پینا بند کر دیا۔ وہ بہت دیر خاموش رہ سکتے تھے۔ لیکن ان کی اس خاموشی سے یہ اندازہ لگانا غلط تھا کہ ان کے اندر

کی آگ بجھ گئی ہے۔ وہ ہمیشہ چاق چوبند رہے۔ جب تک والدہ کی گفتگو جاری رہی وہ خاموش آتش فشاں بنے بیٹھے رہے اور میں بھی انتظار کرتا رہا کہ کب وہ پھٹتے ہیں۔

''سائے کا استعارہ سمجھنے کے لیے کسی مرشد یا استاد کی ضرورت ہوگی۔'' اب وہ بولے۔ ''تمہیں اس وقت دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک استاد کی جو اونچا پھل دار درخت ہو۔ جس کے سائے تلے بیٹھ کر تم علم حاصل کرسکو۔ تم قانون یا طب کا پیشہ اختیار کرتے ہو تو پہلے اس درس گاہ میں جاتے ہو جہاں یہ علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ جنت کی تلاش میں تمہیں کسی ایسے آدمی کے پاس جانا پڑے گا جو سیدھا اور صحیح راستہ دکھانے کی اہلیت رکھتا ہو۔''

میں جانتا تھا کہ وہ یہی کہیں گے۔ ان کی جسمانی اور روحانی زندگی ایک کے بعد ایک سفر اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی میں گزری تھی۔ جب وہ تیس اور چالیس سال کی عمر کے درمیان تھے تو انہوں نے ایک پیر کے ہاتھ پر بیعت کرلی تھی اور اپنی عمر کے بیشتر حصے میں ان پیر کے مرید رہے۔ پیر صاحب کی تصویر ان کی کمرے کی دیوار پر ہمیشہ ٹنگی رہتی تھی۔ اکثر تنہائی میں وہ اپنے پیر کا شجرہ پڑھا کرتے تھے۔ اس شجرہ میں پیر صاحب کا سلسلہ آنحضرتؐ تک چلا جاتا تھا۔ وہ اپنے پیر سے شروع کرتے ''اسلام کے حسن کا کامل ثبوت، استاد کامل'' اور پھر پیچھے کی طرف یہ سلسلہ صوفیوں اور ولی اللہ تک ہوتا آنحضرتؐ اور جبریلؑ تک چلا جاتا۔ جنہیں معتمد فرشتہ کہا جاتا۔ لیکن اس وقت ان کی یہ بات بالکل ہی غیر متوقع تھی۔ میرے والدین کے درمیان نظریات اور خیالات کا جو فرق تھا اس کی وجہ سے میں نے اتفاق سے ہی ان دونوں کو کسی بات پر اتفاق کرتے دیکھا ہو۔ میری ماں کی گفتگو میں لفظوں کی بازی گری ہوتی تھی اور وہ ادبی موشگافیوں میں مزہ لیتی تھیں لیکن میرے والد خطابت کے شوقین تھے۔ والد صاحب کہانیاں سناتے تھے جو زیادہ تر ولیوں اور صوفیوں کی ہوتی تھیں۔

''لیکن ایک اچھا استاد بھی کافی نہیں ہوتا۔ اس کے لیے تمہیں خود بھی سیکھنے کا سلیقہ آنا چاہیے۔ اس سے مجھے امام غزالی کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ وہ تعلیم حاصل کرنے گورگان کے ایک مدرسے میں گئے۔ وہاں انہوں نے چار سال میں الٰہیات، فلسفہ، ریاضی اور وہ تمام علوم حاصل کیے جو وہ حاصل کرسکتے تھے۔ گورگان سے واپسی میں وہ ایک قافلے میں شامل ہوگئے، جیسے ان دنوں اِکا دُکا مسافر کرتے تھے۔ راستے میں بدوؤں نے وہ قافلہ لوٹ لیا۔ امام غزالی نے تمام علوم کے بارے میں اپنی ساری تحریری یادداشت چمڑے کے ایک تھیلے میں رکھی ہوئی تھی اور یہی ان

کا کل اثاثہ تھا۔ ڈاکوؤں نے وہ بھی لوٹ لیا۔ غزالی ڈاکوؤں کے سردار کے پاس گئے اور اس کی رکاب پکڑ کر کہا۔ میرا تھیلا واپس کر دو۔ وہ تمہارے کسی کام کا نہیں ہے کیونکہ تم تو پڑھ ہی نہیں سکتے اور میں نے جو کچھ بھی پڑھا ہے وہ سب اسی میں ہے۔ سردار نے وہ تھیلا ان کی طرف پھینکا اور کہا۔ تم گورگان علم حاصل کرنے گئے تھے یا اپنے سبق لکھنے؟ یہ بات امام غزالی کے دل کو لگ گئی اور وہ واپس گورگان چلے گئے اور وہاں مزید چار سال تعلیم حاصل کی۔ اب لکھنا کم تھا اور اپنے اندر جذب کرنا زیادہ۔ چنانچہ وہ مسلمانوں کے ایک عظیم فلسفی بن گئے۔

''یہ تو میں سمجھ گیا مگر دوسری کیا چیز ہے جو مجھے حاصل کرنا چاہیے؟'' میں نے کہا۔

''ایک آدمی مسجد الحرام گیا اور کعبے کا طواف شروع کیا۔ وہ بار بار کہتا تھا۔ یا اللہ مجھے اچھے دوست عطا کر، یا اللہ مجھے اچھے دوست عطا کر۔ ایک آدمی نے یہ سنا تو اسے روک لیا۔'' یہ اللہ کا گھر ہے۔ یہاں تمہیں اپنے گناہوں کی معافی مانگنا چاہیے اور اللہ سے جنت کی دعا کرنا چاہیے اور تم ہو کہ اچھے دوست مانگ رہے ہو۔'' وہ شخص بولا۔ ''تمہیں گناہوں کی معافی چاہیے اس لیے تم وہ مانگ رہے ہو۔ مجھے اچھے دوست چاہئیں اس لیے میں وہ مانگ رہا ہوں۔ صرف اچھے دوست ہی ہمیں برے کاموں سے دور رکھ سکتے ہیں۔ میرے لیے جنت میں جانے کا یہی راستہ ہے۔'' یہ کہہ کر میرے والد یہ دیکھنے کے لیے ٹھہرے کہ میں اس حکایت کا مفہوم سمجھ گیا ہوں۔ پھر بولے ''اپنے لیے کچھ اچھے دوست تلاش کرو جو تمہیں برے کاموں سے بچا سکیں۔''

اس وقت تک میں یہ جان چکا تھا کہ جماعت اسلامی یا اخوان المسلمون میں سے کوئی بھی مجھے ''سایہ'' اور ''غذا'' فراہم نہیں کر سکتیں۔ جس کی مجھے تلاش ہے۔ ان کی بنی بنائی ''نادانش'' نے مجھے کوئی سہارا نہیں دیا۔ میں نے خوب پڑھنا شروع کیا اور FOSIS کے دوستوں نے جن کتابوں کا مشورہ دیا وہ کتابیں اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی ملا وہ پڑھا۔ لیکن میری اس پڑھائی کا کوئی صحیح رخ نہیں تھا۔ جنت پانے کے لیے جس قسم کے علم کی مجھے جستجو تھی وہ نہیں مل رہا تھا۔ تب میری ملاقات جعفر شیخ ادریس سے ہوئی۔

جعفر الٰہیات کا طالب علم تھا اور کیمبرج میں فلسفے میں ڈاکٹریٹ کر رہا تھا۔ اس کے دونوں گالوں پر زخم کے سیدھے نشان تھے جنہیں وہ خوبصورتی کے نشان کہتا تھا۔ یہ اس کے قبیلے نے لگائے تھے۔ اگرچہ یہ نشان رعب داب پیدا کرنے کے لیے لگائے گئے تھے لیکن جعفر میں وہ انکسار اور گرم جوشی کا احساس پیدا کرتے تھے۔ وہ بڑی فراخ دلی کے ساتھ ہنستا رہتا تھا اور اس

کی آنکھوں سے پتھر کی سختی کے بجائے ایک شرارت بھرا تجسس ٹپکتا رہتا تھا۔ اس تجسس میں حسِ ظرافت اور معصومیت دونوں ملی ہوئی تھیں جس سے اس کی تیز ذہانت اور چاق چوبند شخصیت کا پتہ چلتا تھا۔ وہ جب ڈھیلی ڈھالی سوڈانی عبا اور سفید عمامہ پہنتا تو بالکل فرشتہ نظر آتا۔ مجھے وہ رسول کریمؐ کی مشہور حدیث والا وہ انسان معلوم ہوتا تھا جو سر سے پاؤں تک سفید لبادہ میں ڈھکا ہوا تھا اور جس نے سوال کیا تھا۔ اسلام کیا ہے؟ اپنی پہلی ملاقات کے بعد میں نے جعفر سے پوچھا تھا۔ کیا آپ مجھے سایہ مہیا کرسکتے ہیں؟

''تم کیا سمجھتے ہو'' اس نے جواب دیا تھا ''میں پیڑ ہوں؟''

''جی ہاں'' میں نے جواب دیا تھا۔ ''آپ ایک اونچا پھل دار پیڑ ہیں جس کے سائے میں میں قدیم علوم کی تحصیل کرسکتا ہوں۔''

''استاد شاگرد کی تلاش میں رہتا ہے۔'' انہوں نے کہا ''اور اگر شاگرد یہ سمجھتا ہے کہ استاد پیڑ ہے تو پھر استاد کو سایہ مہیا کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔''

اس طرح اسلامی علوم کی میری تعلیم شروع ہوئی۔ اسلامی فقہ اور فلسفہ کی تعلیم۔ چاروں طرف ایسی تنظیمیں اور تحریکیں کام کررہی تھیں جو اسلام کی مبادیات کو اپنے انداز میں پیش کررہی تھیں اور اپنے مقاصد کے لیے وہ دعویٰ کررہی تھیں کہ ان کا بتایا ہوا اسلام ہی صحیح ہے۔ میرے لیے ضروری تھا کہ میں ہر روایت کا تفصیل کے ساتھ مطالعہ کروں اس کے اپنے بیان کی روشنی میں۔

میں نے ایک گروپ بنایا جس کا نام تھا اسرہ۔ اسرہ کا مطلب ہے خاندان۔ یہ خاندان کی اخلاقی اور سماجی یک جہتی ظاہر کرنے والا ایک اسٹڈی گروپ تھا۔ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کی دہائی میں مختلف اسلامی تنظیموں اور تحریکوں میں ایسے گروپ بہت مقبول تھے۔ اخوان المسلمون خاص طور سے اپنے ارکان کو ایسے گروپ بنانے کی تلقین کرتی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اصل اہمیت فیشن کی نہیں استاد کی ہے۔ کئی دوست میرے ساتھ آملے اور ہم نے ہر ہفتے باری باری ایک دوست کے گھر میں ملاقاتیں شروع کردیں۔ جعفر ہمارا نقیب، ہمارا استاد اور ہمارا پیڑ بن گیا جس کی نگرانی میں ہم نے قدیم علوم پڑھنا شروع کیے۔ جعفر نے مشورہ دیا کہ ہمیں رسول اللہؐ کی ہدایت پر عمل کرنا چاہیے اور ہم میں سے علم کے لحاظ سے جو کمزور ہیں ان کے ساتھ قدم ملا کر چلنا چاہیے تاکہ ہم میں سے جو پڑھائی میں بہت ہی کمزور ہیں وہ پیچھے نہ رہ جائیں۔ اتفاق سے اکثر و بیشتر وہ کمزور شخص میں ہی نکلتا تھا۔

ہم نے ضروری اسباق سے شروع کیا اور یہ اسباق تھے قرآن اور حدیث کے۔ مسلمان قرآن میں بہت فرق قائم کرتے ہیں۔ قرآن خدا کا کلام ہے اور حدیث ایک خدا رسیدہ فانی انسان کے وہ اقوال ہیں جو خدائی الہام اور القا کا نتیجہ ہیں۔

پیغمبر کی احادیث اور سنت ان کے وصال کے فوراً بعد ہی لوگوں نے یاد کرنا اور ایک دوسرے کو سنانا شروع کردی تھیں۔ یہ احادیث اور سنتِ رسولؐ عرب علاقوں کے اندر اور اس سے باہر پھیلتی ہوئی مسلم آبادی کے لیے ایک کسوٹی بن گئی تھیں جن پر بحث وتمحیص اور غور وفکر کے بعد مسلم معاشرے اپنی ذاتی، سیاسی اور انتظامی امور کے لیے پالیسی وضع کررہے تھے۔ نویں صدی عیسوی تک ان احادیث کا وسیع ذخیرہ جمع کیا جاچکا تھا اور وہ اسلامی علوم کا بنیادی ماخذ بن چکی تھیں۔ چنانچہ ہم نے قرآن کی مشہور تفسیریں پڑھیں اور امام بخاری اور امام مسلم کی جمع کی ہوئی احادیث کا مطالعہ کیا۔ امام بخاری نے ۸۶۹ اور امام مسلم نے ۸۷۵ میں وفات پائی۔ ہم نے البیضاوی اور مشکوٰۃ پڑھیں اور حیات طیبہ پر ابن اسحاق کی کتاب پڑھی۔ ابن اسحاق ۷۰۴ میں پیدا ہوئے۔ وہ رسول کریمؐ کے پہلے سوانح نگار تھے۔ اس کے علاوہ ہم نے آٹھویں اور نویں صدی میں لکھی جانے والی تاریخ کی کتابیں بھی پڑھیں۔ پھر ہم نے قرآن کی تفسیروں کی شرح پڑھی۔ اس کے بعد قدیم فلسفیوں اور فقہا کی باری تھی۔ ان علما اور فلاسفہ کا اثر صرف مسلم دنیا تک ہی محدود نہیں تھا یورپ نے بھی ان کا اثر قبول کیا۔ اگر جعفر ہماری محفل میں نہیں آسکتے تھے تو ایک اور سوڈانی عالم ان کی جگہ آجاتے تھے۔ ان کا نام تھا طیب عابدین۔

اُسرہ کا اجلاس ہمیشہ قرآن کی کسی آیت کی تلاوت سے شروع ہوتا تھا۔ اس کے بعد دو یا اس سے زیادہ مفسروں کی تفسیروں میں یہ دیکھا جاتا تھا کہ کس مفسر نے اس آیت کی کیا تفسیر کی ہے۔ اس کی مزید وضاحت کے لیے ہم سیرت کی کتابوں اور صحیح بخاری سے رجوع کرتے تھے۔ جوں جوں ہماری تعلیم آگے بڑھتی گئی جعفر نے ہمیں احادیث جمع کرنے والوں کی زندگی سے بھی روشناس کرانا شروع کیا۔ اس طرح مجھے ایک نئی بصیرت حاصل ہوئی۔ میرے اوپر انکشاف ہوا کہ علم ودانش کی روشنی کے وہ مینار ہمارے آج کے اسلامی رہنماؤں جیسے نہیں تھے جو میرے اوپر جنت کے دروازے کھولنے اور بند کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ وہ علما اور فضلا انکسار کا مکمل نمونہ تھے۔ انہوں نے اپنی رائے کو کبھی پتھر کی لکیر نہیں جانا۔ انہوں نے جو کچھ لکھا وہ اپنے زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کو سامنے رکھ کر لکھا۔ انہوں نے اپنی تحریروں سے پتھر کے مقبرے نہیں بنائے۔

مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ کسی بھی مسئلے کے بارے میں ان علما کا قطعیت سے گریز تھا۔ مثلاً امام بخاری کو ہی لیجے۔ وہ احادیث کے صحیح یا ضعیف ہونے کے بارے میں اتنے محتاط تھے کہ جب تک راویوں کے پورے سلسلے کے ثقہ ہونے کا یقین نہیں ہوجاتا اس وقت تک وہ کسی حدیث کی صحت تسلیم نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے جو پیمانہ مقرر کیا تھا اس میں علم الاخلاق، عمرانیات، قانون، سیاست، معاشیات، منطق اور جغرافیہ تمام علوم سے کام لیا جاتا تھا۔ کوئی بھی روایت کسی ثقہ سند کے بغیر قبول نہیں کی جاتی تھی اور سند کے لیے ہر راوی کی قوتِ حافظہ، اس کی راست بازی اور سچائی جانچی جاتی تھی اور اس کی اس اہلیت کی تصدیق کی جاتی تھی کہ اس کی شہادت کسی بھی عدالت میں قابل قبول ہوسکتی ہے یا نہیں۔ پھر روایت کرنے والوں کی تصدیق کی جاتی تھی۔ راویوں کا یہ سلسلہ قدم بقدم رسول کریمؐ تک جاتا ہے۔ یہ ضروری تھا کہ آخری راوی نے رسول کریمؐ سے شرف ملاقات حاصل کیا ہو۔ اس کے علاوہ یہ بھی خیال رکھا جاتا تھا کہ کوئی حدیث عقل وخرد کے منافی اور تاریخی حقائق کے خلاف بھی نہ ہو۔ اس کا بھی خاص لحاظ رکھا جاتا تھا کہ کہیں وہ حدیث قرآنی تعلیمات کے منافی تو نہیں ہے اور یہ کہ وہ ایسی یک طرفہ تو نہیں ہے کہ معمولی غلطی پر بھاری سزاؤں اور معمولی نیکی پر بہت بڑے انعام کی بشارت دیتی ہو۔

امام بخاری کو تیر اندازی کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے لڑکپن میں ہی احادیث یاد کرنا شروع کردی تھیں۔ سولہ برس کی عمر تک یعنی ۸۲۵ عیسوی تک وہ کافی احادیث یاد کرچکے تھے اور انہیں احادیث کے ہزاروں راویوں کے سلسلے سے بھی واقفیت ہوچکی تھی۔ وہ ان کے سوانح کی بھی تصدیق کرچکے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے سفر شروع کیے۔ وہ ہر جگہ علما سے ملتے اور احادیث جمع کرتے اور ان سے ان احادیث کے صحیح یا ضعیف ہونے کی تصدیق کرنے کا طریق کار معلوم کرتے۔ جب بھی انہیں کوئی حدیث معلوم ہوتی تو وہ غسل کرتے اور شکرانے کے نفل پڑھتے۔ انہوں نے چھ لاکھ احادیث جمع کیں۔ صحیح احادیث جمع کرنے میں انہیں سولہ برس لگ گئے۔ ان کے شاگردوں کا بیان ہے کہ رات کو سوتے میں وہ کئی بار اٹھ جاتے۔ چراغ روشن کرتے، کچھ لکھتے اور پھر سو جاتے۔ ان کے شاگرد نے ان سے کہا۔ ''آپ خواہ مخواہ اتنی تکلیف اٹھاتے ہیں۔ مجھے آواز کیوں نہیں دے لیتے؟'' انہوں نے جواب دیا۔ ''تم ابھی نوجوان ہو۔ میں تمہیں زحمت دینا نہیں چاہتا۔'' انہوں نے جتنی بھی احادیث جمع کیں ان میں سے سات ہزار کے قریب اپنی

کتاب میں شامل کیں اور صرف دو ہزار چھ سو دو کو صحیح قرار دیا۔ صحیح احادیث جمع کرنے کے بعد بھی وہ مطمئن نہیں ہوئے اور تین بار ان پر نظرثانی کی۔ آخرکار وہ احادیث چھپیں تو امام بخاری کی شہرت دور دور پھیل گئی۔ اس وقت وہ بغداد میں رہتے تھے۔ اب ان کی یادداشت کا امتحان لینے کے لیے وہاں لوگوں کی قطار لگ گئی۔ ایک بار تو دس آدمی ایک قسم کی کسوٹی کھیلنے ان کے گھر جمع ہوگئے۔ ہر آدمی سے کہا گیا کہ وہ دو حدیثیں سنائے۔ ان لوگوں نے جان بوجھ کر اسناد اور متن کو گڈ مڈ کردیا۔ امام بخاری بڑے تحمل سے سنتے رہے۔ پھر کہنے لگے کہ میں ان حدیثوں کو نہیں جانتا۔ اس کے بعد انہوں نے اسناد کے ساتھ صحیح حدیثیں سنادیں۔

روایتی طریق کار میں اچھا حافظہ ہی علمی بصیرت کی نشانی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ حافظہ تو اس زمانے کا کمپیوٹر سافٹ ویئر تھا جس پر فکر و خیال کا انحصار ہوتا تھا۔ اصل میں یہ فکر کا اعلیٰ معیار ہی تھا جو مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ امام مالک کو ہی لے لیجیے۔ ان سے جو شرعی قوانین منسوب ہیں وہ بہت ہی بے لچک اور انتہائی سخت ہیں۔ لیکن امام مالک خود ایسے نہیں تھے۔ اس وقت کے خلیفہ نے ان سے کہا کہ وہ اسلامی شریعت پر ایک کتاب لکھیں جسے پوری اسلامی دنیا میں ایک رہنما کتاب کے طور پر تقسیم کیا جائے۔ اس کے بعد جو کوئی بھی ان قوانین سے انحراف کرے گا اسے سزا دی جائے گی۔ امام مالک نے یہ پیش کش فوراً مسترد کردی کہ انہیں خود اپنی رائے پر پختہ یقین نہیں ہے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ کسی ایک کتاب سے رہنمائی حاصل کرنے کے بجائے رسول کریمؐ کے صحابہ کرام کو دنیا بھر میں تلاش کیا جائے اور ان سے سیکھا جائے۔ امام مالک کہتے تھے کہ اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کے کئی طریقے ہیں اور لوگ آزاد ہیں کہ علم کے جس چشمے سے چاہیں اپنی پیاس بجھائیں۔

یہ بات امام شافعی کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے جو امام مالک کے شاگرد تھے اور انہوں نے اپنا مکتبۂ فکر یا فقہی مسلک پیدا کیا۔ کہا جاتا ہے کہ شافعی ایک دن حاکمِ مکہ کا تعارفی خط لے کر حاکمِ مدینہ کے پاس گئے کہ انہیں امام مالک سے ملا دیا جائے۔ حاکمِ مدینہ انہیں امام مالک کے پاس لے گئے۔ امام مالک نوجوان کی ذہانت سے بہت متاثر ہوئے اور اپنی شاگردی میں لے لیا۔ شافعی خوبصورت بھی تھے اور بہت سخی بھی۔ وہ اپنی آمدنی کا بڑا حصہ ضرورت مندوں میں تقسیم کردیا کرتے تھے۔ وہ امام مالک کی وفات تک مدینہ میں رہے۔ اس وقت تک وہ خود بھی ایک ذہین و فطین فقیہ بن چکے تھے۔ امام شافعی وہاں سے عراق گئے جہاں حنفی فقہ پر

عمل کیا جاتا تھا۔ وہاں جا کر انہوں نے اندازہ لگایا کہ امام مالک کے نظریات میں بھی کمزوریاں ہیں۔ امام ابوحنیفہ بھی نہایت ہی منکسر مزاج انسان تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ مسلمانوں کو صرف حدیث اور سنت پر انحصار کرنے کے بجائے اپنی عقل سے بھی کام لینا چاہیے۔ یہاں حنفی علما کے ساتھ بحث وتمحیص کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ حنفی مسلک میں بھی خامیاں موجود ہیں۔ انہوں نے اپنی عمر کا آخری حصہ دونوں مسالک کا ایک امتزاج پیش کرنے میں گزارا۔ اس کا ثبوت ان کا رسالہ ہے۔ امام شافعی نے ساری عمر بحث مباحثہ میں گزاری اور کبھی کسی کی رائے سے اختلاف کرنے میں پس وپیش نہیں کی امام مالک کے پیروکاروں کے ہاتھوں موت سے ہمکنار ہوئے۔ انہوں نے امام شافعی کو اتنا مارا کہ ان کی جان نکل گئی۔ ان فقہا کی آرا جو اسلامی شریعت کی بنیاد بنتی ہیں، کبھی قطعی، حتمی اور دوامی نہیں مانی گئیں۔ وہ خود بھی کہا کرتے تھے کہ ان کی رائے محض ان کی ذاتی رائے ہے جسے وہ تبدیل بھی کرتے رہتے تھے اور وہ کسی طرح بھی دوامی قانون کی حیثیت نہیں رکھتیں۔ حسن البنا کی طرح یہ کہنا کہ اماموں نے ہمیشہ کے لیے تمام شکوک وشبہات دور کر دئے ہیں ان فانی انسانوں کو الوہی درجہ دینے کے مترادف ہے۔ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ اسلامی شریعت جو آج موجود ہے وہ تا قیامِ قیامت اس شکل میں قطعی اور حتمی رہے گی۔

جعفر یہ احتیاط کرتے تھے کہ وہ مختلف مسالک کے اختلافات میں نہ پڑیں۔ وہ متنازع امور سے گریز کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ بنیادی باتیں سیکھ لو۔ پھر تم خود ہی فیصلہ کر سکو گے۔ ہم نے بنیادی اصولوں کا احاطہ کر لیا تو پھر اسرہ کے اجلاسوں میں سوال وجواب اور بحث مباحثہ کا دروازہ کھول دیا گیا۔ یہ بحث وتمحیص ایمان کی نوعیت کے بارے میں ہوتی تھی۔ جعفر کرسی پر بیٹھتے اور ہم سب ان کے گرد گھیرا بنا کر فرش پر بیٹھ جاتے۔ وہ ایک مسئلہ پیش کرتے اور ایک طالب علم سے کہتے کہ وہ اس کے حق میں دلائل دے اور دوسرے سے کہتے وہ اس کی مخالفت کرے۔ کبھی یہ بھی ہوتا کہ جعفر ایک جانب ہوتے اور طلبہ دوسری جانب۔

جعفر کے سوڈان واپس جانے تک اسلامی شریعت اور فقہ کے بارے میں ہماری بنیاد کافی مضبوط ہو چکی تھی۔ میں اس شریف اور دیو قامت عالم کا انتہائی احسان مند ہوں جس نے مجھے تنقیدی فکر کی راہ پر ڈال دیا۔ اس کا علمی اثر اسلامی تعلیمات تک ہی محدود نہیں تھا۔ اس نے کارل پاپر کے زیر اثر فلسفہ بھی پڑھا تھا اور وہ جدید فلسفیانہ افکار سے بھی بخوبی واقف تھا۔ وہ اسلامی علوم کو جدید رجحانات کی روشنی میں سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتا تھا۔ ہم جب بھی جعفر کے

ساتھ گفتگو کرتے تو ہماری بات کسی ایک موضوع یا کسی ایک زمانے تک محدود نہیں رہتی بلکہ ہم قدیم اور جدید اسلامی اور مغربی مفکروں کے خیالات ونظریات سب کا احاطہ کرتے۔ اب سوال یہ ہے کہ جعفر جیسا عالم فاضل انسان کسی بڑے اسلامی ادارے کا سربراہ کیوں نہیں بنا؟ اور وہ اپنے گرد نئی نسل کے ان شاگردوں اور پیروکاروں کا وسیع حلقہ کیوں نہیں بنا پایا جو تنقیدی شعور حاصل کرنے کے لیے ہر دم بے چین رہتے تھے؟ اس کا جواب شاید اس بات میں ملے کہ لندن میں جس جعفر کو ہم جانتے تھے چند سال بعد اس سے ملاقات ہوئی تو وہ کوئی اور ہی جعفر تھا۔ اس وقت وہ سعودی عرب میں پڑھا رہا تھا۔ اب جعفر کے سامنے جو کچھ تھا وہ گھسا پٹا راستہ تھا۔ میرے سوڈانی پھل دار درخت کے سایہ سے دور اب یہ واضح ہوتا جا رہا تھا کہ میرے اسلامی دوستوں میں دو چیزوں کی کمی ہے۔ ایک اپنے اوپر شک کرنا اور دوسری رواداری اور درگزر نہ کرنا۔ پہلی خامی کی وجہ سے وہ دنیا کو سفید اور سیاہ کے خانوں میں بانٹتے تھے اور دوسری کمی نے ہمارے اپنے اندر اختلافات کی بنیاد ڈالی۔

FOSIS اور اسلامی تحریکوں سے میرے برگشتہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ دوسروں کی رائے سننے کو تیار نہیں تھے۔ اپنے خیالات اور نظریات کو پتھر کی لکیر مانتے تھے۔ شکوک وشبہات اس وقت پیدا ہوئے جب رسالہ The Muslim نے پاکستانی علما کا یہ فتویٰ شائع کیا کہ سوشلزم کفر ہے اور سوشل سٹون کی مدد کرنا حرام ہے۔ کفر کے لغوی معنی تو خدا کی نعمتوں سے انکار کرنا ہے۔ لیکن موجودہ زمانے میں اس سے مراد اسلام کا تضاد یا اس کی مخالفت لی جاتی ہے۔ اس طرح دنیا کو دو مخالف کیمپوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، ایک ہم اور دوسرے ہمارے دشمن۔ میں کسی حالت میں بھی دنیا کو اس طرح سیاہ وسفید میں نہیں بانٹ سکتا۔ میں مانتا ہوں کہ بہت سے سوشلسٹ خدا کو نہیں مانتے۔ مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم انہیں اپنا دشمن سمجھنے لگیں۔ یا ان کے ساتھ کام کرنے کو کفر سمجھیں۔

سچی بات تو یہ ہے کہ بیس سے پچیس سال کی عمر تک میں بھی دو عملی کا شکار رہا۔ پورا ہفتہ تو میں FOSIS کے لیے کام کرتا اور اس کے کارکنوں کے ساتھ رہتا لیکن سنیچر اور اتوار کو میں سوشلسٹ بن جاتا اور ہیکنی سٹیزنز رائٹس گروپ کے لیے کام کرتا۔ میں ہر اتوار کو رڈلی روڈ مارکیٹ میں مشورے دینے والے اسٹال پر کھڑا ہوتا۔ بعد میں میں ایک مقامی مرکز کے ساتھ کام کرنے لگا جس نے سنٹر پرائز کے نام سے ایک یوتھ کلب قائم کیا۔ یہ کلب بعد میں بہت ہی

مصروف کمیونٹی سنٹر بن گیا۔ سنیچر اتوار کو میں اپنے جیسے خوابوں میں رہنے والے نوجوانوں کے ساتھ مصروف رہتا جن کے دلوں میں دنیا کو بدلنے اور بہتر دنیا پیدا کرنے خواہش ہر دم مچلتی رہتی تھی۔ غربت و افلاس، ناانصافی، نسلی امتیاز اور طبقاتی تقسیم کے خلاف جدو جہد کرنے کے لیے میں اپنے سوشلسٹ دوستوں کا ساتھ دیتا۔ میں جانتا تھا کہ اگرچہ میرے سوشلسٹ دوست اس مقصد کے لیے اسلام کو اپنا رہنما نہیں بناتے مگر اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ یہ مقاصد اسلام کے منافی ہیں۔ کیا اسلام کوئی نسلی استحقاق ہے جو کسی مسلمان گھر میں پیدا ہونے سے خود بخود مل جاتا ہے۔ یا جیسے میں سمجھتا تھا یا جعفر نے سمجھایا تھا، وہ اخلاقی معیار اور وہ پیمانہ ہے جس سے انسانی معاشرہ کے لیے مجموعی طور پر حق و باطل، فائدہ مند اور نقصان دہ اور اچھے اور برے کی شناخت کی جاتی ہے۔ بہرحال اسلامی تحریکوں میں شامل ہمارے بھائیوں میں اپنی رائے کی قطعیت پر جو ایمان پیدا ہو چکا تھا اس نے اس رجحان کو تقویت پہنچائی کہ کفر کے ساتھ کسی قسم کا تعلق رکھنا بھی کفر ہے۔ حتیٰ کہ ایک نئے قسم کا کفر بھی دریافت کر لیا گیا۔ رسالہ دی مسلم اپنے ایک مضمون میں گرجا، ''کفر سے چشم پوشی کرنا بھی کفر ہے۔ اب آپ کے سامنے دو ہی راستے ہیں، اللہ اور اس کے ماننے والوں سے رشتہ یا پھر کفر کے ساتھ تعلقات۔ یہ فرق کبھی ختم نہیں ہوسکتا اور نہ اسے دھندلایا جاسکتا ہے۔ اندھیرے اور روشنی کی طرح اسلام اور کفر بھی ایک جگہ اکٹھے نہیں ہوسکتے۔'' میرے یہ بھائی میری اس دنیا اور اس کی حقیقت کو یکسر فراموش کر رہے تھے جہاں ایک ہی وقت میں مجھ جیسے لوگ کئی جگہ زندہ ہیں۔

میں ان کے مخصوص اور محفوظ حلقے کے اندر داخل نہیں ہوسکا۔ میں تو خدا کو سرمایہ دارانہ نظام کے علم بردار کے بجائے سوشلسٹ مانتا تھا۔ کیونکہ خدا کی الوہیت اور ربوبیت والی جو صفات مجھے بتائی گئی تھیں ان سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا۔ سوشلزم کی قوت اس میں ہے کہ وہ لوگوں کو ایک آسان اور محفوظ سیاسی ہتھیار اور ایسے ذرائع مہیا کرتا ہے جس سے مذہب کی تعلیمات اور اس کے بتائے ہوئے آدرش حاصل کیے جاسکتے ہیں اور جدید زمانے کے اعتبار سے اس کا پیغام عام کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے میرے سامنے دو راستوں میں سے کسی ایک کو چننے کا سوال ہی نہیں تھا۔ چنانچہ وہ جو کچھ پیش کر رہے تھے وہ منطقی طور پر میرے لیے ناکافی تھا اور میں اس رسالے میں چھپنے والے مقالے کی اس بات سے بھی متفق نہیں تھا کہ آج دنیا میں تمام ملکوں کے سربراہ کافر ہیں، ان میں مسلم ملکوں کے سربراہ بھی شامل ہیں اور یہ کہ جو بھی ان کا ساتھ دے گا،

ان کے ساتھ کسی قسم کا تعلق رکھے گا یا ان کی مذمت نہیں کرے گا وہ بھی کافروں اور ظالموں کے زمرے میں ہی آجائے گا۔ ظاہر ہے اس معیار پر تو کوئی بھی نہیں اتر سکتا تھا۔ جو لوگ اپنے عقائد میں اتنے کٹر ہوتے ہیں ان کے ہاں ترحم اور درگزر کرنے کا خانہ خالی ہوتا ہے۔ اب میں نے FOSIS کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے ایک بہت ہی بے ضرر اور نہایت ہی نرم قسم کا پمفلٹ The Muslim Student's Guide to Britain کے نام سے چھاپا تو ان لوگوں کے اخلاق اور ان کی ایثار پسندی کا پتہ چلا۔

جن دنوں میں FOSIS کا جنرل سیکریٹری تھا ان دنوں اس کا صدر ایک ویلش مسلم طالب علم تھا جو کینٹر بری کی کینٹ یونیورسٹی میں انٹرنیشنل ریلیشنز پڑھ رہا تھا۔ اس کا نام داؤد روسرا اووین تھا اور جب وہ ملائیشیا میں کام کر رہا تھا تو مسلمان ہوگیا تھا۔ لیکن وہ اپنے آپ کو نومسلم کہلانے سے ناراض ہوتا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا کہ تم کب مسلمان ہوئے؟ تو وہ جواب دیتا۔ میں تو تمام آلائشوں سے پاک معصوم مسلمان کی شکل میں پیدا ہوا تھا۔ مجھے تو میرے ماں باپ نے عیسائی بنا دیا تھا۔ اب میں اپنی اصل حالت پر واپس آگیا ہوں۔ اس لیے میں نومسلم نہیں ہوں۔ جتنے بھی انگریز مسلمان ہوئے تھے وہ انہیں ''مراجعت کرنے والے'' کہا کرتا تھا۔ اس کا نصب العین یہ تھا کہ وہ انگریز مسلمانوں کی مخصوص برادری قائم کرے۔ وہ کارڈف کے ان یمنی مسلمانوں کا ذکر بہت محبت کے ساتھ کرتا تھا جو ایک صدی پہلے وہاں آکر آباد ہوگئے تھے۔ یہ لوگ جہاز راں تھے جو اپنے جہازوں میں یہاں آتے تھے اور پھر وہ یہیں رہ پڑے۔ انہوں نے ویلز کی مقامی لڑکیوں سے شادی کرلی۔ وہ لڑکیاں بھی مسلمان ہوگئیں۔ اب ان کی اتنی آبادی ہوگئی ہے کہ کئی گلیاں ان کی اپنی ہیں اور انہوں نے ایک پرانا کلیسا لے کر اسے مسجد بنا لیا ہے جو باہر سے بھی مسجد ہی نظر آتا ہے۔ وہ ایک اور برطانوی مسلمان کا بھی ذکر کرتا تھا جس کا نام وہ قلیام بتاتا تھا۔ کہتا تھا کہ اس نے ۱۸۸۰ء میں لیور پول میں مسلمانوں کی کافی بڑی برادری پیدا کرلی تھی۔ ایک دن اس نے مجھے انیسویں صدی کے مشہور برطانوی مستشرق ایڈورڈ ولیم لین کی کتاب Arabian society in the middle ages;Studies from the Thousand and one nights پڑھتے دیکھ لیا۔ کہنے لگا۔ تم سمجھتے ہو یہ اچھا ادیب ہے؟ اس نے تو برطانوی مسلمانوں کے خلاف تعصب کا اظہار کیا ہے۔ وہ بلاوجہ قلیام کے خلاف زہریلے مضامین لکھتا رہا تھا۔ اس نے قلیام کے خلاف عیسائی حکام کو اتنا بھڑکایا تھا کہ

انہوں نے اس کے اور اس کی برداری کے خلاف صلیبی جنگ شروع کردی تھی۔ مگر جس برطانوی نومسلم کو وہ بہت زیادہ پسند کرتا تھا وہ تھا لارڈ ہیڈلی الفاروق جس نے سری میں ووکنگ مسجد بنائی تھی۔ روسرا اووین بھی کسی لارڈ کی طرح ہی سلوک کرتا۔ دوسروں (جو گورے نہیں تھے) سے اپنے کام کراتا اور توقع کرتا کہ سب اس کی عزت کریں۔ مجھے بھی اندازہ ہوا کہ سارے کام تو میں کرتا ہوں وہ تو کھڑا اپنی داڑھی کھجاتا رہتا ہے۔

یہاں تو عام لگے بندھے کاموں سے بھی آگے کی بات تھی۔ اس کی فکر کسی کو نہیں تھی کہ تاریخ نے مسلمانوں کے ساتھ کیا ظلم کیا ہے اور ہر جگہ مسلمانوں کی حالت زار کیا ہے۔ ہمارے دفتر میں جن درخواستوں کی بھرمار رہتی تھی وہ یہ ہوتی تھیں کہ نماز پڑھنے کے لیے مسجدیں کہاں ہیں، حلال گوشت کی دکانیں کہاں کہاں ہیں، حلال کھانوں کے ریستوراں کہاں ہیں؟ یا پھر یہ کہ باہر سے آنے والے مسلمان طلبہ کے لیے رہنے سہنے کا معقول انتظام کہاں ہوسکتا ہے۔ گویا ہمارے زمانے کے تمام اہم سوالات کے جواب روزمرہ کی ان معمولی ضرورتوں تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ چنانچہ میں نے اور اووین نے سوچا کہ سب کی رہنمائی کے لیے ایک کتابچہ چھاپ دیا جائے۔ اتنے بڑے مقاصد کے لحاظ سے عام ضرورت مندوں کے لیے یہ ایک معمولی سا کتابچہ تھا۔ اس لیے وہ کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہا۔ پھر یہ بھی ہوا کہ حلال گوشت کی جن دکانوں کے ہم نے پتے دیے تھے، معلوم ہوا کہ ان میں سے اکثر میں حلال گوشت نہیں ملتا۔ اسی طرح جن قابل اعتبار ریستورانوں کے پتے دئے گئے تھے ان میں سے بھی بہت سے کچھ زیادہ اعتبار کے قابل نہیں تھے۔ ثابت ہوا کہ اگر آپ زیادہ تکلف میں نہ پڑتے ہوں تو افادیت پسند ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے اور پھر دکان پر لگے بورڈ کا اعتبار بھی نہیں کرنا چاہیے۔ تنظیم کے سینئر ارکان نے مجھے حکم دیا کہ کتابچہ فوراً ضائع کردیا جائے۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کتابچے کی وجہ سے ساری مسلم امّہ اور پوری اسلامی تہذیب خطرے میں پڑ گئی ہے۔ ہمارے اوپر خوب لے دے ہوئی۔ حالانکہ یہ کام نہایت دیانت داری اور معصومیت کے ساتھ کیا گیا تھا۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ اس کتابچے نے آپس میں اتنی نفرت کیوں پیدا کردی۔ مجھے اپنی میز پر کتابچہ کے ایسے صفحے پڑے ملتے جن پر نشان لگا لگا کر سیاہ کردیا جاتا تھا۔ صرف کتابچہ پر ہی اعتراض نہیں کیے جارہے تھے بلکہ مجھے بھی پیدائشی طور پر ناقابل اعتبار قرار دیا جارہا تھا۔ پھر تنظیم کے ارکان کے اندرونی دھڑے کا ایک خفیہ اجلاس ہوا اور مجھے رسالے کی ادارت سے نکال دیا گیا۔ حتیٰ کہ جو شمارہ میں

نے تیار کیا تھا اس پر بھی میرا نام شائع نہیں کیا گیا۔ گویا میرا نام تاریخ سے ہی مٹا دیا گیا۔

میں جب پوسٹ گریجویشن کر رہا تھا تو FOSIS کے لیے بھی کئی سال سے کام کرتا رہا تھا۔ لیکن کتابچہ کے واقعہ نے مجھے بدمزہ کر دیا۔ اگر میری اتنی سی خطا کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تو میری دوسری کمزوریوں کو یہ لوگ کیسے برداشت کر لیں گے۔ اخوان اور جماعت کے اسی رویہ کی وجہ سے میں ان سے برگشتہ ہو گیا تھا لیکن مسلم طلبہ، برطانوی مسلمانوں کی برادری اور دنیا بھر کی مسلم امہ کے ساتھ میرا تعلق وہی تھا۔ وہ میرے جسم و جان کا حصہ تھے۔ میری جستجو ایسے راستوں کے لیے تھی جن پر چل کر عام مسلمانوں کے حالات میں بہتر تبدیلی لائی جا سکے۔ ایک دن روسراودین نے کسی عربی شاعر کا ایک شعر پڑھا۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ جب تک ایمان اور کفر کا توازن برابر نہیں ہوتا اس وقت تک کوئی انسان سچا مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ تم زیادہ روادار اور زیادہ انسان دوست اسلام سے ہی خوش رہ سکتے ہو۔ اس کے بعد وہ مجھے شیخ ناظم کے پاس لے گیا۔

باب ۴

تصوّف کے اسرار

۱۹۷۰ء کی دہائی میں تصوّف کا بہت چرچا تھا۔ گویا وہ اس زمانے کا فیشن تھا۔ تصوّف کی تمام روایات کے سوتے اس خواہش سے پھوٹتے ہیں کہ زندگی کے بارے میں زیادہ شائستہ، زیادہ روادار اور زیادہ روشن خیال نقطہ نظر پیدا کیا جائے۔ ایسا نقطۂ نظر جو سرّی اور باطنی تو ہو مگر انسان اور کائنات کے متعلق ہر فرد کے اندر سہل اور آسان بصیرت پیدا کرے۔ تصوّف مجھے ورثہ میں بھی ملا ہے اور میری نشوونما کا حصہ بھی رہا ہے۔ میرے ماں باپ نے مجھے بتایا تھا کہ میرے پردادا سگر دادا بہت ممتاز صوفی تھے۔ دراصل یہ روایت تمام خاندانوں میں ہی پائی جاتی ہے کہ ہمارے بزرگ صوفی تھے۔ مسلمانوں میں مشکل سے ہی کوئی ایسا گھرانا ملے گا جو یہ دعویٰ نہ کرتا ہو کہ اس کے بزرگوں میں پیر فقیر نہ گزرے ہوں۔ تصوّف مسلمانوں کی زندگی کا لازمی حصہ ہے۔ تمام مسلمان بچوں کی طرح میں نے بھی اپنی ماں کی گود میں ہی پیغمبروں اور ولیوں کے قصے سنے اور میں اسی ماحول میں پلا بڑھا۔ جب پڑھنے کے قابل ہوا تو تیرھویں صدی کے شاعر اور صوفی بزرگ مولانا رومؒ کی مثنوی کی حکایات پڑھیں۔ اس کے بعد میں نے بارھویں صدی کے صوفی شاعر فریدالدین عطارؒ کی منطق الطیر پڑھی۔ میرے والدین کا کمرہ تصوّف پر کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ حکایات، شاعری اور تصوّف پر مباحث، کیا کچھ نہیں تھا ان میں۔ میں نے ان کتابوں کو خوب پڑھا۔ لیکن یہ میرے والد کا فیضان ہے کہ مجھے تصوّف کی طرف لے کر گئے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ ان کی اپنی زندگی بھی ایک صوفی بزرگ کے گرد ہی طواف کرتے گزری

جنہوں نے انہیں بہت کچھ سکھایا۔ اب میں نے سوچا کہ شاید کسی صوفی کی نظر ہی مجھے اس دنیا سے آگے لے جائے جہاں جعفر مجھے لے گیا تھا۔

چنانچہ اپنے شکی مزاج کے باوجود میں قدرتی طور پر تصوف کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ داؤد روسرا اووین ہر وقت مجھے صوفیوں کے کرشمات سناتا رہتا تھا کہ شیخ کی ایک نظر سے ہی پتھر سے پتھر دل بھی کیسے پگھل گئے، شیخ نے ایک بار گلے لگایا تو رات کو خواب میں حضورؐ کی زیارت ہوگئی، بڑے سے بڑے نشے باز اور بدمعاش شیخ سے پہلی ہی ملاقات میں کیسے مشرف باسلام ہوگئے۔ شیخ کے پیروکاروں میں بڑے بڑے رئیس، صدر، وزیر اعظم، سلطان اور شاہزادے شامل ہیں۔ میں اس کے شیخ سے ملنے پر رضامند ہوگیا۔ میں نے اپنے چھوٹے بھائی کو بھی ساتھ لے لیا۔ روسرا اووین کی رہنمائی میں ہم شمالی لندن میں ٹونگٹن گرین پہنچ گئے۔

اسلام میں تصوف کی طویل تاریخ ہے اور کہا جاتا ہے کہ نویں صدی کی ولیہ رابعہ بصری پہلی صوفی تھیں۔ انہوں نے اللہ سے بے لوث محبت کی تعلیم دی اور ساری زندگی اسی مقصد کے لیے گزار دی۔ لفظ تصوف عربی مادہ صوف یا اون سے نکلا ہے۔ یعنی کھردرا اونی کپڑا جو صوفیا پہنتے تھے۔ یہ سادگی اور کفایت شعاری کی علامت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تصوف شریعت کی سخت گیر اور متشدد تعبیر کے خلاف ردِّعمل تھا جہاں ذرا ذرا سی جزئیات پر سختی سے عمل کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ البتہ بہت سے صوفی سلسلے دعویٰ کرتے ہیں کہ شریعت تصوف کا لازمی جزو ہے۔ صوفی اپنے آپ کو راہ خدا کا سالک یا راہ رو کہتا ہے۔ اس روحانی سفر سے، جسے طریقت کہا جاتا ہے اسے جنت میں خدا کی قربت نصیب ہوگی۔ لیکن خدا کی یہ قربت صرف موت کے بعد ہی نصیب نہیں ہوگی بلکہ سلوک کی منزلیں طے کرنے کے بعد اس قربت کا تجربہ اس دنیا میں بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کی تخلیق کا اصل مقصد بھی یہی ہے۔ ابتدائی زمانے میں تصوف کو اسلامی شعائر سے الگ نہیں مانا جاتا تھا بلکہ وہ اس کا حصہ ہی تھا۔ تمام صوفی سلسلے اپنا رشتہ رسول اللہؐ کے پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جوڑتے ہیں یا پھر چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ سے۔ قدیم صوفیا میں سے اکثر نے تو اپنی زندگی میں عالم گیر شہرت حاصل کرلی تھی۔ جیسے حضرت جنید اور حضرت عبدالقادر جیلانی۔ تیرھویں صدی کے بزرگ امام شاذلی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے تصوف کی فلسفیانہ تعبیر پیش کی۔ جب تصوف کو روایتی اسلام سے الگ اور ممیز سلسلہ تسلیم کیا جانے لگا تو بیشتر صوفیا نے اعلان کیا کہ ''ابتدا میں تصوف کسی نام کے بغیر ایک

حقیقت تھا، اب یہ حقیقت کے بغیر ایک نام ہے۔''

تصوّف کے جتنے سلسلے ہیں اتنی ہی اس کی تعبیریں بھی ہیں۔ تاریخ میں عظیم صوفیا سے سوال کیا گیا ''تصوّف کیا ہے؟'' ہر ایک سلسلے کے صوفی نے اس کا جواب اپنے انداز میں دیا۔ مثال کے طور پر دسویں صدی کے صوفی بزرگ ابوالحسن النوری نے جواب دیا۔ ''تصوّف نہ خارجی تجربہ ہے اور نہ داخلی علم، یہ صرف راستی اور تقویٰ ہے'' جنید بغدادی نے کہا۔ ''تصوّف یہ ہے کہ تم کسی شرط کے بغیر خدا کے ساتھ وابستہ ہو جاؤ'' سہیل ابن عبداللہ التستری کا، جو نویں صدی کی آخری دہائی کے بزرگ ہیں، کہنا ہے کہ ''تصوّف یہ نہیں ہے کہ کم کھاؤ، خدا سے رابطہ رکھو اور انسانوں سے دور بھاگو۔'' نویں صدی کے اواخر کے ایک عراقی صوفی سمنون نے، جو لوگوں کے لیے ایک معمہ بنے رہے اور جو اپنے آپ کو ''جھوٹا'' کہتے تھے، کہا ہے کہ ''تصوّف یہ ہے کہ تمہاری کوئی ملکیت نہ ہو اور تم کسی کی ملکیت نہ ہو۔'' اس کی تعریف اس طرح بھی کی جاتی ہے ''فنا' فنا' اپنے آپ کو فنا کر دینا، اپنی انا کو مٹا دینا۔'' جنید بغدادی نے کہا ''یہ ایسا تجربہ ہے جس میں تم اپنے آپ کو مٹا دیتے ہو اور صرف اس کے لیے زندہ رہتے ہو۔'' اصل میں یہ اپنی ذات کی نفی ہے، اپنی مرضی اور ارادے کی نفی، وجود کی نفی، شعورِ ذات کی نفی اور خدا کی مرضی، اس کی صفات میں اور بالآخر اس کی ذات میں اپنے آپ کو ضم کر لینا۔ صوفی کو فنا کی راہ پر جو عمل لے جاتا ہے وہ ہے ذکر، اللہ کی یاد۔ ذکر ایک طویل عمل ہے لیکن عام طور پر اس میں اللہ کا ورد اس طرح کیا جاتا ہے کہ حلق اور دل کی پوری طاقت کے ساتھ ایک ایک حرف پر زور دے کر اور انہیں کھینچ کر لفظ اللہ ادا کیا جاتا ہے۔ اس میں نفی اور اثبات دونوں شامل ہیں کہ لا الہ الااللہ کہا جاتا ہے۔ یعنی کوئی معبود نہیں ہے سوائے اللہ کے۔ اس سے بھی زیادہ وسیع معنی میں جو ذکر کیا جاتا ہے وہ قرآن کی آیات کا ذکر ہے۔ **وھو معکم این ماکنتم، واللہ بما تعلمون بصیر۔** یعنی اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں تم ہو۔ اور جو تم کرتے ہو اللہ دیکھتا ہے۔ **واینما تولو فثم وجہ اللہ۔** یعنی تم جس طرف بھی مُنھ کرو ادھر اللہ ہے۔ صوفی جدھر بھی توجہ کرتا ہے خدا اس طرف ہوتا ہے، اس کے ساتھ لیکن کون ومکاں سے باہر ہوتا ہے وہ اس پر توجہ مرکوز کرتا ہے اور اس میں ضم ہو جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے فنا شروع ہوتی ہے اور یہ وہاں لے جاتی ہے جس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں بتا سکتا۔

نویں صدی کے نصف آخر کے انقلابی صوفی منصور الحلاج کو یہ فنا سرمستی اور وجد کی

مستقل کیفیت تک لے جاتی ہے۔ اسلامی تاریخ میں حلاج نے فنا کے تجربہ کی روشن مثال قائم کی ہے۔ سب سے پہلے میرے والد نے ان کے بارے میں مجھے بتایا تھا۔ مجھے بہت پہلے ہی یہ احساس ہوگیا تھا کہ اس انقلابی صوفی کی طرف متوجہ کرنے میں میرے والد کا اپنا شوق بھی شامل تھا۔ وہ خود بھی حلاج کے غیر روایتی خیالات سے بہت متاثر تھے۔ بعد میں مجھے فرانسیسی مستشرق لوئی میسی نوں کی کئی جلدوں میں لکھی ہوئی کتاب The Passion of Al-Hallaj پڑھنے کا موقع ملا تو مجھے حلاج کی بصیرت کی گہرائی اور گیرائی نے مبہوت کر دیا۔ منصور حلاج ایران کے صوبہ فارس میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے جنید بغدادی کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کے مرید بن گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے فنا کی کیفیت اپنے ابتدائی دور میں ہی حاصل کرلی تھی اور اپنی بقیہ زندگی اللہ کی محبت میں سرشار ہوکر گزاری اور عمر بھر اپنی ذات کو اپنے محبوب کی ذات میں فنا کرنے کی کوشش میں ہی لگے رہے۔ ان کے مرشد جنید بغدادی نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ خاموشی اور تنہائی کی جستجو کریں۔ لیکن حلاج سرمستی کی کیفیت میں سرشار گلی گلی گھومتے پھرتے تھے اور اناالحق کا نعرہ لگاتے تھے اور کہتے تھے:

میں وہ ہوں جس سے میں محبت کرتا ہوں اور وہ جس سے میں محبت کرتا ہوں میں ہوں
ہم ایک جسم اور دو روحیں ہیں
تم مجھے دیکھتے ہوتو اسے دیکھتے ہو
اور اسے دیکھتے ہوتو مجھے دیکھتے ہو

میرے والد ان الفاظ اور ان خیالات کے بہت شیدائی تھے۔ لیکن ظاہر ہے کٹر اور راسخ العقیدہ مسلمان اسے کیسے قبول کر سکتے تھے۔ وہ سب ان کے خلاف ہوگئے۔ ان پر ارتداد اور کفر کے فتوے لگائے جانے لگے۔ جنید بغدادی نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ سفر پر نکل جائیں۔ چنانچہ وہ شہر شہر قریہ قریہ گھومنے لگے۔ انہوں نے مکہ، بغداد، خراساں۔ ماوراُالنہر، سندھ حتیٰ کہ چین تک سفر کیا۔ وہ مستقل ایک آگ میں جل رہے تھے۔ ہر جگہ تنازع کھڑا ہوجاتا اور ان پر کفر کے فتوے لگنے لگتے۔ اپنی مشہور تصنیف کتاب الطواسین میں انہوں نے رسول اللہؐ کی حدیث کا حوالہ دیا ہے کہ "موت سے پہلے موت کو گلے لگا لو" اور وہ اس پتنگے کا حوالہ دیتے تھے جو روشنی کی طرف لپکتا ہے۔ پتنگا چراغ کی لو کے گرد چکر لگاتا ہے اور ہر چکر کے ساتھ وہ شعلے کے اور قریب آجاتا ہے یہاں تک کے وہ اس میں بھسم ہوجاتا ہے۔ حلاج اپنے آپ کو وہ پتنگا کہتے

تھے جو روشنی چاہتا ہے نہ چراغ اور نہ تپش، بس وہ تو اس شعلے میں اپنے آپ کو بھسم کرنا چاہتا ہے۔ پتنگا اور شعلہ اردو شاعری کا خاص استعارہ بن گیا ہے۔ میرے والد اور والدہ دونوں ہی شاعری کرتے تھے اور یہ استعارہ بار بار استعمال کرتے تھے۔ طواسین میں حلاّج کا نعرہ انا الحق بھی شامل ہے جس کی وجہ سے انہیں شہادت نصیب ہوئی۔ میں حق ہوں۔ حلاّج جب بھی موقع ملتا یہ نعرہ لگاتے تھے۔ ایک بار انہوں نے حضرت جنید کا دروازہ کھٹ کھٹایا۔ حضرت جنید نے پوچھا، کون ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا۔ انا الحق۔ ''میں حق ہوں۔'' حضرت جنید نے انہیں بار بار خبر دار کیا کہ اللہ کے متعلق اپنے راز اپنے سینے میں ہی محفوظ رکھو، لوگوں کے سامنے انہیں افشا نہ کرو کیونکہ عام لوگ انہیں نہیں سمجھ سکتے۔ حلاّج یا تو خطرے سے آگاہ نہیں تھے یا پھر وہ اس کی پروا نہیں کرتے تھے۔ آخر کار راسخ العقیدہ لوگوں کی فتح ہوئی۔ حتیٰ کہ جنید بغدادی بھی انہیں لوگوں کے ساتھ تھے۔ حلاّج کو مرتد قرار دے کر شہید کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ شہادت کے بعد بھی ان کی زبان پر انا الحق کا نعرہ ہی تھا۔

سچی بات یہ ہے کہ نیونگٹن گرین کی عمارت باغیوں کا گڑھ نہیں تھی اور نہ تصوّف کی سرمستی کا مرکز تھی۔ وہ تو اس علاقے میں عام سا وکٹورین گھر تھا۔ ہم بغلی دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ ایک تنگ سی راہداری گھر کی پچھلی طرف چلی گئی تھی۔ ایک پرانا چر چراتا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ہم ایک اندھیرے کمرے میں داخل ہوئے۔ یہاں کوئی فرنیچر نہیں تھا اور جہاں جہاں دھوپ تھی وہاں فضا میں گرد کی لہریں اڑتی نظر آ رہی تھیں۔ کمرے میں اگربتیوں کی جانی پہچانی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ قبرصی شیخ ناظم حقانی پہلی بار ۱۹۷۰ء کی دہائی کے وائل میں برطانیہ آئے تھے۔ سال دو سال کے اندر ہی برطانوی مسلمانوں کا ایک بڑا حلقہ ان کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گیا اور انہوں نے شمالی لندن میں اپنا صدر دفتر قائم کر لیا۔ وہ اپنے آپ کو نقشبندی سلسلے کا چودھواں شیخ کہتے تھے اور اپنا سلسلہ پہلے خلیفہ حضرت ابو بکرؓ سے ملاتے تھے۔ انہوں نے استنبول میں کیمیکل انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کا سلسلۂ نسب والد کی طرف سے دسویں صدی کے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے اور ماں کی طرف سے تیرھویں صدی کے مولانا جلال الدین رومیؒ سے مل جاتا تھا۔

اب ہم ایک اور کمرے میں گئے۔ یہاں بھی کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ البتہ فرش پر قالین بچھے تھے جن پر گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ شیخ ناظم ایک کونے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے بائیں

جانب سبز عمامے باندھے اور ڈھیلے ڈھیلے پاجامے پہنے ان کے عقیدت مندوں کا ہجوم تھا۔ ابھی میں اس ماحول سے مانوس ہوہی رہا تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ میں تو ایک پرانے اور جانے پہچانے موضوع پر ہونے والی گفتگو کے درمیان آگیا ہوں۔ یہ موضوع تھا داڑھی۔ اگر آپ مسلمان ہیں تو آپ کے لیے یہ کوئی غیر اہم موضوع نہیں ہے۔ چہرے کے بال قدرت کا عطیہ ہیں۔ ان بالوں کے ساتھ آپ کیا کریں یہ آپ کی اپنی مرضی پر منحصر ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ یہ غیر محسوس طریقے سے مگر شعوری طور پر اپنی ذات کا اظہار بھی ہے۔ میرے سامنے چہرے کے بالوں کے کئی نمونے موجود تھے۔ انہیں دیکھ کر میں تھوڑی دیر کے لیے ٹھٹھک سا گیا۔ مسلمان اپنی داڑھی کی تراش خراش سے اپنے فرقے، اپنے عقیدے، اپنے مسلک، اپنے علاقے اور اپنی ثقافت کا اظہار کرتے ہیں۔ عمامہ ایک اضافی چیز ہے۔ میں انہیں ان کی داڑھیوں سے پہچان سکتا تھا۔ صوفی کی داڑھی کے بال گالوں اور ٹھوڑی پر ہوتے ہیں لیکن ان کی مونچھیں صاف ہوتی ہیں۔ یہاں موجود لوگوں کی مونچھیں صاف تھیں اور ان کی نظریں گھنی اور لمبی سفید داڑھی، چھوٹے قد اور دھنسی ہوئی آنکھوں والے ایک شخص پر مرکوز تھیں۔ شیخ کی بھی مونچھیں صاف تھیں۔ شیخ ناظم اپنے سفید عمامے اور لمبے جبّے میں خاصے درشت مزاج نظر آتے تھے۔ روسرا اودین، جس کی الجھی ہوئی زرد رنگ کی داڑھی تھی، پہلے ہی ان کا عقیدت مند تھا اور ان کے خلیفہ بننے کا خواہش مند بھی تھا۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر شیخ کے ہاتھ چومے۔ اس نے پہلے میرا اور اس کے بعد میرے بھائی کا شیخ سے تعارف کرایا۔ ہم نے ایک ساتھ السلام علیکم کہا۔ شیخ نے اس کا جواب دیا اور اپنے پاس ہی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

بلاشبہ شیخ ناظم کی شخصیت میں زبردست روحانی کشش تھی۔ ان کے چہرے سے گہرا سکون اور اطمینان قلب جھلک رہا تھا۔ روسرا اودین اکثر ان کی برکات کا ذکر کرتا رہتا تھا۔ اب میں نے محسوس کیا کہ شیخ کی شخصیت کے گرد روحانیت کا ایک نورانی ہالہ ہے۔ اب ہم خاموشی سے بیٹھ گئے اور شیخ نے مابعد الطبیعیاتی گفتگو شروع کردی۔

''سالک وہ ہوتا ہے جو اپنے آپ کو بھول جاتا ہے اور اللہ کے حضور اپنا دل لگا لیتا ہے۔ وہ اس کی حضوری میں کھڑا اپنے فرائض ادا کرتا ہے اور دل میں اس ذات اقدس کا تصور باندھتا ہے۔ اللہ کا نور اس کے دل کو روشن کرتا ہے اور اس کے اندر پھولوں کے رس کی پیاس بڑھاتا ہے اور اس کی آنکھوں سے پردے ہٹاتا ہے اور اسے خالق حقیقی کا دیدار کرنے کا موقع فراہم

کرتا ہے۔ اگر وہ اپنا مُنھ کھولتا ہے تو اللہ کے حکم سے ایسا کرتا ہے۔ اگر وہ حرکت کرتا ہے تو حکم خداوندی سے اور اگر وہ سکون اختیار کرتا ہے تو اسی کے حکم سے۔ وہ اپنے خالق کی حضوری میں ہوتا ہے، اللہ کے ساتھ۔'' یہ کہہ کر شیخ نے ہماری طرف دیکھا۔

''صوفی'' اب وہ اپنے عقیدت مندوں کی قطاروں کو دیکھ رہے تھے۔ ''صوفی وہ ہے جو اللہ کی طرف سے عائد کردہ وہ فرائض ادا کرتا ہے جو اللہ کے رسول نے ہم تک پہنچائے ہیں۔ وہ ایک کامل اخلاقی قوّت کا نمونہ بننے کی سعی کرتا ہے اور یہی ہے اللہ جلّ جلالہ کو پہچاننا۔'' انہوں نے ایک لمحہ کو توقف کیا۔ پھر بولے ''صوفی تصوّف کی جستجو کرتا ہے'' یہاں اوقاف و رموز کی باریکیوں کو مدِّ نظر رکھنے کا وقفہ تھا۔ ''تصوّف اللہ کی حضوری کی طرف قدم بڑھانے کی نفاست کا نام ہے۔ اس کا نچوڑ اس مادی دنیا سے مُنھ موڑنا ہے۔'' تمام معتقد خاموشی کے ساتھ پوری توجہ سے سن رہے تھے۔ ''تصوّف ایسا علم ہے جس سے آدمی انسانی روح کی کیفیت کو سمجھتا ہے، خواہ وہ پاک صاف ہو یا گناہوں سے آلودہ۔ اگر وہ گناہوں سے آلودہ ہے تو آدمی اسے پاک صاف کرنا سیکھتا ہے اور اسے خداوند قدوس کے سامنے حاضری کے لائق بناتا ہے۔ اللہ کی پہچان، صاحب ذوالجلال والاکرام، براہ راست تجربہ کے ذریعہ، دوسری دنیا میں نجات، اللہ کی خوشنودی حاصل کرکے کامیابی و کامرانی، دائمی مسرّت کا حصول، صفائی اور پاکیزگی، دل کو صیقل کرکے اتنا شفاف بنانا کہ مقدّس چیزیں اپنا آپ ظاہر کردیں، غیر معمولی کیفیات ظاہر ہوجائیں اور انسان وہ کچھ دیکھنے لگے جو دوسروں سے پوشیدہ ہو۔''

''الحمدللہ۔'' معتقدین نے نعرہ لگایا۔

شیخ نے اپنا بیان جاری رکھا۔ ''تصوّف کوئی خاص قسم کی عبادت نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کے ساتھ دل لگانا ہے۔ اس دل لگانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان مقدّس قوانین کی پاس داری کرے اور ان سے رہنمائی حاصل کرے۔''

پھر شیخ ناظم نے میرے بھائی کو مخاطب کیا۔ ''اس دنیا سے ہوشیار رہو۔ یہ دنیا حاصل کرنا بے عزّتی کا سودا ہے اور دوسری دنیا یعنی، آخرت کا حصول عزّت اور انعام ہے۔ تم کیا چاہتے ہو بے عزّتی یا عزّت؟''

میرا بھائی جھینپ سا گیا۔ وہ کچھ نہیں بولا۔

''آج لوگوں کا مطمحِ نظر یہ ہے'' شیخ نے کہا ''کہ صفر اکٹھے کیے جائیں۔ مگر اس ساری

دولت کا مقصد کیا ہے؟ کیا آپ اللہ کو اپنی چیک بک دکھائیں گے؟ اللہ نے آپ کو اپنی عبادت اور خدمت کے لیے تخلیق کیا ہے۔ اس دنیا کی خدمت اللہ کے لیے نہیں ہے۔ مسلمان کی حیثیت سے ہمیں اپنا سارا وقت قرآن کریم میں اللہ کے کلام اور ان اشاروں پر توجہ مرکوز کرنے پر صرف کرنا چاہیے جو ہمارے اندر اس کی محبت پیدا کریں اور اس نے آخرت میں ہمیں جس انعام واکرام سے نوازنے کا وعدہ کیا ہے اس پر ہماری توجہ رہنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جن سزاؤں سے ہمیں ڈرایا ہے انہیں بھی ہر وقت ذہن میں رکھنا چاہیے تاکہ ہم صحیح راستے سے بھٹک نہ جائیں۔''

اب شیخ ناظم میری طرف متوجہ ہوئے۔ ''دنیا میں تین سانپ ایسے ہیں جو انسان کو ڈس لیتے ہیں۔ ایک ہے اپنے آس پاس کے لوگوں کے ساتھ ناروا داری اور بے صبری، دوسرے کسی ایسی چیز پر انحصار جسے آپ چھوڑ نہ سکیں اور تیسرے اپنی انا کے تابع ہونا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے مجھے غور سے دیکھا۔ کیا ان کی نظریں میرے اوپر والے ہونٹ پر جمی ہوئی تھیں؟ کیا میری بھاری بھاری مونچھیں کسی اور چیز کی چغلی کھا رہی تھیں؟ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ داڑھی منڈانا اور مونچھیں رکھنا تکبر اور بے صبرے پن کی نشانی ہے۔ بے صبرے تو درست ہے، میں پیدائشی طور پر ہی بے صبرا ہوں۔ مگر ناروا داری کا لفظ مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ میں تو اس ناروا داری سے بھاگ کر ہی یہاں آیا ہوں۔ یہی تو وہ کیفیت ہے جس سے مجھے نفرت ہے۔ اس کے بعد شیخ نے ایسی بات کہی جس نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔ انہوں نے کہا ''میں انسانی روحیں اکٹھی کرتا ہوں۔ انہیں اتنا صاف کرتا ہوں کہ انا کا نام ونشان تک مٹ جاتا ہے۔'' انہوں نے سانس لی اور پھر بولے۔ ''نوجوان سالک کے دماغ میں بے شمار باتیں بھری ہوتی ہیں۔ پہلے آپ کو ان تمام باتوں سے اپنا دماغ خالی کرنا پڑتا ہے جو آپ جانتے ہیں۔ اس کے بعد ہی آپ تصوّف کی راہ پر چل سکتے ہیں۔''

اب اچانک شیخ اٹھے اور خواتین کے حصے کی طرف چلے گئے۔ اٹھتے ہوئے انہوں اپنے ایک نائب کی طرف اشارہ کیا کہ اس سے آگے وہ ہم سے باتیں کرے۔ ظاہر ہے معلومات، علم اور دانش میں بہت فرق ہے۔ ہم بہت زیادہ معلومات سے الجھن میں پڑ جاتے ہیں اور ہمارا دماغ خلجان کا شکار ہو جاتا ہے۔ معلومات محض حقائق کا انبار ہوتی ہیں۔ علم حاصل ہوتا ہے معلومات کی چھان پھٹک کرنے سے، سوال کرنے سے، تجزیہ کرنے سے، معلومات کے درمیان

امتیاز کرنے، ان کا قرینہ جاننے اور نتیجہ اخذ کرنے سے۔ فہم ودانش وہ بصیرت ہے جو سوچ سمجھ کر اور بہتر طور پر اپنے علم کا استعمال کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ہر قسم کی معلومات اور علم سے اپنے دماغ کی تختی بالکل صاف کرلینا نہایت مشکل کام ہے۔ یہ خلا میں لمبی چھلانگ لگانا ہے حالانکہ اس کا مقصد بھی دانش کی ہی ایک قسم ہے۔ میں یہ چھلانگ لگانے کو تیار نہیں تھا۔ اب میں اپنے پرانے طریق کار پر اتر آیا اور سوال کرنا شروع کر دیئے۔ ان کا ایک عقیدت مند سابق انگریز ہپی تھا جو مسلمان ہوگیا تھا اور اب ان کے نائبین میں سے تھا۔ میں نے اس کی طرف رخ کیا اور کہا ''مجھے شیخ کے بارے میں کچھ بتاؤ۔''

''میں کہاں سے شروع کروں؟'' وہ بولا ''سیدھی سی بات یہ ہے کہ وہ دیانت دار انسانوں کے امام ہیں۔ تصوّف کا اسرار ہیں، جنہوں نے اللہ کی ہدایت اور پیغمبرانہ اصولوں کی پاسداری سے بیسویں صدی کے آخر میں نقشبندی سلسلے کا احیا کیا ہے۔ انہوں نے اس وقت مسلم قوم کے دلوں میں اللہ اور اللہ سے پیار کرنے والوں کی محبت پھونکی ہے جب ان کے دل آلام ومصائب، دہشت، طیش اور غم وغصے کی آگ اور دھویں سے سیاہ ہوچکے تھے۔ وہ اسرار کے پردے اٹھانے والے، روشنی کے محافظ، شیخ الشیوخ صوفیا کے سلطان، برگزیدہ انسانوں کے امام اور مردان حق کے شہنشاہ ہیں۔ بیسویں کے آخر میں وہ باطنی علوم کے بادشاہ ہیں جن کا کوئی ثانی نہیں۔ وہ اپنے سلسلے میں علوم کے سمندر سے آنے والی بارش ہیں جس سے دنیا کے تمام حصوں کے انسانوں کو روحانی تقویت حاصل ہورہی ہے۔ وہ ساتوں براعظموں کے ولی ہیں۔ ان کے انوار نے دنیا کے ہر خطے سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچا ہے۔ انہوں نے انوار الٰہی کا لبادہ زیب تن کررکھا ہے۔ وہ اس زمانے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ وہ حب اللہ کی زمین پر اگنے والا پھول ہیں۔ انہیں دو بازوؤں کا ولی اللہ کہا جاتا ہے۔ ایک بازو ہے ظاہری علوم کا اور دوسرا بازو ہے باطنی علوم کا۔ وہ اللہ کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہیں جو زمین اور آسمان پر محیط ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے رازوں میں سے ایک راز ہیں جو اس کی الوہیت میں ظاہر ہوتے ہیں اور اس کی ہستی میں موجود ہیں۔ وہ تختِ ہدایت کے مالک، شریعتِ الٰہی کو زندہ کرنے والے، راہِ صفا کے آقا، حق کے معمار، حلقے کے راہبر، اور سارے اسراروں کے غنائی شعر ہیں۔ وہ اولیاءاللہ کے آقا اور آقاؤں کے ولی اللہ ہیں۔ راہ حق کے مسافر ان کے انوار کے کعبے کا طواف کرتے ہیں۔ وہ ایسا فوآرہ ہیں جو ہر وقت چلتا رہتا ہے۔ اور ایسی آبشار ہیں جو ہمہ دم گرتی رہتی ہے۔ ایسا دریا ہیں جو ہر وقت طغیانی میں رہتا

ہے۔ایسا سمندر ہیں جو ہمیشہ لامحدود ساحل بناتا بگاڑتا رہتا ہے۔ وہ۔
''جی جی میں سمجھ گیا۔ میں سمجھ گیا۔'' جیسے ہی وہ سانس لینے کو رکا میں نے اسے ٹوکا۔ پہلی ملاقات میں میرے لیے اتنی معلومات ہی کافی تھیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب میرا خاندان کلیپ ٹن پونڈ سے وارک ایونیو کے ایک کونسل فلیٹ سے دوسرے کونسل فلیٹ میں منتقل ہوگیا تھا۔ اس علاقے کا جائزہ لینے کے لیے گھومتے پھرتے مجھے معلوم ہوا کہ برسٹل گارڈنز میں صوفیوں کا ایک گروہ اکٹھا ہوتا ہے۔ یہ جگہ ہمارے فلیٹ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ یہ اتفاق عجیب تھا جو کسی معجزہ سے کم نہیں تھا۔ میں چاہتا بھی تھا کہ شیخ ناظم کے پاس مجھے جن سوالوں کا جواب نہیں مل سکا وہ کہیں اور سے حاصل کرلوں۔ ایک گروہ کے طلسماتی رہبر عبد القادر تھے جنھوں نے وہاں اپنا زاویہ (فقیر کا تکیہ) کھولا ہوا تھا۔ میں وہاں پابندی سے جانے لگا۔ میرے سوا وہاں سب گورے ہی آتے تھے۔عبدالقادر سے میری پہلی ملاقات ۱۹۷۲ء میں ہوئی تھی جب وہ سیدھے سادے ایان ڈیلس تھے۔ایک اسکاٹ جو آئیر میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ کچھ عرصہ مراکش کے شہر فیض میں گزارنے کے بعد مسلمان ہوگئے تھے۔ وہ سلسلۂ درقویہ میں شامل ہوگئے تھے۔ انہوں نے اپنے مراکش کے تجربات پر مبنی ایک ناول بھی لکھا تھا۔ ناول کا نام تھا .The Book of Strangers اس کے غنائی انداز نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ ناول کا آغاز ہی ان ناقابل فراموش الفاظ سے ہوتا ہے۔'' آج میں چھوڑ رہا ہوں۔ میں چھوڑ رہا ہوں لائبریری، اپنا گھر، اپنے دوست، وہ شہر جہاں میں رہتا تھا۔نہیں جانتا میں کہاں جارہا ہوں۔ سب سے اجنبی، میں لائبریری چھوڑ رہا ہوں ایک کتاب حاصل کرنے کے لیے۔'' اس کے بعد اس میں ایک تلاش کا ذکر ہے، معنی کی تلاش اور علم کی تلاش جو ایک صوفی بزرگ سے ملاقات پر ختم ہوتی ہے۔ ناول کے کلیدی حصے میں مرکزی کردار کو ایک صوفی شیخ کے ساتھ طعام کی دعوت ملتی ہے۔ کھانا شروع ہوتا ہے۔ پہلے کی طرح یہاں بھی کھانا شروع کرنے کے لیے مجھ سے کوئی نہیں کہتا۔ میرے سامنے جو کھانا رکھا جاتا ہے وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بسم اللہ پڑھ کر میں کھانا شروع کر دیتا ہوں۔ کھانے کے درمیان میں اپنے اندر ایک حرارت سی محسوس کرتا ہوں۔ ایک گرمی سی ان بزرگ کے لیے جو میرے پہلو میں بیٹھے ہیں۔ یہ رغبت یا موانست نہیں ہے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ شدید، بہت ہی گہرا اور گمبھیر احساس قربت ہے۔ ایک پاکیزہ اور متبرک احساس۔ میں نے کچھ نہیں سوچا کہ میری سوچنے کی طاقت

سلب ہوچکی تھی۔ لیکن میرے اندر جو نیا شعور بیدار ہوا تھا اور جو لمحہ بہ لمحہ حرکت میں تھا، اس نے مجھ سے کہا کہ مجھے کھانا کھلا دیا گیا ہے۔ اب مجھے اپنے ساتھ بیٹھے شخص کو بھی کھانے میں شریک کرنا چاہیے۔ میں نے میز پر رکھے انگوروں میں سے سب سے اچھا گچھا اٹھایا اور اللہ کا نام لیتے ہوئے ان صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ ابھی میں نے یہ خوشہ رکھا ہی تھا کہ سیدنا شیخ نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور جو اس سے بھی اچھے انگور تھے وہ اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیئے۔ میں نے ان کی طرف دیکھا اور انگور اٹھا لیے۔ انہوں نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا اور اس نظر کی گہرائی میں میں نے دیکھا۔ ہر چیز جو میرے دماغ میں موجود تھی۔ روشنی کا ایک جھماکا، چکا چوند پیدا کردینے والا لمحہ جو شاید فرشتوں کی آوازوں سے بھر گیا تھا اور میرے پہلو میں بیٹھا آدمی اور کمرہ اور میز اور انگور جو لیے گئے اور اور انگور جو دیے گئے، وہ سب اس متبرک لمحہ میں محفوظ ہوگئے جو الفاظ سے ماورا ہے، جیسے سوتے جاگتے ہماری ہستی کا ہر لمحہ الفاظ سے ماورا ہے۔ سیدنا شیخ دیوان کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ جیسے ان کے بہت سے کاموں میں سے ایک کام اور پورا ہوگیا۔ میں ان کے ساتھ بے حس وحرکت بیٹھا رہا، آہستہ آہستہ ساحل کی جانب بہتا ہوا، لیکن بالکل بدلا ہوا، ایسا بدلا ہوا جو اب کبھی ویسا نہیں ہوگا جیسا پہلے تھا۔ کھانا ختم ہو چکا تھا۔"

اس ناول سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ عبدالقادر بھی میری طرح کسی تلاش میں تھا اور جو اب کسی غیر معمولی شخصیت سے ملاقات کے بعد گہری بصیرت حاصل کر چکا ہے۔ میں نے سوچا شاید میں بھی اس سے وہ سیکھ سکوں جو اس نے سیدنا شیخ سے سیکھا ہے چنانچہ میں بھی صوفی سلسلہ حبیبیہ میں شامل ہوگیا۔ اس سلسلے کے ارکان فقرا کہلاتے تھے۔ اب میں ہر جمعرات کو ذکر کی محفل میں شریک ہونے لگا۔

محفل عبدالقادر کے خطاب سے شروع ہوتی تھی۔ عام طور پر وہ ایک سوال سے اپنی بات شروع کرتے۔ یہ طریقہ میرے مزاج اور میری فکر سے زیادہ مطابقت رکھتا تھا۔ مادّہ کیا ہے؟ شکل کیا م ہے؟ درخت اپنی اصل شکل ختیار کرنے اور اکھوا بننے سے قبل کیا تھا؟ انسان کیا ہے؟ ہم کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جارہے ہیں؟ خوابوں کے تجربہ کی نوعیت کیا ہے؟ موت کا عمل کیا ہے؟ جن کیا ہیں؟ کیا فرشتے ایک استعارہ ہیں یا حقیقت ہیں؟ ان میں سے ہر سوال کا جواب غیر مرئی دنیا سے آتا ہے۔ عبدالقادر کہتے "سچے مومن اور جدید دور کے مسلمان کا فرق پہچانو۔" جدید دور کے مسلمان نے اپنے اوپر غیر مرئی دنیا کے دروازے بند کرلیے ہیں۔ اس کا

ذہن صاف نہیں ہے، وہ اس دنیا میں پھنسا ہوا ہے، وہ ''اپنے اسلام'' پر غرور کرتا ہے۔ اس کے وجود کی تجرباتی حقیقت سے جلال و جمال کی شعاعیں نہیں پھوٹتیں۔ اس کے برعکس مومن کا دل و دماغ غیر مرئی دنیا کے لیے کھلا ہوتا ہے۔ اس لیے وہاں ایک خاص قسم کی شفافیت ہوتی ہے، ایک قسم کی روشنی جو اس حقیقت کے ادراک سے پیدا ہوتی ہے کہ ہم غیر مرئی دنیا کے اسرار میں گھرے ہوئے ہیں۔'' ہمیں بتایا گیا کہ جدید مسلمان وہ علم الیقین کھو چکا ہے جس کی بنیاد غیر مرئی حقیقت پر ہے۔ آج کا مسلمان اپنی فطرت سے متصادم ہوکر دنیوی آسائشوں کی تلاش میں کھو چکا ہے۔ اس میں غیر مرئی حقیقت، انسانی تخلیق کے اسرار، فرشتوں اور جنات کی دنیا اور اشکال کی ماہیت کا احساس ہی ختم ہو چکا ہے۔ آج کے مسلمان کو اپنے اندر کی دنیا ایسی دبانی پڑگئی ہے کہ وہ اپنے آپ سے ہی بے گانہ ہوگیا ہے۔

خطاب کے بعد عشاء کی نماز پڑھی جاتی۔ نماز کے بعد وہ مرید جو درتویہ سلسلے میں شامل ہوجاتے تھے بڑا ورد شروع کرتے تھے۔ یہ ورد اس سلسلے کا متبرک اور خفیہ ذکر تھا اس کا مقصد تزکیۂ روح اور حقیقتِ تامہ کے ساتھ یکجا ہوجانا تھا۔ کبھی کبھی وہ چھوٹا ورد بھی کرتے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اے اللہ ہم تجھ سے جوہر کے راز اور راز کے جوہر کے وسیلے سے مانگتے ہیں۔ وہ تو ہے اور تو وہ ہے۔ میں نے اللہ کے نور اور عرشِ معلّیٰ کے اور اللہ کے تمام اسماء حسنہ کے نور کے پردے میں اپنے آپ کو اپنے اور اللہ کے دشمنوں سے چھپا لیا ہے۔ ''اللہ کے سوا کوئی قادر مطلق نہیں ہے'' کا ایک ہزار ورد کرنے سے میں نے اپنی ذات، اپنے دین اور ہر اس چیز پر اللہ کی مہر لگادی ہے جو مجھے اللہ نے دعطا کی ہیں۔ ہمارے لیے اللہ ہی کافی ہے۔ وہی ہمارا سب سے بڑا رہبر ہمارا محافظ اور ہمارا پروردگار ہے۔ درود وسلام ہمارے آقا محمد ﷺ اور آل محمدؐ اور تمام صحابۂ کرام پر۔ الحمد للّٰہ رب العلمین۔

جوں جوں ورد میں تیزی آتی جاتی ویسے ہی مریدوں کی روحانی نبض تیز ہوتی جاتی۔ اسی دوران میں کوئی مرید لحن کے ساتھ شیخ کی مدح میں منقبت پڑھنا شروع کردیتا۔ ان کے مریدوں میں اکثر موسیقار تھے۔ ان میں رچرڈ ٹامپسن تھا جو میوزیکل گروپ فیئر پورٹ کونشن کے ساتھ گاتا تھا۔ ایان وائٹ مین مائٹی بے بی اور روجر پاویل دی ایکشن گروپ کے ساتھ گاتا تھا۔ پیٹر سینڈر فوٹوگرافر تھا جس کی بہت ہی سریلی آواز تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ زاویہ سریلی آوازوں کا گڑھ تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں فقرا پر وجد طاری ہوجاتا۔ وہ سب کھڑے ہوجاتے اور ایک

دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر ایک دائرہ بنالیتے۔ ان کے درمیان ایک مرید کھڑا ہوتا اور وہ لا الہ الااللہ کے ورد پر گول دائرے میں گھومنا شروع کر دیتے۔ لا الہ الا اللہ۔ لا الہ الا اللہ۔ وہ لا الہ کے ورد کے ساتھ سانس اندر کھینچتے اور پھر الا اللہ کہہ کر سانس باہر نکالتے۔ یہ ورد آہستہ آہستہ تیز ہوتا جاتا اور اس کے ساتھ ہی ان فقرا کا آگے پیچھے گھومنا بھی تیز ہوتا جاتا۔ جب یہ ورد اپنی معراج کو پہنچتا تو زاویہ کے در و دیوار لا الہ الااللہ کی گونج سے لرزنے لگتے۔ اس وقت فقرا پوری طرح وجد کی حالت میں ہوتے آخر میں چھیاسٹھ بار اللہ کا ورد کیا جاتا اور اس کے ساتھ ہی جوش وخروش میں چور فقرا تھک کر مکمل سکون کی حالت میں چلے جاتے۔ پورے ماحول پر سکون طاری ہوجاتا۔

یہ ایک انتہائی مسحور کر دینے والا عمل تھا اور مجھے لگا کہ وجد کی کیفیت خود عبدالقادر پر ہی سب سے زیادہ طاری تھی۔ انہوں نے اعلان کیا کہ انہیں اس عمل کے لیے ان کے گرو مراکش کے شیخ محمد فائتوری حمودہ کا ''اذن'' حاصل ہے۔ انہوں نے کہا ''ان کے اذن سے ہی میں نے سلسہ دارقویہ کی دو شاخوں حبیبیہ اور علویہ کو یک جا کر دیا ہے۔'' اب عبدالقادر مغرب میں اس سلسلے کے مقدم یا نمائندہ تھے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ ''اللہ نے انہیں ان فنون اور ان اسرار کا رازداں بنایا ہے جن کے امین صرف حضرت محمد ﷺ تھے۔ اس کے اعتراف میں ان کا اپنا نام شیخ عبدالقادر الصوفی رکھا گیا ہے۔''

اب مریدوں کو حکم دیا گیا کہ وہ غیر مرئی پانی سے اپنے آپ کو پاک صاف کرلیں۔ ان کے دلوں کو اس مرض سے پاک کرنا ضروری تھا جس نے ان کے اور غیر مرئی طاقت کے درمیان پردہ ڈال دیا ہے۔ پاک ہونے کے لیے شیخ عبدالقادر کی دست گیری ضروری تھی جو تمام غلطیوں سے پاک تھے۔ وہ مخفی علوم کا پانی اپنے مریدوں پر ڈال رہے تھے۔ غیر مرئی قوت کی موجودگی اس پانی کی پھوار مریدوں کے دلوں پر ڈال رہی تھی۔ جن لوگوں نے اس قسم کے پانی سے پاک ہونے سے انکار کردیا ہے وہ شیخ کی کرامات کو سمجھنے کی بصیرت سے محروم ہیں۔ ان دنوں عبدالقادر برسٹل گارڈن کمیونٹی کے غیر مشروط آقا مانے جاتے تھے۔ وہ اپنی خاتون مریدوں کے لیے شوہروں کا انتخاب کرتے، اپنے مرد مریدوں کو حکم دیتے کہ اپنی بیویوں کو طلاق دے دو۔ یعنی وہ اپنے مریدوں کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اختیار رکھتے تھے۔

مجھے اس کام میں ایک خاص قسم کا نمونہ نظر آیا۔ یہ نمونہ یا سانچا صرف صوفی نمونہ نہیں تھا۔ یہ ایک عام سا طرز عمل تھا۔ جب بھی کسی پیاسی روح کو سکون قلب کی تلاش ہوتی اس قسم

کے صوفی یا سادھو انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیتے۔ گانے والے بیٹل مہارشی کی طرف متوجہ ہوئے اور اورنج انرجی بریگیڈ راجنیش کے چیلے بن گئے۔ نشے میں چور مخبوط الحواس لوگوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی اور جب بھی روحانی سکون کے متلاشی ان لوگوں نے یہ راہ اختیار کی ان کی زندگی اپنے گرو کے تابع ہوگئی۔ یہ زمانہ تھا جب طرح طرح کے ہندوستانی سادھو روحانی سکون کے متلاشی ان مغربی نوجوانوں سے لاکھوں کروڑوں ڈالر اور پاؤنڈ کما رہے تھے۔ گرو اور سادھوؤں کا یہ مرض عام وبا کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ قصور خود مریدوں اور چیلوں کا تھا، مرشدوں یا سادھوؤں کا نہیں تھا۔ لیکن مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ تصوف اور سادھو سنتوں کے اس پورے عمل میں ہی کوئی خرابی تھی۔

اور مجھے اس مرض کی تشخیص کے لیے اپنے گھر جانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ جس وقت میں شیخ عبدالقادر سے مانوس ہونے کی کوشش کر رہا تھا اس وقت میرا بھائی شیخ ناظم کے پاس جا رہا تھا۔ تھوڑی ہی عرصے بعد اس نے شیخ ناظم کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس نے ان کے پاس جانا شروع کیا۔ پہلے تو وہ ہفتے میں ایک دو بار ہی جاتا تھا۔ پھر وہ ہر روز ہی جانے لگا۔ شیخ کی ہدایت پر اس نے اپنی اکونومسٹ کی اچھی خاصی ملازمت چھوڑ دی اور بڑھئی کا کام شروع کر دیا۔ شیخ نے کہا تھا کہ اپنے ہاتھ سے کام کرنا زیادہ اچھا ہے۔ میرے بھائی نے شیخ کی ہدایت پر ہی ایک عورت سے شادی کر لی اور شیخ نے ہی اس کے بچوں کے نام رکھے۔ وہ اپنی عام زندگی سے کنارہ کش ہوگیا۔ اب اس کی ساری زندگی شیخ کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے برعکس میری روح کسی ''پیاسی ارواح جمع کرنے والے'' کے لیے نہیں تھی۔ میں اپنا دماغ خالی کرنے کے بجائے جہاں تک ممکن تھا اسے اور بھی علم اور تجربے سے بھرنا چاہتا تھا۔ میں علم کی جستجو میں مشاہدہ کر رہا تھا اور پڑھ رہا تھا۔

سب جانتے ہیں کہ کتابوں کا مطالعہ خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔ خاص طور سے اس وقت جب مطالعہ کرنے والا اپنے آپ کو تمام غلطیوں سے پاک سمجھتا ہو۔ یہ خیال مجھے اس وقت آیا جب مجھے معلوم ہوا کہ عبدالقادر نے ایک نئی کتاب دریافت کی ہے۔ وہ اسلامی کتابوں کی تلاش میں مراکش کے بازاروں میں گھوم رہا تھا کہ اس کی نظر ایک کتاب پر پڑی جو رسول کریم ﷺ کی سیرت پر تھی۔ اس کتاب کے مصنف تھے قاضی عیاض۔ عبدالقادر کا بیان ہے کہ اس کتاب نے انہیں بہت ہی متاثر کیا۔ کیونکہ دو ہزار سال میں مختلف مصنفوں نے اسلام کی جو مسخ شدہ

تصویر پیش کی تھی یہ کتاب اس سے مختلف تھی۔ ان کا بیان تھا کہ اس میں ''یہودیوں کے ساتھ رواداری برتنے والے مغربی اسلام'' کے مقابلے میں صحیح اور سچا اسلام پیش کیا گیا تھا۔ اس کتاب میں مالکی مسلک کی اہمیت بیان کی گئی تھی۔ عبدالقادر کا اصرار تھا کہ مالکی مسلک کی پیروی کرنے سے ان کے عقیدت مند عربی بولنے والے مسلمان بن گئے۔ انہوں نے کہا کہ دوسرے تمام مسلک بدعت ہیں جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اس مسلک سے اختلاف صرف یہودی یا کافر ہی کرسکتے ہیں۔ چنانچہ اس کتاب کی دریافت کے بعد انہوں نے اپنا نام شیخ عبدالقادر الصوفی الماالکی رکھ لیا۔

برسٹل گارڈن کی برادری میں جھگڑے شروع ہو چکے تھے۔ مالکی مسلک کی جو تشریح عبدالقادر کررہے تھے وہ جعفر شیخ ادریس کی تشریح سے مختلف تھی اور میں جس تشریح سے واقف تھا وہ اس سے بھی نہیں ملتی تھی۔ میں نے عبدالقادر کا حلقہ چھوڑ دیا اور ایک فاصلے سے ان کا جائزہ لینے لگا۔ یعنی میں ان سے جتنا دور ہوسکتا تھا ہوگیا۔

اب میرے سامنے سوال ہی سوال تھے۔ میں فیض کے شیخ الحبیب کے بارے میں سوچ کر پریشان ہوتا تھا جنہوں نے عبدالقادر کو اس طرف لگایا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ کیا آمریت اور مطلق العنانی تصوف کا لازمی حصہ ہیں؟ چنانچہ میں نے خود ہی فیض جانے کا فیصلہ کرلیا۔

میں فیض کے ایک قدیم محلے میں ہوٹل پیلیس جماعیس میں ٹھہرا۔ یہ ہوٹل شہر کے بلند ترین علاقے میں واقع ہے۔ وہاں سے پورا شہر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ سفید سرخی مائل براؤن دیواروں کے بیچ سرسبز درختوں میں سے ابھرتے سفید مکان یہاں سے وہاں تک پھیلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ فصیل کی دیواریں اگرچہ بوسیدہ ہوگئی ہیں اس کے باوجود ان میں صدیوں پرانی استقامت اور خوبصورتی کی جھلک اب بھی نظر آتی ہے۔ فیض شہر آٹھویں صدی میں آباد ہوا تھا لیکن دوسرے تمام قدیم اسلامی شہروں کے مقابلے میں اس کا پرانا حسن آج بھی برقرار ہے۔ جس ٹاؤن پلاننگ کے تحت یہ شہر بسایا گیا تھا وہ قریب قریب ختم ہی ہوچکی ہے۔ اس پلاننگ میں بہتے پانی کا خاص مقام تھا۔ اس کی وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ مسلمان خشک اور بنجر علاقوں سے ابھرے تھے بلکہ پانچوں وقت کی فرض نمازوں کے لیے جو وضو کیا جاتا ہے اس کے لیے بھی پانی ضروری ہے۔ فیض کی یہ جگہ یقیناً دریا کی قربت کی وجہ سے منتخب کی گئی ہوگی۔ لیکن یہ شہر اس زمانے کی مسلم دنیا کے دوسرے شہروں کے درمیان تجارت کے لیے رابطے کا کام بھی دیتا تھا۔

اپنے تاریخی دور میں فیض تہذیب و ثقافت کا مرکز تھا۔ دوسرے مسلم شہروں کی طرح اس شہر کا قلب بھی پناہ گاہ کا کام دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی شہر کا سب سے بڑا بازار ہے۔ اس شہر نے میرے اوپر جادو سا کر دیا تھا۔ میں قدیم اور جدید تاریخ کے لبادے میں لپٹا بازاروں میں گھوم رہا تھا۔ یہاں نئی اور پرانی کائنات اکٹھی ہوگئی تھی۔ قدیم اور جدید یک جا ہو گئے تھے۔ تصوف اور روحانیت اس شہر کے در و دیوار سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اس لیے اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ دنیاوی الجھنوں سے بیزار حق کی تلاش کرنے والے لوگ ساری دنیا سے اس کی طرف اُمڈے چلے آتے ہیں۔ اور مغربی دنیا کی دم گھوٹنے والی فضا سے نجات حاصل کرنے کے لیے مستشرقین اس شہر کا رخ کرتے ہیں۔ یہ زمانہ پال بولز* اور اس کے گروہ کا تھا۔

مجھے شیخ الحبیب کو تلاش کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ فوراً میں ان سے ملوں اور ان کی دعائیں حاصل کروں۔ میں ذرا فاصلے سے ان کا اور ان کے پیروکاروں کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ میں شام کو ان کے زاویہ (مرکز یا تکیہ) چلا جاتا اور ان کے ساتھ نماز پڑھتا اور انہیں دیکھتا۔ کبھی کبھی کوئی مجھ سے کہتا کہ میں ان کے قریب بیٹھ جاؤں، یا ان سے بیعت کرلوں اور ان کا مرید بن جاؤں۔ مگر میں کہتا کہ ابھی میں اپنے آپ کو اس لائق نہیں سمجھتا۔ دن کے وقت میں بازاروں میں گھومتا پھرتا۔ ایک دن میں نے مدینہ بازار میں ایک آدمی کو دنبے کے سینگوں سے کنگھیاں بناتے دیکھا۔ میں سڑک کے اس پار ایک کیفے میں بیٹھا پودینے کی چائے پی رہا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ وہ کیسے سینگ کو چھیل کر اس سے کنگھیاں بنا رہا ہے۔ اسے احساس تک نہیں تھا کہ کوئی اسے دیکھ بھی رہا ہے۔ وہ اپنے کام میں پوری طرح کھویا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے دیکھتے مجھے احساس ہوا کہ اپنے کام میں مگن ہو کر وہ روٹی روزی ہی نہیں کما رہا ہے بلکہ وہ اس طرح ذکر الٰہی میں بھی مصروف ہے۔ وہ اسمائے حسنہ کا ورد نہیں کر رہا ہے اور نہ وہ درویشوں کی طرح اللہ ہو کے نعرے لگاتا ہوا رقص کر رہا ہے۔ وہ اپنے اردگرد سے بے خبر صرف اپنی ذات میں مگن ہے۔ وہ اور اس کا فن ایک ہو گئے ہیں۔ یہ ایک قدیم مشرقی تصویر ہے۔ ایک کھوئی ہوئی دنیا۔ ایک ایسی دنیا جسے سیاحوں کو راغب کرنے کے لیے کتابچوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ وہ دنیا جو زندہ ہے اور ایک زندہ تجربہ بھی بن چکی ہے۔ اس ایک لمحے کو دوام

---

*......(پال بولز امریکی مصنف تھا جس نے مراکش کے مشہور داستان گو محمد مرابط کی زبانی داستانوں کو انگریزی میں منتقل کیا۔ مترجم)

حاصل ہو گیا ہے اور تراشنے اور چھیلنے کا یہ عمل ساری کائنات پر محیط ہو چکا ہے۔ جب ایک کاریگر اپنی ایگو، اپنی انا اور اپنی ذات کو اپنے فن میں ضم کر دیتا تو یہ فنا کا لمحہ ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو فنا کرنے کا وہ عمل جس کا ذکر زاویہ میں شیخ کے مرید کرتے ہیں۔ صوفی فلسفے کے مطابق اگر شعور کی یہ حالت۔ جسے ٹی ایس ایلیٹ ''وقت کے اندر اور باہر کا لمحہ'' کہتا ہے۔ تخلیق کی غرض اور ناقابل تخفیف انسانی تجربہ ہے تو اسے ہر انسان کے اندر موجود ہونا چاہیے۔ خدا جو واقعی خدا ہے ہر شخص کے لیے یکساں مواقع پیدا کرتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو پھر وہ خدا نہیں ہے میں جسے مانتا ہوں۔ اس کی تلاش کا راستہ طویل نہیں ہے اور وہ کسی پیر فقیر کے قدموں تک نہیں لے جاتا بلکہ وہ انسان کو اس کے اپنے اندر لے جاتا ہے۔

اچانک میرے اوپر انکشاف ہوا کہ یہ تو تقلیب کا عمل ہے۔ جو کچھ یاد کیا ہے اسے بھلانے کا عمل۔ صوفی مسلک آسان چیزوں کو اور بھی مشکل بنا کر پیش کرتا ہے۔ اسے ایک مخصوص زاویہ سے پیچیدہ اور محدود بنا کر۔ اپنے لیے مخصوص دائرہ کھینچ کر اور دوسروں کو اس سے الگ کر کے۔ یہاں میں ایک شخص کو عزت کے ساتھ اپنی روزی کماتے دیکھتا ہوں۔ یہ عزت و عظمت اس کے فن اور اس کے عمل میں موجود ہے اور اس سے اس کا سارا ماحول روشن ہے۔ میں نے سوچا کہ عنایت خداوندی حاصل کرنے کے لیے ضروری نہیں ہے ہم اپنی جدید دنیا ترک کر دیں۔ بلکہ عنایت خداوندی کے احساس کو وہاں لے جائیں جہاں ہم ہیں اور جہاں ہمارے جیسا ماحول ہے۔ اس آدمی کی کاری گری کو اس مقام پر وہ شرف حاصل ہے تو وہ شرف لیوٹن کی فیکٹری میں کیا نہیں کر سکتا۔ یہاں فیض میں یہ کاری گر اور اس کا فن ایک وحدت ہیں۔ لیوٹن میں ہر شخص نے یہ طے کر لیا ہے کہ یہ بات ناممکن ہے اور میرے خیال میں یہی ایک فرق ہے۔ اس صورت میں صرف وہی شیخ پیروی کے لائق ہے جو یہ نہیں جانتا کہ وہ شیخ ہے۔ جو اپنے مریدوں کی تلاش میں نہیں رہتا اور جو اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے اسے اپنی عبادت بنا لے۔

میں مٹر گشت کرتا رہا۔ آخر قالینوں کی ایک دکان پر پہنچ گیا۔ یہ ایک بہت بڑا روایتی مکان تھا، کھلا صحن اور قالینوں سے بھرا ہوا۔ دکاندار نے مجھے قالین دکھانا شروع کیے۔ میں یونہی دیکھتا رہا۔ دکان کے سامنے ایک فوارہ تھا جس میں رنگین ٹائل لگی ہوئی تھیں جن سے خوبصورت اقلیدسی پیٹرن بنائے گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک حمام تھا جو بھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

سامنے پتھروں سے بنی دو نالیاں نظر آرہی تھیں جو مشکل سے ساٹھ سنٹی میٹر چوڑی ہوں گی۔ان میں سے ایک میں دریا کا پانی حمام تک جاتا تھا اور دوسری میں استعمال کیا ہوا پانی حمام سے باہر آرہا تھا۔ اس کام کے لیے کشش ثقل کے اصول سے کام لیا گیا تھا۔ پانی بہنے کی آواز اس مدرسے کے بچوں کے آواز میں ڈوب گئی تھی جو قریب قرآن پڑھ رہے تھے۔

مدرسے کے ساتھ کتابوں کی دکان تھی۔ میں دکان کے اندر گیا اور کتابیں دیکھنے لگا۔ قدیم قلمی نسخوں کے ساتھ عربی کی جدید کتابیں شیلفوں میں ٹھنسی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک قلمی نسخہ اٹھایا اور اس کے بارے میں دریافت کیا۔ ''یہ انسانی وجود اور کاری گری پر ایک مقالہ ہے جو میرے والد نے لکھا تھا اور انہوں نے خود ہی اس کی کتابت کی تھی۔'' نوجوان دکاندار نے کہا۔ اس کے سر کے بال جوانی میں ہی سفید ہونے لگے تھے۔ وہ کتابوں میں گھرا ہوا اپنے گرد و غبار سے بھرے کیبن میں بیٹھا تھا۔ ''وہ اپنے فن کے ماہر تھے اور بہت ہی مذہبی انسان تھے۔''

''آپ بھی خطاطی کرتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں تصوف کی مابعد الطبیعیات پر کام کر رہا ہوں۔ آپ دیکھنا پسند کریں گے؟''

اس نے نامکمل مسودہ نکالا اور مجھے دے دیا۔ نہایت مہارت کے ساتھ خطاطی کی گئی تھی۔ میں اس کی خوبصورتی میں ایسا کھویا کہ یہ دیکھنا ہی بھول گیا کہ کیا لکھا ہے۔ ''آپ پہلے نوٹس تیار کرتے ہیں پھر لکھتے ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''جی نہیں۔ سب کچھ میرے دماغ میں ہے۔ میں تو بس اس کی کتابت کرتا ہوں۔''

''کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ اسے چھپوا لیا جائے؟'' میں نے پوچھا۔

''بہتر تو یہی ہوگا مگر پھر میرے دادا پردادا کا خطاطی کا فن کون زندہ رکھے گا۔''

میں مسکرایا اور ہاتھ بڑھا کر وہ مسودہ اس کے حوالے کر دیا۔ میں دکان میں گھومتا رہا۔ ابھی میں باہر جانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے چھت سے لٹکتی رسّی دونوں ہاتھوں سے پکڑی اور کھڑا ہو گیا۔ پھر وہ کتابوں کے ڈھیر اور الماریوں سے بچتا بچاتا عین میرے سامنے آ کھڑا ہوا اور ابھی وہ سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ اس نے ایک چھوٹا سا مخطوطہ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں اس کی اس پھرتی سے بہت متاثر ہوا۔ لیکن اس مخطوطے کی دلکشی نے تو مجھے مبہوت ہی کر دیا۔ یہ رسول کریمؐ کی سیرت پر چمڑے کی جلد کی ہوئی مرصع کتاب تھی۔ میری نظریں اس کتاب سے نہیں اٹھ رہی تھیں۔

"یہ آپ کے لیے ہے۔" سفید بالوں والے نوجوان خطاط نے کہا۔ "آپ کی جو مرضی ہو اس کا دے دیجیے۔"

میں نے اسے خرید لیا اور دکان سے باہر آ گیا۔ پھر میں سڑکوں اور گلیوں میں انسانوں اور جانوروں کے ہجوم سے بچتا ہوا بازاروں کے چکر لگانے لگا۔ وہاں صنوبر کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اب میں کبھی دھات کے برتنوں کی دکان کے پاس جاتا جہاں درجنوں کاریگر کام کر رہے تھے تو کبھی کسی فندق' یا سرائے' کے باہر جہاں ہزاروں سال سے تھکے ماندے مسافروں کے ٹھہرنے کا بندوبست کیا جا رہا تھا اور کبھی مٹی کے برتنوں کی دکان کے سامنے کہیں بیٹھ کر چائے پی رہا ہوتا اور خوبصورت نقاشی والے برتن دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا ہوتا۔ آخر میں ایک گھر میں گھس گیا۔ یہ بھی قالینوں کے ایک تاجر کا مکان تھا۔

نہایت دلکش ڈیوڑھی کے پار ایک چھوٹا سا صحن تھا۔ اونچی اونچی چھتوں والے کمروں کے دروازے دیدہ زیب منقش لکڑی اور ٹائلوں سے سجائے گئے تھے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے لگا جیسے میں نویں صدی کے مراکش میں آ گیا ہوں۔ لیکن فوراً ہی میرا یہ خواب ٹوٹ گیا۔ سامنے دیوار پر لکھا تھا۔ یہاں ویزا کارڈ قبول کیے جاتے ہیں۔ میں نے مراکشی قالین تو نہیں خریدے البتہ نوجوان دکان دار سے، جو مقامی یونیورسٹی میں پڑھتا تھا، پوچھا کہ شہر میں پانی کا نظام کیسے کام کرتا ہے میں وہاں کی خوبصورتی سے اتنا متاثر نہیں ہوا تھا جتنا پانی کی فراہمی اور نکاس نے مجھے حیرت زدہ کر دیا تھا۔

آپ جانتے ہیں" اس نے کہا "فیض دو مختلف سطح کے میدانوں کے درمیان واقع ہے۔ اونچے میدان میں کئی چشمے ہیں۔ ان کا پانی شہر بھر میں آتا ہے۔ چونکہ وادی پیالے کی طرح ہے اس لیے وادی کی بلند ترین سطح سے چشموں کا پانی پورے شہر میں پہنچانا ممکن ہو گیا۔ اس وادی میں زمین کے اوپر اور زیر زمین نہریں نکالی گئی ہیں جن کے ذریعہ یہ پانی شہر کے ہر حصے تک پہنچایا جاتا ہے۔ ان نہروں سے ایسے چھوٹے چھوٹے حوض بنائے گئے ہیں جو ہر گھر کو پانی پہنچاتے ہیں۔ استعمال شدہ پانی کے لیے بھی ایسے ہی حوض بنے ہوئے ہیں۔ یہاں سے وہ پانی پھر نہروں میں چلا جاتا ہے اور وہاں سے ایک خاص مقام پر اس کا نکاس ہو جاتا ہے۔ آپ اسے ایسا سمجھ لیں جیسے انسان کے جسم میں گردش کرنے والے خون کی رگیں اور وریدیں۔" میں نے سوچا۔ دیکھ لو یہ پلمبنگ بھی انسانی ذہن کو کیسے جھنجوڑتی ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ خوبصورتی اور دانش

مندی صرف آرٹ میں ہی ہوتی ہے تو آپ کو اپنے خیال پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔ آرٹ کی درد مندی اور خوبصورتی سائنس میں بھی موجود ہے۔ یہاں بھی یونی فائیڈ فیلڈ کی تھیوری سامنے آتی ہے۔ اگر وہ یہاں فیض میں موجود تھی اور آج بھی موجود ہے تو جدید سائنسی دنیا میں وہ اور کہیں موجود کیوں نہیں ہوسکتی۔

تصوّف میں اس سے آگے بھی کچھ ہونا چاہیے کہ آپ اپنے آپ کو اپنے مرشد کی رضا کے حوالے کردیں۔ میں نے سوچا میں ابھی تک چشموں اور ان کی نہروں سے ہی اپنی پیاس بجھا رہا ہوں، مجھے دریا کے دہانے پر جانا چاہیے۔ شاید مجھے قونیہ میں سکون مل جائے۔ قونیہ ترکی کے مشہور صوفی، ولی اللہ اور شاعر جلال الدین رومی کا شہر ہے۔ یہ صوفی طرزِ فکر کا مرکز ہے اور روزِ ازل سے جاہ وجلال اس کے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے۔ یقیناً یہی وہ مقام ہے جہاں میں اپنے اندر کی دنیا دریافت کرسکتا ہوں۔ چنانچہ چند ہفتے بعد میں جہاز سے استنبول کے راستے قونیہ پہنچ گیا۔ میں نے جیسا سوچا تھا قونیہ مجھے ایک پر سکون لیکن روحانی طور پر فعال شہر لگا۔ البتہ وہاں ہلکا سا افسردگی کا رنگ بھی تھا۔ قدیم کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قونیہ پہلا شہر تھا جو طوفان نوح سے باہر آیا تھا۔ یہاں واقعی شہر کی قدیم تاریخ جیتی جاگتی نظر آتی ہے۔ میں تو یہ بھی ماننے کو تیار ہوں کہ فرعون رامیسیس دوئم نے اپنی ایک بیٹی کی شادی اس شہر میں کی تھی اور حضرت عیسیٰؑ کے حواری بارنباس اور ان کے چیلے ٹموتھی نے یہاں بائبل کی تعلیم دی تھی اور یہ کہ اس شہر اور اس کے نواح میں ہی پہلی عیسائی آبادیاں قائم ہوئی تھیں اور پہلی عیسائی مجلس بھی یہاں ہی منعقد ہوئی تھی۔ لیکن اس کے لیے آپ کو تاریخ کھنگالنا پڑے گی۔ رومی کے زمانے کا قونیہ ہمارے سامنے ہے۔ مثنوی کے مصنف نے لکھا ”قونیہ میں حاکموں، رئیسوں اور اشراف کے ہزاروں مکان، قلعے اور محل ہیں۔ تاجروں اور سوداگروں کے مکان کاریگروں کے مکانوں سے زیادہ شاندار ہیں۔ امیروں کے محل سوداگروں کے مکانوں سے زیادہ شاندار ہیں اور سلطان کے قلعے اور گنبد دوسروں کے مقابلے میں بہت ہی عالیشان ہیں۔

مولانا رومؒ نے جن یادگاروں کا ذکر کیا ہے ان میں سے چند میں نے بھی تلاش کرلیں۔ علاؤالدین کیقباد کے محل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ الف لیلہ کے الہ دین کا گھر یہی تھا۔ اب اس کی صرف ایک دیوار باقی رہ گئی ہے۔ لیکن شہر کی فصیل کے اندر صحیح معنی میں ارفع واعلیٰ مجد جس کے ساتھ رومی کا نام نامی منسوب کیا جاتا ہے اسی طرح محفوظ ہے۔ شہر کی شان و

شوکت کا اندازہ اس میوزیم سے کیا جاسکتا ہے جسے مولوی میوزیم کہا جاتا ہے۔ اس میں بڑے بڑے ہال ہیں۔ کھلے صحن ہیں اور مقبرے ہیں۔ ان میں ہی رومی کا مقبرہ بھی ہے، سبز مقبرہ۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس زندہ جاوید تاریخ کو میوزیم کیوں بنا دیا گیا ہے اور اسے مردہ کیوں قرار دیا جاتا ہے؟ جیسے الف لیلہ جیسی جیتی جاگتی اور رنگ بدلتی داستانوں کو منجمد اور متحجر متن میں بند کردیا گیا ہے اسی طرح رومی کے ورثہ کو بھی تاریخ میں بند کر کے اسے الگ تھلگ اور تنہا کر کے میوزیم بنا دیا گیا ہے۔ اب ایک بار پھر میں ایک اور طریقے سے تصوّف کے بارے میں پریشانی کا شکار ہو رہا تھا۔ رومی خود بھی کسی مقبرے میں بند کیے جانے کے خلاف تھے۔ جب انہوں نے سنا کہ ان کے ماننے والے ان کے لیے کوئی مقبرہ بنانا چاہتے ہیں تو انہوں نے انہیں تنبیہ کی۔ ''آسمان سے بہتر مقبرہ اور کیا ہوسکتا ہے۔'' لیکن ۱۷ دسمبر ۱۲۷۳ء کو جب ان کی وفات ہوئی تو ان کے بیٹے نے مقبرہ بنانے کی اجازت دے دی اور ایرانی ماہرِ تعمیرات بدرالدین نے چار ستونوں پر جنہیں فیل پا کہا جاتا ہے، مقبرہ تعمیر کیا۔ اس کے بعد کئی سلطان اور حکمراں اس میں اضافے کرتے رہے۔

میں بابِ درویش سے اندر داخل ہوا۔ وہاں دونوں جانب حجرے تھے جن میں کبھی تصوّف کی مختلف منازل طے کرنے والے رہتے ہوں گے۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ خانقاہ تھی۔ رومی کی قبر فیروزی رنگ کے گنبد کے نیچے ہے جس کے چاروں جانب سبز ٹائلوں کی چھت ہے۔ ان کی لحد اونچے سے چبوترے پر ہے جس کے گرد نیچا سا جنگلا لگا ہوا ہے جو میرا خیال ہے ٹھوس چاندی کا ہے۔ اس پر ہرا غلاف چڑھا ہوا ہے۔ غلاف پر سنہری تاروں سے قرآن کی آیات کڑھی ہوئی ہیں۔ دیواروں پر مثنوی اور دیوان کبیر کے اشعار کے کتبے لگے ہوئے ہیں۔ اس مقبرے کو حضوری پیر کہا جاتا ہے۔

آؤ آؤ، تم جو بھی ہو
ماننے والے نہ ماننے والے۔ مجوسی یا بت پرست، آؤ
امید ورجا کے گھر میں آؤ

اور

جیسے تم ہو
یا جیسے تم سمجھے جاتے ہو۔ آؤ۔

میں بیٹھ گیا اور سورہ فاتحہ پڑھی۔ کہا جاتا ہے کہ مزار پر یہ سورۃ پڑھنا چاہیے۔

میں نیم مراقبے کی ایسی حالت میں وہاں بیٹھا تھا جہاں خیالات قطار در قطار چلے آتے ہیں لیکن کوئی نتیجہ ان کے آخر تک نہیں پہنچاتا۔ میری توجہ ان لوگوں کی طرف مبذول ہوگئی جو لمبی لمبی عبائیں پہنے تھے اور ان کے سروں پر عمامے تھے۔ میں انہیں دیکھتا رہا اور جب وہ باہر جانے لگے تو میں بھی ان کے پیچھے ہولیا۔ پہلے تو وہ آہستہ آہستہ چل رہے تھے پھر ان کے قدم تیز ہوگئے اور آخر میں وہ دوڑنے لگے۔ میں بھی ان کے ساتھ تیز تیز قدموں سے چلتا رہا۔ آخر ہم ایک مسجد کے پاس پہنچ گئے۔ مسجد میں انہی جیسے لباس میں ملبوس اور لوگ بھی بیٹھے تھے۔ میں ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ اذان ہوئی اور ہم نے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد دوسرے لوگ تو چلے گئے مگر وہ سب ایک دبلے پتلے بزرگ کے گرد اکٹھے ہوگئے۔ ان بزرگ کی موٹی سی لمبی ناک، اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں اور گھنی سفید داڑھی تھی۔ مونچھیں صاف تھیں۔ دوسروں کے برعکس ان کے عمامے کے گرد سرخ رنگ کی ایک پٹی بندھی تھی۔ وہ سب احترام کے ساتھ وہاں کھڑے ہوئے اور باری باری ان سے مصافحہ کرنے لگے۔ کچھ لوگوں نے ان کے ہاتھوں کو بوسہ بھی دیا۔ آخر میں وہ ایک دائرہ بنا کر وہاں بیٹھ گئے۔ اب وہاں اللہ کے ننانوے ناموں کا ورد شروع ہوگیا۔ یہ سلسلہ تھوڑی دیر جاری رہا اور میں اس دائرے سے باہر بیٹھا انہیں دیکھتا رہا۔ ورد ختم ہوا تو مجھے ایسے لگا جیسے میرے اوپر نشہ کی سی کیفیت طاری ہوگئی ہے اور میں ان کی طرف کھنچتا چلا گیا۔

بلا سوچے سمجھے میں کھڑا ہوا اور ان بزرگ کے پاس جا کر ان کے دائیں پہلو میں بیٹھ گیا۔ میں نے انہیں سلام کیا اور اپنے دونوں ہاتھوں میں ان کا ہاتھ لے کر مصافحہ کیا۔ انہوں نے گرم جوشی سے میرا خیر مقدم کیا، مسکرائے اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کئی منٹ وہ آنکھیں بند کیے اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے اسی طرح خاموش بیٹھے رہے۔ میں بھی بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ پھر وہ بولے۔ انہوں نے ترکی میں کچھ کہا۔ میں نے سر ہلایا کہ میں ان کی بات نہیں سمجھ سکا۔ اس پر ان کا ایک عقیدت مند اٹھا اور میرے بائیں ہاتھ پر بیٹھ گیا۔ ''شیخ احمد کہتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں تم یہاں کیوں آئے ہو؟'' اس نے ترجمہ کیا۔ ''تم جو سوال چاہو کر سکتے ہو۔''

میرے ذہن میں کوئی سوال نہیں آیا۔ میرا دماغ بالکل خالی ہو چکا تھا۔ آخر میں نے ڈرتے ڈرتے کہا ''اسلام کیا ہے؟'' اس وقت میرے ذہن میں یہی سوال آیا تھا۔ مجھے اپنی حماقت کا احساس تھا۔

''داڑھی رکھنا، عبا پہننا اور عمامہ اوڑھنا اسلام ہے۔'' بزرگ نے جواب دیا۔

اس وقت مسجد پر ایک پر اسرار خاموشی چھا گئی۔ وہ سرگوشیاں اور پس منظر سے آنے والی ساری آوازیں جیسے بند ہوگئیں۔ ہوا بھی ٹھہر گئی۔ میں جو اس وقت تک غیر مرئی سا تھا اچانک سب کی نظروں میں آگیا۔ سب کی توجہ میری طرف تھی۔ یہ میں نے کیسا سوال کیا تھا۔ میں نے کچھ بولنے کی کوشش کی۔ لیکن میرے مُنھ سے الفاظ ہی نہیں نکلے۔ میرا گلا خشک ہوگیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے لگا کہ میں ریگستان کی تپتی ریت پر بیٹھا ہوں اور سورج ٹھیک میرے سر پر ہے۔ کیا ان بزرگ اور لمبی لمبی عبائیں پہنے ان کے مریدوں نے میرے اوپر جادو کر دیا ہے؟

اب بزرگ نے خاموشی توڑی ''تمہاری سمجھ میں کیا نہیں آتا؟''

''ہم اسلام کو لباس تک محدود نہیں کر سکتے۔'' میں نے اپنا سوکھا گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ کمال اتاترک نے داڑھی اور شاید لمبی عبا اور عمامے پر پابندی لگا دی تھی۔ ''کہیں آپ کمال اتاترک کے نظریات کے خلاف اسلام کی تشریح تو نہیں کر رہے ہیں؟'' میں نے کہا۔

شیخ احمد نے میری بات سنی مگر کچھ بولے نہیں۔ وہ اپنی رانوں پر کہنیاں ٹکائے اس طرح بیٹھے تھے کہ ان کی داڑھی، ٹھوڑی، مُنھ اور ناک اکٹھے دونوں ہاتھوں پر رکھے تھے اور ان کی نظریں دیوار پر نقش کی ہوئی خطاطی پر جمی ہوئی تھیں جہاں اقلیدسی خط اور دائرے ایک انتہا سے دوسری انتہا تک گھومتے مسجد کے ہر گوشے اور ہر کونے تک چلے گئے تھے۔ خط کہیں گم ہو جاتا اور پھر نمودار ہو جاتا۔ کئی خط ایک دوسرے میں مل جاتے اور پھر الگ ہو جاتے اور اپنے پیچھے زاویے سے چھوڑتے آگے نکل جاتے تھے۔ کیا ان کی توجہ ان طغرائی خطاطی کے پیچیدہ خطوط میں کہیں کھوگئی ہے؟ یا وہ ان خطوط میں کچھ پڑھ رہے ہیں؟ ہوسکتا ہے یہ خطوط ان سے اس زبان میں باتیں کر رہے ہوں جو صرف وہی سمجھ سکتے ہیں۔

ان کی خاموشی نے مجھے اپنے خیالات مجتمع کرنے کا موقع فراہم کیا۔ ''شیخ احمد'' میں نے نہایت احترام کے ساتھ کہا'' مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے عقائد کو چند مخصوص علامات تک محدود کر دیا ہے۔ یہ علامتیں میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتیں۔''

''انسانی عمل کا محرک صرف اس کی جسمانی ضروریات یا اس کی بھوک ہی نہیں ہوتی۔'' شیخ احمد نے ترجمان کی وساطت سے جواب دیا'' بلکہ حقیقت کا وہ مشترک تصور بھی اس کا محرک

ہوتا ہے جس میں انسانوں کا کوئی طبقہ زندگی گزارتا ہے۔ ہماری برادری میں چند خاص علامات مشترکہ تصور فراہم کرتی ہیں۔ اس علامتی دنیا میں ایک فرد صرف جسمانی حیوان ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ سماجی وحدت بھی ہوتا ہے۔ یہ علامتیں تمہیں مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہوں گی لیکن ہماری علامتی ذات انہی کی پیدا کردہ ہے۔ مسلمان کی حیثیت سے یہ ہماری شناخت کا لازمی حصہ ہیں۔ البتہ اگر تمہیں یہ بے معنی نظر آتی ہیں تو تم اپنے لیے دوسری علامات تلاش کرلو۔"

مجھے علم تھا کہ شیخ احمد مجھے ٹال نہیں رہے ہیں۔ انہوں نے یہ الفاظ نہایت سکون کے ساتھ کہے تھے۔ انہوں نے اپنی بات جاری رکھی "تم جس فردوس کی تلاش میں ہو۔۔۔" میں فردوس کا لفظ سمجھتا تھا۔ اس کے لیے ترجمہ کی ضرورت نہیں تھی۔۔۔ "وہ ایک علامتی فردوس ہے۔ دودھ اور شہد کے باغوں اور نہروں سے بھری ہوئی۔ تمہارا جو جی چاہے ان کا مطلب نکال لو۔"

"لیکن یہاں ہم فردوس کی تلاش میں نہیں ہیں۔ ہم اس سے بھی بالا کسی چیز کی تلاش میں ہیں۔ ہم رضوان یا خدا سے قربت کی تلاش میں ہیں۔ اللہ کا رضوان فردوس سے بھی عظیم ہے۔"

"لیکن فردوس کا تو مقصد ہی فردوس میں اللہ کی قربت حاصل کرنا ہے۔" شیخ احمد نے جواب دیا۔ "لیکن ہم رضوان کو یہاں اور اب تلاش کرتے ہیں۔ فردوس ایک اضافی اصطلاح ہے۔ اپنے اعلیٰ ترین معانی میں فردوس سب سے ماورا مقام کی طرف اشارہ کرتی ہے اور یہ روح یا جوہر کی فردوس ہے۔ اس مقام پر رضوان اور فردوس ایک ہوجاتے ہیں۔ ہر شے کامل، لامحدود اور دائمی ہوجاتی ہے۔" شیخ احمد نے توقف کیا اور پھر قرآن کی ایک آیت پڑھی۔ جس کا مطلب یہ ہے "اے نفس مطمئنہ چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو (اپنے انجام نیک سے) خوش اور (اپنے رب کے نزدیک) پسندیدہ ہے۔ شامل ہوجا میرے نیک بندوں میں اور داخل ہوجا میری جنت میں" (۸۹۔۲۷۔۳۰) پھر ایک وقفے کے بعد وہ کہنے لگے۔ یہاں قرآن جس فردوس کا ذکر کررہا ہے وہ اس کی خوشنودی کی فردوس ہے۔ لازوال فردوس۔ اس لامتناہی فردوس میں کوئی اضافہ نہیں کیا جاسکتا اس لیے کوئی چیز اس میں داخل بھی نہیں ہوسکتی۔ یہاں اور ابھی ہم نیستی کی تلاش کرتے ہیں۔ جیسے ایک صوفی بزرگ نے ایک بار کہا تھا۔ "میں اندر داخل ہوا اور میں نے اپنا آپ باہر چھوڑ دیا۔" ہم اس لاانتہا میں اپنے آپ کو نیست و نابود کردینا چاہتے ہیں۔

شیخ احمد نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ اب وہ براہ راست مجھ سے

کلام کررہے تھے اور میں کسی ترجمان کے بغیر ان کی بات سمجھ رہا تھا۔ ''تمہارا مقدر یہ نہیں ہونا چاہیے۔ تم جس آقا کی تلاش میں ہو وہ نہیں جانتا کہ وہ آقا ہے اور وہ اپنے مرید نہیں بناتا۔ تمہیں جنت کے لیے اپنا راستہ خود ہی تراشنا چاہیے۔ تمہاری قسمت کہیں اور لکھی ہے۔'' اس کے بعد وہ کافی دیر خاموش رہے۔

''تم پر اللہ کی رحمت ہو۔'' انہوں نے زور سے کہا۔ ان کے مریدوں نے بھی اسے دہرایا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کھڑے ہوگئے۔ ان کے ایک مرید نے ان کا عصا ان کے ہاتھ میں دیا اور وہ اپنے مریدوں کی معیت میں مسجد کے بغلی دروازے سے باہر چلے گئے۔ اب مسجد میں میں اکیلا بیٹھا تھا۔

دوسرے ایک دو دن میں سحر زدہ حالت میں قونیہ میں گھومتا پھرا۔ کبھی ایک مسجد میں تو کبھی دوسری مسجد میں، کبھی ایک عجائب گھر میں تو کبھی دوسرے عجائب گھر میں اور کبھی کسی سماع کی محفل میں جہاں درویش رقص کررہے ہوتے۔ میرے دماغ میں شیخ احمد کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ان کا کیا مطلب تھا؟ کیا وہ یہ کہہ رہے تھے کہ میں اتنا متشکک ہوں کہ تصوف کا تجربہ کبھی نہیں کرسکتا؟ اتنا حقیقت پسند ہوں کہ میں کبھی اپنی ذات کی نفی نہیں کرسکتا؟ میں لاانتہا میں اپنے آپ کو ضم نہیں کرسکتا۔ کہیں وہ یہ تو نہیں کہہ رہے تھے کہ میں اپنا پیشوا خود ہی ہوں، حالانکہ میں جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ یا پھر یہ کہ میں جس قسم کے پیشوا کی تلاش میں ہوں اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے؟ میں ان سوالوں کا جواب دینے سے قاصر تھا۔ میں نے ملا نصرالدین کے مزار پر جانے کے لیے ٹیکسی پکڑی۔ یہ مزار قونیہ سے تیس کیلومیٹر کے فاصلے پر شمال مغرب کی جانب عکسی ہر میں واقع ہے۔

ترکی میں آپ کہیں بھی چلے جائیں آپ کو ہر جگہ ملا نصرالدین کے لطیفوں سے واسطہ ضرور پڑے گا، خواجہ نصرالدین جنہیں وہاں خواجہ نصرالدین کہا جاتا ہے۔ خواجہ کا مطلب ہے استاد اور نصرالدین کے معنی ہیں دین کی مدد کرنے والا۔ ملا نصرالدین اپنی بظاہر احمقانہ باتوں سے زندگی کی بڑی سے بڑی گتھیاں سلجھاتے تھے۔ ان کے لطیفے اور حکایات ایک طرح سے سبق ہوتی ہیں۔ میں نے بھی سوچا کہ شاید ملا نصرالدین ہی میری الجھن دور کردیں اور شیخ احمد سے میری گفتگو پر ہی۔ کچھ روشنی ڈالیں۔

ملا نصرالدین کی زندگی کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان

کا زمانہ تیرھویں صدی کا ہے۔ لیکن کچھ لوگ اسے چودھویں اور پندرھویں صدی بھی بتاتے ہیں۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ان کا کوئی وجود تھا یا نہیں اصل چیز تو ان کے اقوال اور ان کی حکایات ہیں۔ جو سبق آموز قصے اور اقوال ان سے منسوب کیے جاتے ہیں ان میں کسی قسم کا اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی اہمیت آج بھی اتنی ہی ہے جتنی صدیوں پہلے تھی۔ مثلاً وہ کہتے ہیں ''اے ایمان والو خدا کا شکر ادا کرو۔ اگر اس نے گدھے کو پر دیے ہوتے تو ہماری چھتیں سلامت نہ رہتیں۔'' ملا جس زمانے میں بھی موجود تھے۔ اگر وہ واقعی موجود تھے؟ تو اس زمانے میں ہر وہ بات جو مسلمہ تھی وہ آفاقی تھی۔ اور جو کچھ بھی آفاقی تھا وہ عام طور پر بے نام تھا۔ کسی کے نام سے منسوب نہیں تھا۔ اس لیے ملا نصرالدین سے جو کہانیاں منسوب ہیں وہ دوسرے مسلم ملکوں میں بھی عام ہیں۔ چنانچہ سر پر بڑا سا عمامہ رکھے گول مٹول جس ملا کی تصویر ہمیں ترکی میں ملتی ہے وہ الف لیلہ کے کردار، ہمارے ملا دو پیازہ یا مشرق وسطے کے بہلول سے مختلف نہیں ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ سروان تیز کے ہسپانوی ناول ڈان کی ہوتے کا سانچو پانزا بھی ملا نصرالدین کی ہی نقل ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ملا نصرالدین کا زمانہ جنگ و جدال کا زمانہ تھا۔ مغل بادشاہ تیمور نے اناطولیہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن ان کی کہانیاں خاک وخون کی کہانیاں نہیں ہیں۔ ان کا مقصد صاحب اقتدار کا غرور توڑنا تھا۔ ایک بار تیمور نے ملا سے سوال کیا ''میری اصل قدر و قیمت کیا ہے؟'' ملا نے جواب دیا ''تقریباً بیس طلائی سکے۔'' تیمور بولا ''اچھا؟ بیس طلائی سکے تو میرے اس کمر بند کی قیمت ہے جو میں نے باندھا ہوا ہے۔'' ملا نے فوراً کہا۔ ''میں نے اس کا حساب بھی لگا لیا تھا۔'' وہ امرا و رؤسا کا پردہ چاک بھی کرتے تھے۔ ایک قصے کے مطابق ایک بار ملا نصرالدین کو کسی ضیافت میں بلایا گیا۔ ملا اپنے روزمرہ کے عام لباس میں وہاں پہنچ گئے۔ کسی نے ان کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ وہ فوراً وہاں سے گھر آئے اور اپنا قیمتی لباس پہن کر واپس اس دعوت میں پہنچ گئے۔ اب وہاں ان کی خوب آؤ بھگت کی گئی۔ انہیں بہت ہی اچھی جگہ بٹھایا گیا۔ جب انہیں کھانا پیش کیا گیا تو انہوں اپنے فرغل کو مخاطب کیا ''اے میرے فرغل کھا لے کھانا۔ کھا لے کھانا میرے فرغل۔'' وہاں موجود لوگ ان کی اس حرکت پر بہت حیران ہوئے اور ان سے پوچھنے لگے ''یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟'' انہوں نے جواب دیا اس فرغل کی وجہ سے مجھے یہاں عزت ملی ہے۔ اس لیے اب یہ فرغل ہی کھانا کھائے گا۔''

ملا نصرالدین ریاکاری، شدت پسندی اور غرور و نخوت کا مذاق اڑاتے تھے۔ایک حکایت میں وہ کہتے ہیں۔ ''جاننے والوں کی بات غور سے سنو۔ اگر کوئی تمہاری بات سن رہا ہو تو دیکھو کہ وہ تمہاری بات ہی سن رہا ہے۔'' ان کا کہنا تھا کہ ہر دلیل کے ایک سے زیادہ پہلو ہوتے ہیں۔دو آدمی جھگڑ رہے تھے۔انہوں نے ملا سے کہا کہ آپ ہی انصاف کریں۔ جب پہلے آدمی نے اپنی بات سنائی تو ملا نے کہا ''تم سچ کہتے ہو۔'' اس پر دوسرے آدمی نے احتجاج کیا اور اس نے اپنی بات سنائی۔ ملا نے کہا ''تم سچ کہتے ہو۔'' اس آدمی کی بیوی جو یہ باتیں سن رہی تھی آگے بڑھی اور ملا سے بولی۔ ''دونوں ہی سچے کیسے ہو سکتے ہیں؟'' ملا نے برجستہ کہا ''اے عورت تو بھی سچی ہے۔'' دنیا میں جہاں بھی مسلمان ہیں انہیں اپنے جیسے کسی کردار کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کا سہارا بن سکے اور جو مسلمانوں کی اجتماعی سائکی کا مظہر ہو۔ایک ایسا شخص جو زندگی کی لغویات کی نشان دہی کرتا ہو۔ایسا شخص جس پر وہ اعتبار کر سکیں اور جس کے ساتھ ہنسی مذاق کر سکیں۔

جب میں ملا نصرالدین کے مزار پر پہنچا تو سہ پہر ختم ہو رہی تھی۔ میں بہت بلند و بالا دروازے کے سامنے کھڑا تھا جس میں سے ان کی قبر صاف نظر آ رہی تھی۔ میں وہیں سے قبر کا طغرا پڑھ سکتا تھا۔ اس پر لکھا تھا ''یہاں خواجہ نصرالدین آرام کر رہے ہیں'' دروازے پر ایک مضحکہ خیز سا قفل پڑا ہوا تھا۔لگتا تھا جیسے یہ دروازہ کبھی نہیں کھولا گیا ہے۔ بلکہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دروازہ بنایا ہی اس طرح گیا ہے۔ میں پیچھے ہٹا تو دیکھا کہ وہاں کوئی دیوار ہی نہیں ہے۔ یعنی بغیر دیوار کا دروازہ۔گویا یہ بھی ایک مذاق ہی تھا جو ملاؔ نے مرتے وقت سب کے ساتھ کیا تھا۔ مجھے لگا جیسے ملاؔ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوئے جا رہے ہیں۔ جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ میری کہانیوں کا مقصد لوگوں کو یہ باور کرانا ہے کہ منطقی طور پر ظاہر چیزوں سے نظریں ہٹا کر مضحکہ خیز طور پر واضح چیزوں پر توجہ دیں۔ میں ہنستا ہوا ان کی قبر کے پہلو میں بیٹھ گیا۔پھر معلوم نہیں مجھے کیا ہوا۔ مجھے نیند کا جھونکا آ گیا اور میں نے خواب دیکھا۔ مجھے صوفیوں والا تجربہ ہوا اور یہ میری زندگی کا واحد تجربہ تھا۔ مجھے لگا کہ میں سو رہا ہوں مگر میرے اردگرد جو کچھ ہو رہا ہے وہ میں کھلی آنکھوں دیکھ رہا ہوں۔

میں نے دیکھا، میں ایک جھیل کے کنارے کھڑا ہوں۔جھیل کا چمکتا پانی مجھے دعوت دے رہا ہے۔میرا جی چاہا کہ میں دونوں ہاتھوں میں جھیل کا پانی بھر لوں۔مگر جوں ہی میں پانی کی طرف جھکا وہ پانی اور میرے ہاتھ ایک دم غائب ہو گئے۔ میں نے بار بار کوشش کی لیکن ہر بار

پانی اور میرے ہاتھ ابھرتے تھے اور ایک دوسرے کو خلا میں مدغم کر دیتے تھے۔ پانی کو چھونے کی میری خواہش بڑھتی جا رہی تھی۔ میں بار بار کوشش کرتا تھا مگر ہر بار نتیجہ وہی نکلتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ دوسرے کنارے پر ایک آدمی کھڑا ہے۔ ڈوبتے سورج سے اس جانب بہت بڑا سایہ پڑ رہا تھا جس سے وہ آدمی ایک ہیولہ سا معلوم ہو رہا تھا۔ ایک غیر حقیقی شے۔ میں نے جھیل کے کنارے کنارے اس کی طرف چلنا شروع کیا۔ میں جتنا اس کی جانب چلتا تھا اتنا ہی مجھے لگتا کہ ہمارے درمیان فاصلہ کم نہیں ہو رہا ہے۔ میں نے سوچا شاید میں نے فاصلے کا غلط اندازہ لگایا ہے وہ زیادہ ہی فاصلے پر کھڑا ہے۔ اب میں نے لمبے لمبے قدم بڑھانا شروع کیے۔ پھر بھی فاصلہ اتنا ہی رہا۔ وہ آدمی بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ ''میں تمہارے قریب کیوں نہیں آ رہا ہوں؟'' میں نے زور سے آواز لگائی۔ میں اسے دیکھ تو نہیں سکتا تھا مگر مجھے لگ رہا تھا کہ میں اسے جانتا ہوں۔ مجھے یہ بھی لگا کہ وہ بھی جانتا ہے میں کیا محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے لگا کہ وہ چند سینٹی میٹر آگے بڑھا ہے۔ لیکن اب بھی میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اپنی نظریں اس پر گاڑ رکھی تھیں۔ پھر لگا کہ اس نے جھک کر گھاس کی پتی توڑی ہے۔ اس نے گھاس کی پتی کے دونوں سرے اس طرح توڑے کہ وہ پنسل بن گئی۔ اس کے بعد وہ ایک پیڑ کے پاس گیا اور اس کا بڑا سا پتہ توڑا اور اس پنسل سے اس پر کچھ لکھا۔ وہ نہایت احتیاط کے ساتھ لکھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ اپنا لکھا پڑھتا بھی جاتا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر سننے کی کوشش کی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ مگر لگتا تھا کہ زمین کی کشش ثقل بہت زیادہ بڑھ گئی ہے اور میرے پاؤں زمین میں گڑ گئے ہیں۔ میں زمین کے اس حصے پر کھڑا تھا اور زمین میرے گرد گھوم رہی تھی۔ کیا وہ میرے نزدیک آ رہا ہے؟ مجھے یاد ہے کہ اس نے کوئی ٹھنڈی چیز میرے ہاتھ میں دی اور میرے دماغ میں یہ الفاظ گونجے، ''تم جان جاؤ گے کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔''

مجھے ہوش آیا تو دیکھا کہ ایک ترک لڑکا میرے گرد گھوم کر کوئی چیز بیچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جس میں تسبیح کے بڑے بڑے دانے، گائیڈ بک اور اسی قسم کی چیزیں تھیں جو سیاح خریدتے ہیں۔ مگر وہ ایک قلمی تصویر میری طرف بڑھا رہا تھا۔ یہ انگور کے بڑے سے پتے پر بنا ہوا قلمی خاکہ تھا۔ وہ پتہ ایسا تھا جس پر ترک کھانے کی چیزیں لپیٹ لیتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ پتے پر قرآن کی آیات لکھی ہوئی تھیں۔ میں نے وہ پتہ خرید لیا اور خوف اور تجسس کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اسے پڑھا۔

''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہو۔ چراغ ایک فانوس میں ہو۔ فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارہ اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی، جس کا تیل آپ ہی بھڑکا پڑتا ہو چاہے آگ اس کو نہ لگے (اس طرح) روشنی پر روشنی (بڑھنے کے تمام اسباب جمع ہو گئے ہوں) اللہ اپنے نور کی طرف جس کو چاہتا ہے رہنمائی فرماتا ہے۔ وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے۔ وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔ (۲۴۔۳۵)

میرے اس متصوفانہ تجربہ کا مطلب یہ ہے کہ میں تصوّف کو رد نہیں کر سکتا۔ اس کی تہہ میں کوئی گہری اور مسحور کن چیز موجود ہے۔ لیکن موجودہ زمانے کے جن صوفیوں سے میرا واسطہ پڑا مجھے ان میں وہ چمک اور روشنی نہیں ملی۔ میرا مسئلہ ہیئت کا تھا۔ وہ ہیئت ترکیبی جس میں تصوّف کو مرشد اور مرید، نیز اسرار اور بھول بھلیوں کا کاروبار بنا دیا گیا ہے۔ میں نے دیکھا تھا کہ شیخ ناظم کے صوفی راستے نے کس طرح میرے بھائی کو معاشی طور پر تباہ کر دیا تھا۔ بعد میں اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں لیکن اس وقت تک وہ مکمل برباد ہو چکا تھا اور شکایت کرتا تھا کہ بیس سال میں انہوں نے اس کی زندگی تباہ کر دی۔ انفرادی طور پر صوفیا مختلف ہستیاں ہیں جیسے حلاّج اور جنید بغدادیؒ۔ لیکن اجتماعی اور روحانی مسلک کے طور پر اس سلسلے نے کوئی قابل عمل اور مساویانہ سماجی نظام نہیں دیا۔ یہاں مطلق العنانی اور مرشد کے گرد گھومنے والی فرقہ بندی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ جنت کو جانے کا یہ راستہ میرا راستہ نہیں ہو سکتا۔ جدید صوفی جس راستے پر لے جانا چاہتے ہیں میں وہاں جانا نہیں چاہتا۔

باب۔۵

جنت کا گہوارہ

اسلام کے ابتدائی زمانے میں علم کی تلاش سفر کے ساتھ مشروط سمجھی جاتی تھی ۔ اس کی تصدیق امام غزالی نے بھی کی ہے ۔ ساتویں صدی کے یہ فلسفی اور عالمِ دین اسلامی تاریخ کی قدآور شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں۔ غزالی جن کا پورانام ابو حامدابن محمد الطوسی الغزالی تھا حجۃ الاسلام اورمجدّد کہلاتے ہیں۔ وہ طوس (جو اب خراسان ہے) میں پیدا ہوئے نشاپور کے مشہور مدرسے میں تعلیم حاصل کی ۔ ان کے استاد اس وقت کے نامور فقیہ الجوئینی تھے۔ چونتیس برس کی عمر میں انہوں نے بغداد کے جامعہ نظامیہ میں شیخ الجامعہ کا منصب حاصل کیا۔اسی زمانے میں انہوں نے اپنی مشہور کتاب ''تہافتہ الفلاسفہ'' لکھی ۔اس کتاب میں یونانی فلسفیوں اور ان کے مسلمان حامیوں پر شدید ترین نکتہ چینی کی گئی ہے۔ غزالی کا خیال ہے کہ مذہب کو دلائل سے ثابت کیا جاسکتا ہے اور نہ اسے دلائل سے رد کیا جاسکتا ہے۔ اس قسم کی تمام کوششیں ذہنی خلفشار پیدا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتیں۔ لیکن اس کتاب کے بعد وہ نہایت سنگین قسم کی روحانی کشمکش میں مبتلا ہوگئے ۔انہوں نے جامعہ چھوڑ دیااور سفر پر روانہ ہوگئے۔ قریب دس سال وہ مشرق وسطے کے مختلف ملکوں کا سفر کرتے رہے۔ وہ مکہ گئے، مدینہ گئے اور دمشق اور دوسرے شہروں میں کچھ وقت گزارا۔ آخر جب وہ ایک جگہ مقیم ہوگئے تو انہوں نے اپنی ضخیم کتاب لکھی۔ یہ کتاب چالیس جلدوں میں ہے اور یہ اسلامی جنت کے راستے کی نشان دہی کرتی ہے۔ انہوں نے دینیات، شریعت، علم الاخلاق اور تصوف کا ایسا امتزاج پیش کرنے کی کوشش کی ہے

جس سے صوفیا کو منطق نیز منطق کے ماہرین اور ریاضی دانوں کو روحانیات اور فقہا کو خطابت اور فلسفہ سکھایا جاسکتا ہے۔اس طرح ان تمام علوم کا امتزاج پیدا ہو جاتا ہے۔

غزالی ایسے فلسفی ہیں جن کی طرف اکثر مسلمان دھڑکتے دل کے ساتھ رجوع کرتے ہیں۔غزالی بھی مسلمانوں کے اس جذبے سے خوب واقف ہیں۔علم الیقین کے بارے میں لکھتے ہوئے وہ خود بھی شک وشبہ کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔وہ سچ کی تلاش میں رہتے ہیں اور ایک تشکیک سے دوسری تشکیک تک کا سفر کرتے ہیں۔وہ کہتے ہیں۔''جب تک کوئی شک نہ کرے ایمان نہیں لاسکتا۔وہ نادرۂ روزگار شخصیت ہیں کہ وہ استدلالی رویّے پر بھی شک کرتے ہیں۔یہ شک کا ایسا راستہ ہے جس پر آج کے زمانے کے وہ لوگ بھی چلتے ہوئے گھبراتے ہیں جن کی تربیت خالص سائنسی انداز میں ہوئی ہے۔ FOISIS کے زمانے اور اس کے بہت عرصے بعد تک بھی غزالی کی کتابیں اور احیاء العلوم کی پہلی جلد مسلسل میرے مطالعے میں رہی۔میں ایک دینی فریضہ کی طرح ہر رات سونے سے پہلے ان کا مطالعہ ضرور کرتا۔غزالی کے نزدیک سفر زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے۔علم کی جستجو کے عمومی موضوع کو وہ فکر اور سفر کے ساتھ جوڑتے ہیں۔اپنی آپ بیتی میں وہ کہتے ہیں کہ دنیاوی علم اور انسان کے اپنے اندرون کا علم اور کائنات میں انسان کے مقام کا شعور سفر کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔علم جنت کا درواز ہے اور سفر وہ کنجی ہے جس سے یہ دروازہ کھلتا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ''اپنی نوجوانی کے زمانے سے بیس سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے جب میں بالغ ہوا آج تک جب میں پچاس سال سے زیادہ کا ہو چکا ہوں میں ہمیشہ ان سمندروں کی گہرائیوں میں غواصی کرتا رہا ہوں۔ میں تمام خطرات سے بے نیاز ہو کر کھلے سمندروں میں سفر کرتا رہا ہوں میں نے ہر مشکل کا مقابلہ کیا ہے۔میں ہر اتھاہ گھائی میں اترا ہوں۔میں نے ظلمات کی گہرائیوں کو کھنگالا ہے۔ میں نے ہر مسلک اور ہر فرقے کا تجزیہ کیا ہے۔میں نے ہر قبیلے کے عقیدے اور ہر نظریہ کی پرتیں کھولنے کی کوشش کی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ یہ تمام کام سفر کے وسیلے سے کیے ہیں تا کہ حق اور باطل کا فرق معلوم کرسکوں۔

غزالی سفر کو دو عمومی مرحلوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ایک ''رحلہ'' اور دوسرے ''سفر''۔ دونوں کا مطلب سفر ہی ہے لیکن یہ دونوں سفر کی حالت کے دو مختلف پہلو پیش کرتے ہیں۔ رحلہ یا اردو زبان کا لفظ رحلت بیرونی دنیا کا جسمانی سفر ہے جو حصول علم اور دریافتوں کے لیے کیا جاتا ہے۔عظیم مسلم سیاح جیسے ابن جبیر جس نے بارھویں صدی میں سیاحت کی اور ابن بطوطہ جس نے

چودھویں صدی میں دنیا بھر کا سفر کیا انہوں نے ''رحلہ'' یا سفر نامے لکھے۔ابن جبیر نے جزیرہ نمائے عرب کا سفر کیا اور ایسی کتاب لکھی جو زمانہ وسطی کے اسلامی فنون اور فن تعمیر کا ایک قیمتی حوالہ بن گئی ۔ اس نے جو بھی دیکھا اسے بلاکم وکاست درج کرلیا۔ابن بطوطہ نے جو عجائب و غرائب دیکھے اور جو مہمات سر کیں ان کا احوال تفصیل کے ساتھ لکھ دیا ہے۔ ''رحلہ'' کے اس تصوّر کو مضبوط بنانے کے لیے مسلم اسکالرز کا کہنا ہے کہ مسلمان سیاحوں نے جو کچھ دیکھا اور جو عجائب وغرائب دریافت کیے وہ کتابوں میں لکھ دئے ۔اور یہ بتا دیا کہ سیاحت نے ان کے علم میں کیا اضافہ کیا۔لیکن غزالی کو اس قسم کی سیاحت سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ان کے نزدیک سفر جسمانی طور پر بیرونی دنیا کی سیاحت نہیں ہے بلکہ وہ اندرون کا سفر بھی ہے ۔ اس سفر میں جسمانی مشقت کے ساتھ اندرونی قلب کی ماہیت بھی ہوتی ہے۔اس سے ایک قسم کی آزادی کا احساس بھی ہوتا ہے۔غزالی خاص طور سے حرکت اور میل جول کے عمل پر اصرار کرتے ہیں۔ حرکت سفر کا جسمانی عمل ہے تو اس کے ساتھ ہی وہ دل و دماغ میں تبدیلیاں بھی رونما کرتا ہے۔ سفر کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ انسان کو نئے تجربات اور نئی چیزوں سے روشناس کرائے اور اسے اپنے اردگرد کی اشیا کے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہونے کا علم فراہم کرے۔میل جول سے انسانی رابطے بڑھتے ہیں۔اس لیے سیاح کے لیے وہ چیزیں اہم نہیں ہیں جن سے سیاح کو واسطہ پڑتا ہے بلکہ اصل حقیقت وہ لوگ ہیں جن سے وہ ملتا ہے۔ عام انسانوں کے ساتھ ملنا جلنا کسی بھی سیاح کو اپنے خیالات اور مفروضات اور اپنے طور اطوار پر نظر ثانی کرنے پر اکساتا رہتا ہے۔یہ عوامل اس کی کایا کلپ کر دیتے ہیں اور ایک نیا نظام فکر وجود میں آجاتا ہے۔

آپ ایک فلسفی کو سیاح بنا سکتے ہیں لیکن اس شخص کے اندر سے آپ ہمیشہ کے لیے فلسفی کو نہیں نکال سکتے جو سفر کرتا رہتا ہے۔ اسی لیے غزالی دونوں قسم کے سفر سے مطمئن نہیں ہیں۔ وہ ہر قسم کے سفر اور ہر درجہ کے سیاح کی وضاحت کرتے ہیں اور ان میں سے سیاسی طور پر باخبر سیاح کی ایک قسم دریافت کرتے ہیں۔اس میں ان کا بھی کوئی قصور نہیں ہے۔ کیونکہ قدیم اسلامی فکر میں اس طرح کی قسمیں بنانا وقت کی ضرورت تھی ۔لوگوں کو یہ تعلیم دی جاتی تھی کہ اپنے خاص مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر سوچیں۔ ان کے سوچنے کا انداز ریل گاڑیوں کے درجوں والا ہوتا ہے کہ فرسٹ کلاس سیکنڈ کلاس اور تھرڈ کلاس۔ اس کے بعد مال گاڑی کا ڈبہ۔ فرسٹ کلاس کا مسافر علم کے حصول کے لیے سفر کرتا ہے اور یہ سفر آخر کار اسے جنت کی طرف لے جاتا ہے۔

سیکنڈ کلاس کا مسافر تندرست بدن کا مالک متوسط طبقہ کا آدمی ہوتا ہے جو اپنی اصلاح کی کوشش میں ہے۔ وہ عبادت کے لیے سفر کرتا ہے۔حج کے لیے مکہ جاتا ہے۔ وہاں سے پاک صاف ہو کر لوٹتا ہے ایک نئے شعور اور احساس کے ساتھ۔ وہ اپنے تجربہ سے خاکساری اور انکسار سیکھتا ہے اور اپنی سماجی ذمہ داریاں پوری کرتا ہے۔ یہ قابلِ تعریف مسافر یا سیاح ہیں۔تحرڈ کلاس میں وہ لوگ شامل ہیں جو غریب محنت کش طبقے سے تعلق رکھتے ہیں،یہ لوگ اپنی روز مرہ کی ضرورت کے لیے سفر کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی حالت بہتر بنانے اور اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے کی کوشش میں مصروف ہوتے ہیں۔ ان سب کو سفر کی اجازت ہے۔لیکن اسلامی فکر کے حساب سے سفر اس سے بھی زیادہ کوئی چیز ہے۔تاریخ میں پہلی مسلم کمیونٹی ان لوگوں سے پیدا ہوئی تھی جو پناہ کی تلاش میں تھے۔اسلامی کیلنڈر ۶۲۲ عیسوی میں اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب حضرت محمد ﷺ نے قریش مکہ کے ظلم وستم اور معاشی پابندی سے بچنے کے لیے مکہ سے مدینہ ہجرت کی۔ مسافروں کی چوتھی قسم وہ ہے جو جسمانی نقصان سے بچنے کے لیے کسی جگہ سے بھاگتے ہیں۔ جیسے طاعون کے خوف سے بھاگنا۔اس سفر کی بالکل اجازت نہیں ہے۔ کیونکہ اس طرح بھاگنے سے انسان طاعون سے بچ نہیں سکتا بلکہ وہ اور بھی طاعون پھیلاتا ہے،میں اب اس موضوع پر مزید تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ میں تو بس اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے فرسٹ کلاس کے مسافر کی طرح سفر کیا۔علم کی جستجو میں سفر ایک صوفی اور آوارہ گرد کی طرح۔ میرے سفر کے دوسرے دور کا بہانہ یہ تھا کہ میں اپنی کتاب Science , Technology and Development in Muslim World کے لیے ضروری معلومات اکٹھی کروں۔ میں نے اپنے چند عزیزوں اور دوستوں کو آمادہ کیا کہ وہ میری مالی مدد کریں تاکہ میں مشرق وسطیٰ کے مسلم ملکوں میں وہاں کے سائنسی اداروں کا دورہ کر کے ان میں ہونے والی سائنسی ریسرچ اور دوسری سائنسی ترقیوں کا جائزہ لے سکوں۔ ان ملکوں میں دنیاوی جنت کے حصول کے لیے سائنسی علوم کے ذریعہ ترقی کی منازل طے کرنے کا چرچا کافی زمانے سے ہو رہا تھا۔

مشرق وسطیٰ کے ملک ہی کیوں؟اس لیے کہ یہی علاقہ جنت میں جانے کا جنکشن مانا جاتا ہے۔ دنیا کے تین بڑے مذاہب یہودی، عیسائی اور اسلام کا گہوارہ ہونے کے علاوہ یہ علاقہ چند دوسرے چھوٹے مذاہب کا گڑھ بھی رہا ہے۔ جیسے زرتشتی مذہب۔ اس کے علاوہ اس علاقے نے باغِ عدن یا دنیاوی جنت کا تصور بھی دیا ہے۔یعنی وہ مقام جہاں سے انسان نے اپنا الٹا سفر

شروع کیا تھا۔ عدن ایک ایسا زبردست تصور ہے جس نے مختلف طرز ہائے فکر کو نئی سی نئی بات سوچنے اور اس سے نئی سے نئی یوٹو پیا تخلیق کرنے پر اکسایا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعہ اس دنیا میں ایک متبادل جنت کا راستہ تلاش کرنے کا خیال بھی اسی مشرق میں پیدا ہوا۔ یہ علاقہ وہ آتش دان ہے جس کے گرد وہ تہذیبیں پیدا ہوئیں اور اکٹھی ہوئیں۔ جنھیں ہم جانتے ہیں۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں بنی نوع انسان نے اپنے آپ کو آدمی بنانے کا عمل شروع کیا، نباتات اور جانوروں کو اپنے قابو میں کیا، زراعت اور دھاتوں کا علم حاصل کیا، لکھنا ایجاد کیا اور فنون لطیفہ کی تخلیق کی، دور دور تک تجارت کرنا سیکھی، مل جل کر رہنا شروع کیا اور بستیاں آباد کیں اور حکومت کرنے کا نظام وضع کیا۔

اس سرزمین اور اس سرزمین سے ابھرنے والی بصیرت کے درمیان کیا تعلق ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب فرسٹ کلاس کے ہر مسافر کو تلاش کرنا چاہیے۔ اس سرزمین کا لینڈ اسکیپ۔ اس کے مقامات اور اس کی تاریخ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اربوں انسانوں کی ملکیت اور ان کا ورثہ ہیں چاہے ان میں سے بہت سے لوگوں نے اس سرزمین پر قدم بھی نہ رکھا ہو۔ پورا علاقہ ثقافتی حوالوں سے ہر کلچر کا اندرونی پرت بن گیا ہے۔ اس کا لینڈ اسکیپ اور اس کی تاریخ اربوں اجنبی لوگوں کی امنگوں اور خوابوں کا حصہ ہے۔

مشرق وسطیٰ یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے بزرگوں، قبائلی سرداروں اور ان کے پیغمبروں کی سرزمین ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں معجزے رونما ہوئے۔ یہ جانوروں کی ان کہانیوں کی سرزمین ہی نہیں ہے جن سے انسانوں نے سبق حاصل کیا بلکہ یہ ان داستانوں کی سرزمین بھی ہے جنھوں نے حقیقت سے ماورا جا کر ایسی حیرت انگیز کہانیاں تخلیق کیں جن سے انسانی تخیل کو مہمیز ملی۔ یہ کئی معنی میں کہانیوں اور داستانوں کی سرزمین ہے۔ یورپی مصنفوں نے اس علاقے کے مقدس مقامات کی زیارت کرنے کے بعد جو پہلی کتابیں لکھیں ان میں یہاں کے عجائبات اور حیرت انگیز واقعات ہی ان کا موضوع تھے ان کی کتابوں کو عجائبات کی کتابیں کہا جاتا ہے۔ مشرق وسطیٰ ایسی کہانیوں کی سرزمین بھی ہے جن کی تہہ تک مغربی مصنفین نہیں پہنچ سکے اور پھر یورپی لوگوں کے ہاتھ سے یہ سرزمین نکل گئی حالانکہ یہ ان کی اپنی امیج کا مرکزی نقطہ تھی۔ میں اپنے لیے مشرق وسطیٰ کی تاریخ ایک سیدھی لکیر کی شکل میں دیکھتا ہوں۔ یورپ کا یہ معاملہ نہیں ہے۔ اسلام کی آمد کے ساتھ ہی انہیں دوسری بار اس باغِ عدن سے نکلنا پڑا۔ گویا مینارِ

بابل سے ان کا یہ دوسرا انخلا تھا اور ایسا کیوں اور کیسے ہوا؟ ان عجیب وغریب داستانوں نے یورپ میں میری زندگی کی تشکیل کی۔ انہوں نے مجھے ان داستانوں میں گھیرے رکھا کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔

میں نے تہران سے اپنا سفر شروع کیا۔ یہ ۱۹۷۴ء کی گرمیاں تھیں۔ چند سال قبل ہی شاہ نے پریس پولس کی بیہودہ تقریبات منا کر دنیا کو حیران کر دیا تھا۔ اس موقع پر مسلمانوں کے اکثریتی ملک کو جدید بنانے کا یہ طریقہ اپنایا گیا تھا کہ اپنی شہنشاہیت کا سلسلہ ڈھائی ہزار قبل سائرس کی سلطنت تک پھیلا دیا گیا۔ اس موقع پر جو جشن منایا گیا تھا اس میں آرائش وزیبائش اور کھانوں کی وہ عظیم الشان نمائش کی گئی تھی کہ ہالی وڈ کی فلمیں اور الف لیلہ کی کہانیاں بھی ماند پڑ گئی تھیں۔

وہاں میرا ایک پرانا دوست رضا رہتا تھا۔ اس نے حال ہی میں اسلامی تاریخ پر ڈاکٹریٹ کی تھی اور وہ اسماعیلی فرقے پر مہارت حاصل کر رہا تھا۔ ایران واپس آنے کے بعد اس نے پہلے یونیورسٹی میں اور پھر شاہی ادارۂ فلسفہ میں ملازمت حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی ناکامی کی وجہ ایک تو تاریخ کے اس موضوع کی غیر مقبولیت تھی دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ شاہ کی مخالف انڈر گراؤنڈ تحریک میں شامل تھا۔ ملازمت نہ ملنے سے اسے اور بھی وقت مل گیا تھا کہ وہ آیت اللہ خمینی کی تقریروں کے ٹیپ تقسیم کرتا پھرتا تھا۔ یہ ٹیپ عراق سے اسمگل کیے جاتے تھے جہاں خمینی جلا وطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ میں تہران پہنچا تو فضا میں کشیدگی تھی اور لوگ بہت ہوشیار اور محتاط زندگی گزار رہے تھے۔ شمالی تہران کی جدید سڑکوں پر گھومتے ہوئے میں آنے والے طوفان کی بو سونگھ رہا تھا۔

"ہم انقلاب کے دہانے پر کھڑے ہیں۔" رضا نے مجھے بتایا۔ وہ اپنی پرانی شیورلٹ کار میں مجھے ہوائی اڈے سے ایک غریب محلے میں اپنے گھر لے جا رہا تھا۔ وہ لمبا اور صحت مند جسم والا آدمی تھا۔ چہرے پر خوبصورت ترشی ہوئی داڑھی تھی۔ وہ نہایت نرمی مگر جذبات کی حرارت سے بھرے انداز میں باتیں کر رہا تھا۔ اس کے اندر ایک تہذیبی نفاست تھی جو جدید پریس پولس کی خبروں سے مختلف تھی۔ دوسرے دن وہ مجھے اس مظاہرے میں لے گیا جو اس قانون کے خلاف کیا جا رہا تھا جس کی رو سے ایرانی عدالتیں امریکیوں کے خلاف مقدمات کی سماعت نہیں کر سکتی تھیں۔ یہ قانون 1963 میں منظور کیا گیا تھا۔" اس طرح ایرانی علما اور دوسرے لوگوں کو

تو دہشت زدہ کیا جاسکتا تھا مگر امریکی تمام قوانین سے آزاد ہیں' رضا نے یہ کہتے ہوئے اپنی نظریں نیچی کر لیں۔ سڑک پر ایک سوراخ میں سے چیونٹیوں کی ایک لمبی قطار روٹی کے اس ٹکڑے کی طرف جارہی تھی جو ایک طرف پڑا ہوا تھا۔ ''میرے بہت سے دوست جھوٹے الزامات میں پکڑ لیے گئے ہیں۔ وہ ناقابلِ یقین تشدّد برداشت کررہے ہیں۔ خیر، اب میری باری بھی آنے والی ہے۔'' رضا کہہ رہا تھا۔

مظاہرے میں زور زور سے نعرے لگائے جارہے تھے۔ اس موقع پر چند لوگ گرفتار بھی ہوئے۔ لیکن کوئی مار پٹائی نہیں ہوئی۔ رضا نے ایک طرف اشارہ کرکے کہا۔ شاہ کی بدنام زمانہ خفیہ پولیس ساوک کے لوگ ہماری تصویریں کھینچ رہے ہیں۔ مبارک ہو، آپ بھی ان کی فہرست میں شامل ہوگئے۔''

اگلے چند ہفتوں میں میں نے کئی ریسرچ اداروں کا دورہ کیا اور کئی لوگوں سے بات چیت کی۔ میں نے شہر کے شمال اور جنوب میں آنے والے انقلاب کی فضا دیکھی۔ میں نے سرکاری ملازموں، کاروباری لوگوں پروفیسروں، ادیبوں اور دانشوروں سے تبادلۂ خیال کیا۔ ہر ایک نے سرگوشیوں میں آنے والے انقلاب کی ہی بات کی۔ میں نے جس سے بھی بات کی ان میں اکثریت کو یقین تھا کہ انقلاب کے بعد حقیقی انصاف اور مساوات کا دور دورہ ہوگا اور زمین پر جنت کا نمونہ پیدا ہوجائے گا۔ رضا اور اس کے دوست تو انقلاب کے خواب دیکھ رہے تھے مگر میرا دماغ کہیں اور ہی بھٹک رہا تھا۔

ارضی جنت کا یوٹوپیا کسی خواب سے شروع ہوتا ہے لیکن آخر میں یہ ڈراؤنا خواب بن جاتا ہے۔ چند صدی پہلے تہران سے کچھ ہی فاصلے پر انقلابیوں کا ایک اور گروہ موجود تھا جس نے اسی طرح ارضی جنت کا خواب دیکھا تھا۔ جتنا میں آنے والے انقلاب کی باتیں سنتا اتنا ہی مجھے حشیشین کا وہ گروہ یاد آتا۔ شدت پسندوں اور دہشت گردوں کا وہ گرو جو گیارھویں صدی سے تیرھویں صدی کے وسط تک اس علاقے پر چھایا رہا۔ میں آج کے انقلابیوں اور ماضی میں جنت کے متلاشی ان انتہا پسندوں کا موازنہ کرتا رہا۔ دونوں ہی ارضی یوٹوپیا قائم کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھے، دونوں ہی اپنا مقصد حاصل کرنے لیے تشدد کا راستہ اختیار کررہے تھے اور دونوں کی ہی قیادت ایک طلسماتی مذہبی شخصیت کے ہاتھ میں تھی۔ جب مجھے اندازہ ہوا کہ رضا مجھے حسن بن صباح اور حشیشین کی وادی آلموت لے جانے پر آمادہ ہے تو میں فوراً اس کے لیے تیار

ہو گیا۔

میری طرح حشیشین بھی، جنہیں مغرب میں اساسین کہا جاتا ہے، فردوس بریں کے متلاشی تھے۔ فردوس بریں کی اس تلاش میں حشیشین نے جو خون سے بھرے خنجر اٹھائے تھے اس کی داستان صدیوں سے اسی جوش وخروش کے ساتھ سنی جا رہی ہے۔ اس داستان کے اصل حصے فریا اسٹاک کی کتاب Travels of Marco Polo کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں۔ مارکو پولو ۱۲۷۳ء میں ایران سے گزرا۔ وہ بتاتا ہے کہ اساسین اپنے بچوں کو شروع سے ہی ایسی تربیت دیتے تھے کہ وہ اپنے دشمنوں کو اندھا دھند قتل کرنے والی جنونی مشین بن جاتے تھے۔ اس مقصد کے لیے وہ انہیں نشہ آور چیزیں کھلاتے تھے۔ اور انہیں اپنے شیخ کی اندھی تقلید سکھاتے تھے۔ وہ ان نوجوانوں کو ایک ایسی ارضی جنت کے خواب دکھاتے تھے جہاں وہ اپنی خواہش کی تمام چیزیں حاصل کر سکیں گے۔ ان نوجوانوں کو ایسا مسحور کر دیا جاتا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے کہیں جا بھی نہیں سکتے تھے۔ ہم گھر سے روانہ ہوئے تو رضا راستہ بھر پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا کہ کہیں ساوک کے سپاہی ہمارا پیچھا تو نہیں کر رہے ہیں۔ آخر ہم شہر سے باہر نکلے اور قزوین کی سڑک پر پہنچے تو رضا نے سکون کا سانس لیا۔

''کیا واقعی اسماعیلیوں نے ہی قتل کرنے کا یہ سلسلہ ایجاد کیا تھا؟'' رضا نے ہنستے ہوئے کہا۔ میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ محسوس کیا کہ ایران آنے کے بعد پہلی مرتبہ میں قہقہہ سن رہا ہوں۔ جس طرح گرمیوں کی آندھی فضا کا حبس دور کر دیتی ہے اسی طرح رضا کے اس قہقہے نے اس کا موڈ اچھا کر دیا'' تو آپ بھی مغربی لکھنے والوں کی اس خرافات پر یقین رکھتے ہیں؟ مجھے آپ سے اس کی توقع نہیں تھی۔''

تھوڑی دیر کے لیے ایک ٹرک نے یہ سلسلہ کلام منقطع کر دیا۔ وہ ٹرک خطرناک حد تک سامان سے بھرا ہوا تھا۔

''نہیں، اسماعیلی اساسین نے قتل کا یہ طریقہ اور سلسلہ ایجاد نہیں کیا تھا۔'' اس نے ہنستے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ''خون خرابہ تو انسانی تاریخ کے آغاز سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ کون سی قوم اور کونسا عہد اس سے خالی رہا ہے۔ حتی کہ اسلام کی ابتدائی تاریخ کا راستہ بھی قتل وخون سے تبدیل ہوتا رہا ہے۔ کیا آپ بھول گئے کہ ہمارے اپنے تین خلفا بھی قتل کیے گئے تھے اور

پھر اسلام کے سنہری دور یعنی عباسی خلفا اور ہارون الرشید کے عہد میں مسلمان اپنے خلفا کو مسلسل قتل ہوتے دیکھتے رہے تھے۔

''لیکن ان کا نام تو اس کے ساتھ ہی منسوب ہوا؟''

''جی ہاں، انہوں نے اس کے ساتھ اپنا نام منسوب کیا۔ مگر اس کی بنیاد بھی ایک غلط مفروضہ ہے۔'' رضا نے سڑک پر سے اپنی نظریں ہٹا کر میری طرف دیکھا۔ ''یہ وہ پروپیگنڈا ہے جو آپ جیسے لوگوں نے پھیلایا ہے۔'' وہ مسکرایا۔ ''آپ سنی فرقے کے لوگ تیزی سے ملنے والی ان کی کامیابیوں کو سمجھ نہ سکے تو آپ نے یہ افواہ اُڑادی کہ وہ اپنے نوجوانوں کو حشیش کھلاتے تھے۔اس سے حشیشین بنا جس کا مطلب ہے حشیش کھانے والے۔ انہیں ذلیل کرنے کا یہ سنیوں کا طریقہ ہے۔ اگر اس فرقے کے لوگ اپنے بارے میں ایسی باتیں سنتے تو انہیں انتہائی تکلیف ہوتی۔ وہ تو اپنے آپ کو نزاری کہتے تھے۔''

آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد مسلمان دو فرقوں میں تقسیم ہوگئے تھے۔ ایک سنی اور دوسرا شیعہ۔شیعہ پیغمبر کی اولاد کے پاس ہی سیاسی اقتدار دیکھنا چاہتے تھے۔ سنی ایسا نہیں چاہتے تھے۔ اس کے بعد شیعہ بھی تقسیم ہوگئے۔ ان میں ایک فرقہ اثنا عشری ہے اور دوسرا اسماعیلی۔ اثنا عشری مانتے ہیں کہ مسلمانوں کی دنیوی اور روحانی قیادت کا حق صرف پیغمبر کے چچا زاد بھائی اور چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ کو ہی ہے۔ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے اماموں کی جو خوبیاں بیان کی ہیں ان کے مطابق حضورؐ کے وارث بارہ امام ہیں۔ میں نے اسلام کی جو تعلیم حاصل کی ان میں شیعہ فرقہ کا نام کبھی نہیں لیا گیا۔ حتیٰ کہ جب مجھے فقہا کے مختلف مسالک کے بارے میں بھی بتایا گیا تو فقہ جعفریہ کو فراموش کر دیا گیا۔ جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ ایک اعتبار سے یہ اچھا ہی ہوا کہ اکثر سنی حلقے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ شیعہ اسلام کے حلقے سے باہر ہیں کیونکہ وہ حضرت علیؓ کے سوا باقی تمام خلفا پر تبرا بھیجتے ہیں اور حضرت علیؓ کو ان کے جائز منصب سے بھی اوپر لے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے بجائے حضرت علی پر قرآن نازل ہونا چاہیے تھا۔شیعوں سے سنیوں کی نفرت نے دینی ادب کی ایک نئی صنف ایجاد کرڈالی ہے جس میں انہیں اسلام کے دائرے سے خارج کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اب منظر تبدیل ہوگیا۔ تہران کے گرد پھیلی خشک پہاڑیوں کے بجائے یہاں سرسبز و شاداب وادیوں میں پہاڑی چشمے بہہ رہے تھے۔ان مناظر نے میرے دل میں بھی بشاشت

پیدا کردی اور مجھے اپنے بچپن کا وہ پاکستانی گاؤں یاد آگیا جہاں ہم بچے گنے کے کھیتوں میں کھیلا کرتے تھے۔ اب ہم دونوں اپنے ماضی کی خوش گوار یادوں کے حلقے میں تھے۔

''اسماعیلی پانچویں امام جعفر صادق کے دور میں ابھرے۔'' رضا نے کہنا شروع کیا۔ ''ان کے بڑے بیٹے اسماعیل کی وفات ان کی زندگی میں ہی ہوئی تھی۔ انہوں نے بیٹے کی موت کے وقت علاقے کے بزرگوں کو وہاں بلا لیا تھا۔ لیکن بعض شاہدین کا کہنا تھا کہ اسماعیل نے وفات نہیں پائی بلکہ وہ اللہ سے وصال کے لیے اوپر اٹھا لیے گئے اور وہ قیامت کے دن نجات دہندہ مہدی موعود کے طور پر واپس آئیں گے۔ وہ مانتے ہیں کہ امام جعفر صادق کے بعد اصل امام اسماعیل ہیں ان کے بھائی موسیٰ کاظم نہیں ہیں۔ یہ لوگ اسماعیلی کہلائے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ موجود ہے نہ غیر موجود ہے، علیم وخبیر ہے نہ غیر علیم وخبیر ہے اور قادر ہے اور نہ غیر قادر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ کے ساتھ کوئی بھی وصف منسوب نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہی تمام اوصاف کا خالق ہے۔ حتیٰ کہ تمام نام اور اوصاف اسی کی تخلیق ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ کے ثبوت کے بغیر زمین کا وجود نہیں اور یہ ثبوت دو قسم کا ہے۔ ایک ''ناطق'' اور دوسرا ''صامت۔'' ناطق ثبوت پیغمبر ہیں اور صامت ثبوت امام ہیں جو پیغمبر کے احکام کی تعمیل کراتے ہیں۔''

''اسماعیلیوں کے نزدیک اللہ کے ثبوت کا اصول سات کے عدد کے گرد مسلسل گردش کرتا رہتا ہے۔ پیغمبر جو اللہ کی طرف سے بھیجا جاتا ہے اس کا کام آنے والے زمانوں کی خبر دینا، آسمانی صحائف کی تعلیم دینا اور الوہی اسرار کی جانب اللہ کے بندوں کی رہنمائی کرنا ہے۔ پیغمبر کے بعد سات امام ہیں جو ان کے احکام پر عمل کراتے ہیں۔ ان کے پاس اسرارِ الٰہی کی طرف رہنمائی کرنے کی طاقت تو ہے مگر آنے والے زمانوں کی خبر دینے کی طاقت نہیں ہے۔ لیکن ان میں سے آٹھویں امام کے پاس یہ طاقت ہے اور وہ اپنی جگہ پیغمبر کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے بعد سات کا دور پھر دہرایا جاتا ہے۔ اسماعیلیوں نے قاہرہ میں فاطمی سلطنت قائم کی۔ یہ نام انہوں نے آنحضرتؐ کی صاحب زادی حضرت فاطمہؓ کے نام پر رکھا تھا۔ فاطمی اپنے آپ کو جائز خلیفہ کہتے تھے لیکن ان کی رعایا کی اکثریت سنی تھی۔ فاطمیوں نے ۹۰۹ء سے ۱۰۳۶ء تک شمالی افریقہ، مصر اور شام پر مسلسل حکم رانی کی۔ ساتویں امام المستنصر باللہ معید بن علی کی وفات کے بعد ان کے بیٹوں نزار اور المستعلی میں وراثت کے مسئلے پر جھگڑا ہو گیا اور خلافت اور امامت کا تنازع خوں ریز جنگ کا سبب بن گیا۔ المستعلی جیت گیا اور اس نے اپنے بھائی نزار کو گرفتار

کر کے جیل میں ڈال دیا۔ نزار جیل میں ہی فوت ہوگیا۔ آپ سن رہے ہیں نا؟"

"جی سن رہا ہوں۔" مگر مجھے اس وقت احساس ہوا کہ ان باتوں کو سمجھنے کے لیے پی ایچ ڈی کرنا کیوں ضروری ہے۔

رضا نے وضاحت کی کہ آج کل اسماعیلی دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ المستعلی کے ماننے والوں نے ۱۱۷۱ء تک مصر پر فاطمی سلطنت برقرار رکھی۔ آخر صلاح الدین ایوبی نے جہاں ایک طرف صلیبی طاقتوں کا خاتمہ کیا وہاں فاطمی سلطنت ختم کر کے مصر پر ایوبی سلطنت قائم کر دی۔ یہ اسماعیلی مصر سے تو ختم ہو گئے لیکن کچھ عرصے بعد وہ ہندوستان میں نمودار ہوئے۔ آج کل وہ بوہرہ اسماعیلی کہلاتے ہیں۔ جن لوگوں نے نزار کا ساتھ دیا وہ نزاری کہلاتے ہیں۔ نزار کا قریبی ساتھی حسن بن صباح تھا۔ نزار کی وفات کے بعد المستعلی نے اسے مصر سے نکال دیا تھا۔ وہ ایران آگیا اور اور کچھ عرصے بعد اس نے قزوین میں قلعہ آلموت بنایا اور لوگوں کو نزاری فرقہ میں شامل ہونے کی دعوت دینے لگا۔

اب ہم قزوین پہنچ گئے تھے۔ اس روز کا میرا سبق مکمل ہو چکا تھا۔ میرا دماغ تاریخ کی بھول بھلیوں میں گھوم رہا تھا۔ میں نے نگاہیں اس شہر کی طرف گھمائیں، مجھے لگا کہ میں بہت پیچھے ماضی میں الف لیلہ کے زمانے میں پہنچ گیا ہوں۔ وہاں ہر جانب مینار تھے، گنبد تھے، محرابیں تھیں، اونچے اونچے شاندار دروازے تھے، مقبرے تھے، حمام تھے، پھول پتوں سے مزین طغرے اور خطاطی کے خوبصورت نمونے تھے اور منقش کواڑ تھے۔ اس گنجان آباد شہر میں یہاں سے وہاں تک عظیم الشان عمارتیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان میں وہ جامع مسجد بھی تھی جسے ہارون الرشید نے آٹھویں صدی میں تعمیر کیا تھا۔ اس شہر نے ابھی تک کاروان سرائے کی وہ فضا اپنے اندر محفوظ کر رکھی ہے جس کی وجہ سے جیمز ایلرائے فلیکر نے اسے سمرقند جانے والی طلائی شاہراہ کا نام دیا تھا۔ وہ شاہراہ ریشم جو ایشیا کے تجارتی راستے کو مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق تک ملاتی ہے۔ یہاں اب بھی وہ بازار ہیں جہاں منی ایچر تصویریں، کپڑے، قالین، اور دیگر انواع واقسام کی چیزیں فروخت ہوتی ہیں۔ خواب اور حقیقت ہمیشہ ہی ایک دوسرے سے الگ نہیں رہتے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ حقیقت کی ایسی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جو خواب جیسی ہوتی ہے اور آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ دونوں میں ایک باریک سا رشتہ موجود ہے۔ لیکن کھلی آنکھوں والے سیاح کو بھی مقامی روایات کا احترام کرنا پڑتا ہے۔ میرے مربی غزالی نے جو فرسٹ کلاس کے

مسافر تھے۔ اس شہر میں اپنا دنیاوی سفر مکمل کیا تھا۔ میں نے رضا سے درخواست کی وہ مجھے ان کے مزار پر لے چلے۔ میں نے مزار پر فاتحہ پڑھی۔

میں اس بازار میں تھوڑی دیر گھومنا چاہتا تھا اور اپنے تخیل کو تجارت کے اس زمانے میں لے جانا چاہتا تھا جب نو دولتے یورپی سوداگروں نے یہ تہیہ نہیں کیا تھا کہ دنیا بھر کی تجارت پر وہ خود قبضہ کرلیں۔ رضا کو جلدی تھی وہ جلد سے جلد مستقبل کی طرف روانہ ہونا چاہتا تھا۔ کھانے کے بعد ہم نے انیسویں صدی کی سردار مسجد میں نماز ادا کی اور پھر اپنا سفر شروع کر دیا۔ ہم قزوین سے نکلے تو یوں لگا جیسے خواب سے باہر آگئے ہیں۔ اب سڑک ایک بنجر میدان کے ساتھ چل رہی تھی۔ آخر ہم نے ناہموار پہاڑی راستے پر چڑھنا شروع کیا۔ یہ راستہ درہ چلا کی طرف جاتا تھا۔ رضا کو ان ٹیڑھے میڑھے راستوں پر اپنی کار چلانے کے لیے بہت ہی احتیاط کرنا پڑ رہی تھی۔ کبھی کبھی تو کوئی موڑ مڑنے کے لیے اسے کار کو پیچھے لے جانا پڑتا۔

ہم چلا گاؤں سے باہر نکلے تو راستہ اور بھی دشوار ہوگیا۔ ہمارے خیالات دوبارہ اپنے مقصد کی طرف منتقل ہوگئے۔ رضا نے اپنا بیان وہاں سے پھر شروع کیا جہاں حشیشین اس کہانی میں وارد ہوئے تھے۔

''جب حسن بن صباح آلموت پہنچا'' رضا نے کہنا شروع کیا ''اس وقت ایران پر سلجوق حکمرانی کر رہے تھے۔ سلجوق سلطنت خاص نظام مراتب کے تحت چل رہی تھی۔ سب سے اوپر سلطان تھا۔ جس کی مدد کے لیے ایرانی وزرا اور عمال حکومت تھے۔ ادھر ترک سپہ سالاروں کی کمان میں ایک بین الاقوامی فوج سلطنت کی حفاظت کر رہی تھی۔ ظاہر ہے سلجوق ان نو وارد لوگوں سے بالکل خوش نہیں تھے جو شمال میں اپنا تسلط قائم کرنا چاہتے تھے۔ حسن بن صباح ایک متقی پرہیز گار قسم کا انسان تھا۔ تمام دنیاوی آلائشوں سے دور۔ اس کے نزدیک سلجوق سلطنت فاسق و فاجر سلطنت تھی۔ اس کے خیال میں اس سلطنت کو تباہ کرنا ضروری تھا۔ اس مقصد کے لیے اسے شہنشاہ سے ناراض مقامی لوگوں کی حمایت حاصل ہوگئی۔ یہاں کسی ایک شخص کے گرد جمع ہوجانے اور اس سے وفاداری کا رشتہ استوار رنے کی روایت بہت پرانی تھی۔ لیکن اس کے لیے مشکل یہ تھی کہ اس کے وفادار تو کم تھے اور سلجوق فوج کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اسے سلجوق سلطنت سے لڑنے کے کسی کارگر ہتھیار کی ضرورت تھی۔

''وہ اس شیعہ عقیدے پر عمل کر رہا تھا کہ ظالم اور گناہ گار حکومت کے خلاف بغاوت جائز

ہے۔"

حضرت علی کی شہادت کے بعد اسماعیلی اور باقی شیعان علی یہ سمجھتے تھے کہ یہ حکمرانوں کو قتل نہیں کیا جارہا بلکہ ان کے امام شہید کیے جا رہے ہیں۔ چنانچہ اسماعیلیوں کے لیے یہ قتل محض بغاوت ہی نہیں تھی بلکہ یہ ایک نیکی کا کام تھا اور نیک کام کے لیے ہر شخص اپنی جان دینے کو بھی تیار ہوجاتا تھا۔ حسن بن صباح ان عام آدمیوں پر بھروسہ کرتا تھا جن کے پاس کھونے کو کچھ نہیں ہوتا اور جو زندگی پر موت کو ترجیح دیتے ہیں وہ اپنا ہر شکار نہایت احتیاط کے ساتھ چنتا تھا تاکہ سلطنت کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جاسکے۔"

"آپ کا مطلب ہے سنّی شکار؟" میں نے اسے ٹوکا۔

"نظام۔ اس کے شکار دو تھے۔ ایک تو شہزادے، افسر اور وزیر اور دوسرے مذہبی رہنما اور وہ علما جنہوں نے اس کے فرقے کی مذمت کی ہو۔ انہیں ایک ہی ہتھیار سے مارا جاتا تھا جو خاص نزاری روپ کا ہتھیار تھا۔ بعض چھرا استعمال کرتے، کچھ گلا گھونٹ دیتے اور کچھ اپنے شکار کو ڈنڈے مار مار کر ہلاک کر دیتے۔ وہ زہر یا تیر وغیرہ کبھی استعمال نہیں کرتے تھے۔ حالانکہ وہ زیادہ محفوظ ہتھیار تھے۔"

اب ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں طالقان اور آلموت دریا مل کر شاہ دریا بن جاتے ہیں۔ سڑک پر پانی بہہ رہا تھا۔ اور ہماری کار آلموت دریا کے اتھلے پانی میں چل رہی تھی۔ چند کیلو میٹر کے فاصلے پر ہمیں سڑک مل گئی۔ چند گھنٹے اور چل کر ہم ایک گاؤں پہنچ گئے۔ اس گاؤں کا نام شاہرک تھا۔ اب اندھیرا ہونے لگا تھا۔ رضا نے کہا رات گزارنے کے لیے ہمیں کوئی جگہ تلاش کرنا چاہیے۔ اس رات ہم ایک کافی شاپ کے برآمدے میں سوئے جہاں مچھروں کی فوج ظفر موج نے رات بھر مجھے سونے نہیں دیا۔

صبح کو ہم پیدل ہی چل پڑے۔ رضا نے اپنی کار ایک پٹرول پمپ پر کھڑی کردی۔ وہاں ایک آدمی کو پیسے دیے کہ وہ اس کا خیال رکھے۔ ہم نے آلموت دریا کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کیا۔ "یہی وادی ہے۔" رضا نے کہا جہاں سے نزاریوں نے اپنی مذہبی سلطنت پر حکم رانی کی۔ وہ بہت ہی بے ضرر سی جگہ نظر آرہی تھی۔ کسان وہاں چاول کاشت کرتے تھے، اسی لیے ہمارا راستہ پانی سے بھرا ہوا تھا۔

"انہوں نے کتنے آدمی قتل کیے؟" میں نے پوچھا۔

''کافی ہوں گے۔ مگر اتنے بھی نہیں جتنا کہانیوں میں بیان کیا جاتا ہے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان شیوخ کی سلطنت ۱۰۹۰ء سے ۱۲۵۶ء تک ایک سو پچاس سال قائم رہی۔ حسن صباح کے بعد اس کے سات جانشینوں نے حکومت کی۔ اس کے بعد منگولوں نے ان کا اقتدار ختم کر دیا اور اس علاقے پر قبضہ کر لیا۔ لیکن حشیشین کی انتہا پسندی اور دہشت گردی کی شدت حسن سوئم تک بہت کم ہو چکی تھی۔ حسن سوئم کو عباسی خلیفہ الناصر نے ۱۱۶۶ء کے قریب سنی بنا لیا تھا۔ اس لیے حشیشین کی دہشت گردی اصل میں صرف ۶۶ سال ہی رہی۔ لیکن ایک بات اور بھی ہے۔ قتل کی ان وارداتوں نے سنی دنیا کو کچھ زیادہ نقصان نہیں پہنچایا۔ سنیوں نے حشیشین اور ان کی طاقت کے بارے میں کافی بڑھا چڑھا کر داستانیں بنا ڈالیں۔ حالانکہ ان کی طاقت اتنی نہیں تھی۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ سارا قصور سنیوں کا ہے؟'' میں نے کہا۔

''مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے اس کی ذمہ داری قبول کر لی۔''

ہم نے ایک نہایت خطرناک پل سے دریا پار کیا۔ یہ پل لکڑی کے دو پتلے پتلے شہتیروں پر کھڑا تھا۔ ہم کوہ البرز کے سائے میں چل رہے تھے۔ پہاڑ پر سے آبشار گر رہا تھا جس سے پورا منظر بہت حسین ہو گیا تھا۔

''سنیوں کو ایک ولن کی ضرورت تھی۔'' حفاظت کے ساتھ پل پار کرنے کے بعد رضا نے پھر کہنا شروع کیا۔ ''اور حسن بن صباح اس کے لیے سب سے موزوں آدمی تھا۔ اب عمر خیام اور سلجوق سلطنت کے وزیر نظام الملک طوسی کی دوستی کو ہی لے لیجے۔ کہانی یہ بیان کی جاتی ہے کہ حسن بن صباح ان دونوں کے ساتھ مدرسے میں پڑھتا تھا۔ یہ تینوں ہی عظیم شخصیت بنے۔ یہ تینوں بہت گہرے دوست بن گئے اور انہوں نے قسم کھائی کہ ان میں سے جو بھی پہلے بڑا آدمی بنے گا وہ باقی دونوں کی ترقی میں بھی مدد دے گا۔ اب یوں ہوا کہ نظام الملک طوسی نے یہ مقام پہلے حاصل کر لیا اور وہ سلجوق سلطنت میں بہت بڑی شخصیت بن گیا۔ اسے اپنا حلف یاد تھا۔ اس لیے اس نے اپنے دونوں دوستوں کو صوبوں کی صوبیداری پیش کی۔ عمر خیام نے صوبہ داری کے بجائے ایک مستقل وظیفہ قبول کر لیا۔ حسن نے نظام الملک کی پیش کش قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ عہدہ اس کے منصب سے کمتر تھا۔ نظام نے اس سے بڑا عہدہ پیش کیا جسے اس نے قبول کر لیا اور وہاں اس نے کارہائے نمایاں انجام دئے۔ جلد ہی نظام الملک کو اس سے خطرہ

محسوس ہونے لگا کہ وہ اس کا مدمقابل بن گیا ہے۔ چنانچہ نظام الملک اس کے خلاف ہوگیا۔ حسن کو یہ معلوم ہوا تو وہ وہاں سے فرار ہوگیا۔اس کے بعد حسن نے جب اپنا قلعہ بنالیا اور وہ اپنے کام میں کامیاب بھی ہوگیا تو اس کا پہلا شکار نظام الملک طوسی ہی بنا۔''

''اس کہانی میں تو کوئی خرابی نظر نہیں آتی ۔معلوم ہوتا ہے ایسا ہی ہوا ہوگا۔''

ہم ایک چھوٹے سے گاؤں کے قریب سے گزر رہے تھے۔رضا نے میدان میں کھیلنے والے بچوں کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔

''کہانی تو واقعی بہت اچھی ہے کہ اس طرح حسن بن صباح کو انتقام لینے کا موقع ملا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ تینوں ایران کے مختلف حصوں میں پلے بڑھے اور کبھی اتنے قریب نہیں رہے کہ ایک ہی مدرسے میں پڑھتے۔اس کے علاوہ جب عمر خیام پیدا ہوا تو اس وقت نظام الملک تیس سال کا ہو چکا تھا۔ہم نہیں جانتے حسن صباح کب پیدا ہوا۔لیکن وہ نظام الملک طوسی کی عمر کا نہیں تھا۔مگر ہم جانتے ہیں کہ وہ ۱۱۲۴ء میں فوت ہوا تھا۔اس لیے اگر وہ نظام الملک کی عمر کا ہوتا تو اس کی عمر اس وقت ایک سو سال سے زیادہ کی ہوتی۔لیکن اس کے گرد جو کہانیاں بنائی گئیں انہوں نے اسے غیر انسانی طاقت والا عفریت بنا ڈالا ہے جو اپنے چیلوں کو حشیش کھلا کر اپنے دشمن مارنے کے لیے بھیجتا تھا۔اس کے شکار صرف ایران اور شام میں ہی نہیں تھے بلکہ وہ مصر اور عراق میں بھی تھے ۔ اس کے بارے میں تو یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے یورپ میں بھی اپنے دشمنوں کو ہلاک کرایا۔جیسے یورپ کو اس کام کے لیے اس کی ہی ضرورت تھی ۔''

''جیسے حشیشین کو یہ گھناؤنے کام کرنے کے لیے ہی مذہبی عقائد کی ضرورت تھی ۔''

''نزاری عقیدے میں تھوڑا بہت اسرار یقیناً ہے۔ لیکن حشیشین کا نشے میں بدمست ہونا تصوف کے ایک خاص مسلک کی نشان دہی کرتا ہے جس کا تعلق کسی ایک فرد یا کئی افراد کے ساتھ اندھا دھند دلی لگاؤ سے ہے۔ہوسکتا ہے وہ اپنی مذہبی رسوم میں نشے والی چیزیں استعمال کرتے ہوں۔لیکن نوجوان حشیشین کو، جو خود نہایت ہی پڑھے لکھے، اور کئی زبانوں کے ماہر ہوتے تھے اور نہایت صبر وتحمل کے ساتھ منصوبہ بندی کرنے کے ماہر تھے، انہیں اپنے مقاصد کے لیے مذہبی عقیدے کے سوا اور کسی نشہ کی ضرورت نہیں تھی۔اب ہم قاصر خاں گاؤں پہنچ گئے تھے۔یہاں آلموت دریا کی ایک شاخ بہتی تھی ۔ یہ دیہی جنت کا ایک مثالی نمونہ تھا۔ہر طرف گھروں کی صاف ستھری چھتیں اور شوخ رنگوں سے پینٹ کیے ہوئے دروازے نظر آرہے تھے۔

کچھ گھر باغیچوں میں گھرے ہوئے تھے جہاں ہرے بھرے پتوں اور پھولوں کی مہک آرہی تھی۔ کئی گھروں کی چھتوں پر انگور کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں۔جن سے انسان کے بنائے ہوئے مکان قدرت کے حسن میں ضم ہوگئے تھے۔

''گاؤں کے پیچھے دیکھیے،'' رضا نے ایک پہاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔'' یہ کوہ ہودیگان ہے اور یہ'' اس نے اس بڑی پہاڑی کے دامن میں کھڑی ایک چھوٹی پہاڑی کی طرف اشارہ کیا'' آلموت کے قلعہ کا مقام ہے۔''

دور سے وہ پہاڑی کچھ زیادہ رعب دار معلوم نہیں ہو رہی تھی ۔مگر جب ہم اس کے قریب پہنچے تو اندازہ ہوا کہ وہ کتنی ہیبت ناک اور کتنی بارعب پہاڑی ہے ۔ایک جانب سے تو وہ باقی دنیا کے لیے ایک ناقابل تسخیر نہایت ہی مضبوط فصیل بن گئی ہے۔ البتہ قلعہ روئے زمین سے ہی غائب ہوچکا ہے ۔اس جگہ جو ٹوٹے پھوٹے پتھر پڑے تھے وہ بتا رہے تھے کہ یہاں کبھی کوئی قلعہ تھا۔

''ادھر دیکھیے'' رضا نے ایک چوٹی کی طرف اشارہ کیا'' وہ سامنے حسن صباح کی انگور کی بیلیں ہیں۔''

''اور وہ'' میں نے گاؤں کے ان لوگوں کی طرف اشارہ کیا جو حیرت سے ہمیں دیکھ رہے تھے'' وہ اس کے بچے کھچے حشیشین ہیں۔''

''نہیں نہیں۔ان لوگوں کا حشیشین سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔منگولوں کے حملے کے بعد یہاں حشیشین کا نام ونشان بھی نہیں رہا تھا۔ وہ تو بہت بعد میں کہیں جاکر آپ کے ملک میں نمودار ہوئے ۔''

''انگلستان میں؟'' میں نے مذاق کیا۔

''جی'' رضا نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔'' اور پاکستان میں۔یہ حشیشین اب آغا خانی بن گئے تھے۔مغربی دنیا کے مشہور پلے بوائے آغا خاں کوہ آلموت کے اسی حسن بن صباح کی براہ راست اولاد سے ہیں۔اب وہ انسانوں کو قتل نہیں کرتے لیکن ان کی مذہبی رسمیں اسی کی باقیات ہیں۔''

اب ہمارے گرد گاؤں کے لوگوں کا ہجوم ہوگیا تھا ۔ وہ بڑی دلچسپی سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔رضا نے کھانے کے لیے نہایت ہی لذیذ پیسٹری اور چاولوں کا انتظام کرلیا۔ کھانے کے بعد ایک آدمی ہمیں کوہ آلموت لے جانے کو تیار ہوگیا۔ہم اس پہاڑی راستے سے اوپر چڑھے جو

اصل ہو دیگان پہاڑ سے جا ملتا ہے۔ وہاں ہم نے قلعہ کے آثار دیکھے۔

''وہ مشہور فردوس بریں کہاں ہے؟'' میں نے رضا سے پوچھا۔

''اگر کوئی باغ تھا تو وہ ادھر ہوگا۔'' اس نے دور ایک جانب اشارہ کیا۔'' وہ یہاں سے نظر نہیں آئے گا۔ آپ کو نیچے اترنا پڑے گا۔''

رضا نے جس طرف اشارہ کیا تھا میں اس جانب چل پڑا اور پہاڑی کے ایک کنارے پر جا کر کھڑا ہوگیا۔ وہاں ایک بہت بڑی گھاٹی تھی۔ تو یہ فردوس بریں تھا؟ وہاں سے نیچے اترنا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ مگر ہمارے گائڈ نے اصرار کیا کہ ادھر اترنا آسان ہے۔

''کمال ہے'' رضا بولا۔ ''اتنی دور سے آپ فردوس بریں دیکھنے آئے ہیں اور اب کہہ رہے ہیں کہ نیچے جا کر اسے نہیں دیکھیں گے۔''

میں وہاں جم کر کھڑا ہوگیا۔ ''میں فردوس دیکھنے آیا ہوں خودکشی کرنے نہیں آیا۔''

ہم چند قدم نیچے اترے اور ایک غار کے دہانے پر بیٹھ گئے۔ وہاں سے ہم اپنے سامنے پھیلا منظر دیکھنے لگے۔

''حسن بن صباح نے بھی وادی آلموت یہیں سے دیکھی ہوگی۔'' رضا بولا۔

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ میں پہاڑی کے اس عمودی کنارے پر حیرت زدہ کھڑا فردوس بریں کے اس نظارہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس وقت میں لفظوں میں اپنے خیالات ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے رضا سے کہا تھا۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں مرنا نہیں چاہتا۔ لیکن یہ تو اس سے بھی زیادہ تھا۔ میں ایسی جنت چاہتا تھا جس میں سرسبز و شاداب پھلتا پھولتا باغ ہو، ایسی جنت نہیں جو میرے دل میں مرنے بلکہ قتل کرنے کی آرزو بیدار کرے۔

وہ رات ہم نے قاصر خاں گاؤں میں گزاری اور صبح ہی صبح ہم شاہرک کی طرف روانہ ہوگئے۔ اب کوئی ایسی چیز نہیں رہ گئی تھی جو رضا کو تہران جانے سے روکے۔ ہم نے اس کی پرانی زنگ خوردہ شیورلیٹ لی اور قزوین روانہ ہوگئے۔ اب اس نے تاریخ کے استاد کا اپنا رول ترک کردیا تھا اور اپنے بارے میں، امام خمینی کے بارے میں اور آنے والے انقلاب کے بارے میں بتانے لگا تھا۔

''یہ امام کا معاملہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔'' میں نے کہا۔ ''اگر آپ سیاسی اور مذہبی رہنمائی کسی ایک ہی شخص کے سپرد کردیں گے تو آپ مصیبت کو دعوت دیں گے۔''

''لیکن امام معصوم ہیں۔ وہ غلطی نہیں کر سکتے۔'' اس نے کہا۔

''یہی تو پریشانی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اگر کوئی آدمی فرشتہ نہیں بلکہ انسان ہے تو وہ خطا سے مبرا اور بالکل معصوم کیسے ہوسکتا ہے؟ اور اگر امام خمینی بھی دوسرے حسن بن صباح ثابت ہوئے تو کیا ہوگا؟''

میں نے رضا کو دیکھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ اس نے میرے سوال کو نظر انداز کر دیا اور اماموں کے مسئلے پر عالمانہ گفتگو شروع کر دی کہ امام کا مطلب کیا ہوتا ہے اور مذہب میں ان کا مقام کیا ہے اور پھر بارہ اماموں کی تاریخ بیان کرنے لگا۔ وہ جتنا بیان کرتا جاتا میرے شبہات اور بھی بڑھتے جاتے اور جب اس نے کہا کہ بارھویں امام کیسے غائب ہوئے اور کیسے وہ مہدی موعود کی حیثیت سے ظاہر ہوں گے تو مجھ سے نہیں رہا گیا۔

''فرض کرلو۔ اگر بارھویں امام غائب نہ ہوتے، اگر وہ کہیں گم ہوجاتے، یا کسی کنویں میں گر جاتے جہاں انہیں کوئی نہیں دیکھ پاتا۔ تو پھر کیا ہوتا؟''

یہ میری زیادتی تھی۔ پرانی شیورلیٹ ایک لمبی چوں کے ساتھ رک گئی۔ رضا نے زور سے بریک پر پاؤں رکھ دیا تھا۔ ''برادر ضیا'' اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''آپ میں دو خرابیاں ہیں۔ ایک تو آپ بزدل ہیں۔ آپ اتنی دور سے حسن بن صباح کی جنت دیکھنے آئے مگر پہاڑی سے نیچے اترنے سے ڈر گئے۔ ٹھیک ہے وہ بہت سیدھی ڈھلان ہے مگر کم سے کم آپ کوشش تو کر سکتے تھے۔ دوسرے آپ اپنا مُنھ بند نہیں رکھ سکتے۔'' اب رضا نے مجھے مُنھ کھولنے کا موقع نہیں دیا۔ ''مہربانی کرکے آپ اپنا سوٹ کیس اٹھایئے اور میری کار سے اتر جایئے۔ تہران جانے کے لیے خود ہی کوئی چیز تلاش کر لیجے۔''

اور اب میں گرد و غبار سے اٹی سڑک پر اپنا سوٹ کیس لیے تنہا کھڑا تھا۔ یہ راستہ قزوین کو جاتا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب میں کیا کروں۔ مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ یہاں سے قزوین کتنی دور ہے۔ کسی بھی فرسٹ کلاس مسافر کی سب سے بڑی غلطی یہ مانی جاتی ہے کہ اسے جغرافیے، فاصلے اور سمتوں کا علم ہی نہ ہو۔

اسی وقت مجھے دور سے ایک گاڑی آتی دکھائی دی۔ بلکہ ایک نہیں وہ تو کئی لاریوں کا ایک قافلہ تھا۔ میں شاہراہ ریشم پر کھڑا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو یاد دلایا کہ یہ شاہراہ معلوم انسانی

تاریخ میں تجارت، لوگوں کی آمد ورفت اور علم وفضل کے سفر کا نہایت اہم وسیلہ رہی ہے۔ واقعی وہ کاروان ہی تھا۔ میں نے اپنے انگوٹھے سے اشارہ کیا "تہران؟" ڈرائیور نے سر ہلایا "نہیں۔ کرمان شاہ۔" جس شخص کو سمت کا احساس ہی نہ ہو اس کے لیے کرمان شاہ اور تہران ایک ہی بات ہے۔ میں فوراً ٹرک پر چڑھ گیا۔

ہٹا کٹا ٹرک ڈرائیور جس کی داڑھی کئی دن کی بڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھی بہت اچھے موڈ میں تھا۔ اس نے جیب سے دو سگریٹ نکالے۔ دونوں کو اپنے مُنھ میں رکھ کر ماچس سے سلگایا اور جلتی ماچس سڑک پر پھینک کر ایک سگریٹ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے زور سے کہا میں سگریٹ نہیں پیتا۔ مگر وہ برابر اصرار کرتا رہا۔ آخر میں نے سگریٹ لے لیا اور اسے پینے کا بہانہ کرنے لگا۔

"تم کیا لے جارہے ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔ اس نے جواب دیا۔ مگر مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ میری سمجھ میں اس کا ایک لفظ بھی نہیں آرہا تھا۔ لیکن وہ مسلسل بولے جارہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ دو دو سگریٹ بھی سلگا رہا تھا۔ جس تیزی سے وہ سگریٹ سلگاتا اسی تیزی سے وہ پی بھی لیتا۔ آخر ایک لفظ پیرافین میری سمجھ میں آیا۔ وہ پیرافین لیے جا رہا تھا اور وہ آرام کے ساتھ سگریٹ پر سگریٹ پی رہا تھا اور جلتی ہوئی تیلیاں نیچے پھینک رہا تھا۔ اسے آگ لگنے کا کوئی ڈر نہیں تھا، گویا میں بارود کے ڈھیر پر بیٹھا سفر کر رہا تھا اور یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کہاں جا رہا ہوں۔ وہ اپنی کہانی سنا رہا تھا۔ میں خواجہ نصرالدین بنا خواہ مخواہ سر ہلا رہا تھا جیسے میں اس کی باتیں سمجھ رہا ہوں۔ جب وہ ہنستا تو میں بھی قہقہہ لگا دیتا اور جب مجھے احساس ہوتا کہ وہ کوئی سوال کر رہا ہے تو میں جواب بھی دے دیتا۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ میرے ڈرائیور کا صرف موڈ ہی خوش گوار نہیں ہے وہ تو نشے میں بھی ہے۔ شاید یہ خیال مجھے اس وقت آیا ہوگا جب میں نے اندازہ لگایا کہ ڈرائیور ہی نہیں میں خود بھی نشے میں ہوں۔ راستے بھر وہ مجھے جو چیزیں کھلاتا رہا تھا ان میں کچھ ایسا ہی تھا۔ اب میں بھی ایک ساتھ دو سگریٹ سلگا رہا تھا اور جلتی ہوئی تیلیاں کھڑکی سے باہر پھینک رہا تھا۔

وہ شہر ہمدان میں رکا اور ٹرک میں پٹرول ڈلوایا اور پھر پہاڑی راستوں پر روانہ ہوگیا۔ آخر مجھے نیند آگئی۔ جب کئی گھنٹے بعد میں جاگا تو ہم کرمان شاہ میں تھے۔ معلوم ہوا کہ میں جغرافیہ کی ڈاکٹر خان کی تھیوری پر عمل کر رہا ہوں۔ کرمان شاہ تہران سے جنوب مغرب میں

پورے چھ سو کیلو میٹر دور ہے۔ ہم ٹرکوں کے اڈے پر کھڑے تھے۔ میرا ٹرک ڈرائیور دوسرے ڈرائیوروں کے ساتھ گرما گرم بات چیت میں مصروف تھا۔ میں جان گیا کہ وہ میرے بارے میں باتیں کررہے ہیں۔ میں بھی ان میں شامل ہوگیا۔ اب میرے چہرے پر بھی کئی دن کی بڑھی ہوئی داڑھی تھی اور میں بھی ان میں سے ہی نظر آرہا تھا۔ انہوں نے مجھے اپنا ہی بنا لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم پرانے دوستوں کی طرح اکٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ان کی باتیں میری سمجھ میں تو نہیں آرہی تھیں مگر مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ یہ بات کررہے ہیں کہ مجھے تہران کون لے کر جائے گا۔ کوئی بھی اس کے لیے تیار نظر نہیں آرہا تھا۔ لیکن مجھے اندازہ ہوا کہ کچھ ٹرک بغداد جارہے ہیں۔ اب مجھے یہ بہتر معلوم ہوا کہ تہران کی طرف واپس جانے کے بجائے میں الف لیلہ کے شہر بغداد چلا جاؤں۔ میں نے اپنا سوٹ کیس ٹرک سے نکالا اور بغداد جانے والے دوسرے ٹرک میں رکھ دیا۔ میں اس ٹرک پر چڑھ گیا اور آٹھ گھنٹے سے بھی کم میں میں ہارون الرشید کے شہر میں تھا۔

باب۔٦

صدر اور کسان

میں بغداد کے ایک علاقے علوی الحلہ میں ٹھہرا۔ ہوٹل کچھ زیادہ اچھا تو نہیں لگتا تھا مگر پھر بھی میں اندر گیا اور دریافت کیا کہ کوئی کمرہ مل جائے گا؟

''بالکل مل جائے گا۔'' ریسپشن کلرک نے فورا جواب دیا۔اس نے مجھ سے پیسے لیے اور مجھے ساتھ لے کر اوپر کی منزل کی طرف چل دیا۔ وہاں ایک بہت ہی وسیع چوکور کمرہ تھا۔وہ مجھے اس ہال نما کمرے میں لے گیا۔

''وہ ہے آپ کا بستر۔'' اس نے کہا۔''یہ تھوڑا سا گندہ تو ہے مگر مجھے یقین ہے آپ اس پر آرام سے سو جائیں گے۔''

''گندہ؟'' میں نے جواب دیا''یہ تو بستر ہی نہیں ہے۔ یہ تو صرف فوم کا گدہ ہے اور وہ تکیہ پر لال لال کیا رینگ رہا ہے؟''

''اوہو۔ ان کھٹملوں کے لیے میں معافی چاہتا ہوں۔'' وہ واقعی پریشان ہوگیا تھا۔''ہم ان کا کچھ نہیں کر سکتے۔ مگر وہ اجنبی لوگوں سے کچھ نہیں کہتے۔ شاید اس کی وجہ غیر ملکی خون ہو۔'' وہ میرا ردعمل جاننے کے لیے کچھ ٹھہرا۔''آپ بالکل محفوظ رہیں گے۔ مگر میں آپ کے سوٹ کیس کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔''

اس وقت میرے اندر کوئی دوسرا ہوٹل ڈھونڈنے کی بالکل ہمت نہیں تھی۔''چلو، میں یہیں گزارا کرلوں گا۔'' میں نے مجبور ہوکر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کہا۔ وہ جو میں نے مسافروں کے

درجے بنائے تھے اب وہ اس سفر اور اس رہائش کے بعد آہستہ آہستہ رخصت ہوتے جا رہے تھے۔
''ٹھیک ہے'' اس نے کہا ''شب بخیر۔ لیکن اپنے سوٹ کیس کا خیال رکھنا۔ پچھلے دنوں یہاں کئی چوریاں ہو چکی ہیں۔''
میں نے سوٹ کیس تکیہ کے ساتھ رکھا اور فوم پر دھڑام سے گر گیا۔ کمرے کے دوسرے کونے میں اسی طرح کے گدّوں پر لیٹے دو آدمی اتنی زور زور سے باتیں کرنے اور شعر و شاعری کرنے میں مصروف تھے کہ میں ان کی ایک ایک بات صاف سن رہا تھا۔ ایک آدمی گدے پر بیٹھا اسی علاقے کے محبوب شاعر ابونواس کے شعر جھوم جھوم کر پڑھ رہا تھا۔

ہاں پلاؤ مجھے اور ساتھ کہو بھی کہ یہ شراب ہے
جب کھل کے پلانا ممکن ہو، تو پھر اخفا سے کیوں کام لو
خسارہ تو تب ہے جب تم مجھے ہوش و حواس میں پاؤ
اور فائدہ اس حال میں ہے کہ مدہوشی مجھے جھنجھوڑتی پھرے
اشارے کنائے کا تکلف چھوڑ دو، میری محبوب شے کا کھل کر نام لو
ایسی لذتوں میں کیا مزہ، جو پردوں میں چھپی ہوئی ہوں۔

میں نے دوسری طرف کروٹ لی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ تھکن سے میری ہڈی ہڈی ٹوٹ رہی تھی اور کھٹمل مجھے پردیسی نہیں بلکہ اپنا ہی سمجھ کر میرا خون چوس رہے تھے۔ میں ایک گھنٹے کے قریب یونہی کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر میں خواب دیکھنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک ایسی دیوار کے پاس کھڑا ہوں جو دونوں جانب تا حد نظر چلی گئی ہے۔ میں اس پر چڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر وہ بہت ہی اونچی ہے۔ لگتا ہے کہ وہ آسمان کو چھو رہی ہے۔ میں بار بار چڑھنے کی کوشش کرتا ہوں اور ہر بار ناکام ہو جاتا ہوں۔ اچانک کہیں سے قہقہوں کی آواز آتی ہے جس سے میری توجہ بٹ جاتی ہے۔ وہ ابونواس ہے۔ وہ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا ہے۔ ''اے بے وقوف، تو اس دیوار پر کبھی نہیں چڑھ سکے گا۔''
''بدمعاش، میں تجھے چڑھ کر دکھاؤں گا۔ کوئی چیز میری دسترس سے باہر نہیں ہے۔'' میں غصے میں کہتا ہوں۔
''پہلے مجھے میرے باپ نے چھوڑا پھر میری ماں نے چھوڑ دیا۔ لیکن دیکھو میں اپنے بل

بوتے پر یہاں پہنچا ہوں۔ علمی حلقوں میں میری بہت عزت ہے اور میں خلیفہ ہارون الرشید کا پسندیدہ شاعر ہوں۔ دیوار پر چڑھنا چھوڑ دے اور تو جہاں ہے وہیں رہ ۔ تو بہت کم بوجھ اٹھائے گا اور بہت آگے جائے گا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ تو بھی میری طرح شہرت نہ کمائے۔'' وہ پھر قہقہہ لگاتا ہے، بہت ہی بلند اور چلبلا قہقہہ۔

''کبھی نہیں'' میں کہتا ہوں اور اس کے پیچھے دوڑتا ہوں۔

اسی وقت میری پیٹھ پر کھٹمل نے کاٹا اور میری آنکھ کھل گئی۔ کمرہ خالی تھا۔ دوسرے لوگ جا چکے تھے۔ میں نے تکیہ کیساتھ رکھا اپنا سوٹ کیس ٹٹولا۔ وہ وہیں تھا۔

اب یہ نیا دن تھا۔ اور یہی گھومنے پھرنے اور تلاش کرنے کا وقت تھا۔ میں ہوٹل سے نکلا اور دجلہ کا پل عتیق پار کر کے دوسری طرف چلا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سب سے پرانا پل ہے۔ عربی میں اسے جسر عتیق کہتے ہیں۔ میں ہارون الرشید کا وہ بغداد دیکھنا چاہتا تھا جو نویں صدی میں ایک عالی شان شہر تھا۔ شہر کے اندر شہر ۔ اس طلسمی شہنشاہ ہارون الرشید کا شہر جس کے گرد داستانوں اور حکایتوں کا ایک عجیب وغریب تانا بانا بنا ہوا ہے۔ میں وہ بغداد دریافت کرنا چاہتا تھا جہاں کلاسیکی مسلم تہذیب نے جنم لیا۔ ایک گاؤں کی حیثیت سے بغداد قدیم زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ پورے عراق میں ایسے آثار بکھرے پڑے ہیں جو ہمیں انسانی تہذیب کے آغاز تک لے جاتے ہیں۔ آثار قدیمہ کے ماہران آثار کو تل کہتے ہیں۔ مقامی زبان میں تل کا مطلب ہے پہاڑی یا ٹیلہ۔ میں نے سوچا کہ اسے تل ہی لکھنا چاہیے کیونکہ اس میں اور بھی کئی معنی پوشیدہ ہیں ۔ یہ وہ ٹیلے ہیں جو پرانی منہدم عمارتوں اور پرانے شہروں کے آثار پر ایک زمانے سے بنتے چلے آرہے ہیں۔ گری ہوئی عمارتوں کے ٹیلوں پر نئی عمارتیں بنانے کا یہ سلسلہ ان انسانوں تک چلا جاتا ہے جنہوں نے اس علاقے میں سب سے پہلے کاشت کاری شروع کی ۔ یہ ٹیلے اس علاقے میں انسانوں کی موجودگی، ان کی بود وباش اور ان کے ارتقا کی داستان بیان کرتے ہیں۔ بغداد بابل جیسے قدیم ترین شہر سے چند کیلو میٹر کے فاصلے پر ہے، اور جس زمانے میں ایتھنز ابھی شہر بننے کی ابتدا ہی کر رہا تھا تو بابل دو ہزار سال کی تاریخ کا وارث ایک نہایت اہم مرکز تھا۔ خواب اور حقیقت۔ دجلہ نے تاریخ کے کیسے کیسے دور نہیں دیکھے ہیں۔

یہ دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفر المنصور تھے جنہوں نے بغداد کو عباسی سلطنت کا دارالحکومت بنایا تھا۔ المنصور اپنے علم ودانش کے لیے مشہور تھے ۔ لیکن آٹھویں صدی میں ہارون الرشید کے

زمانے میں یہ شہر قسطنطنیہ کے بعد عالمی تجارت کا دوسرا بڑا مرکز بنا۔ تجارت کے ساتھ یہ شہر اپنے علم و فضل کے لیے بھی دنیا بھر میں مشہور تھا۔ عباسی خلفا نے لائبریریاں بنائیں، تعلیم کے بڑے بڑے مدرسے اور جامع بنائے، ہسپتال، کنویں، نہریں اور دریاؤں کے پشتے تعمیر کیے۔ شہر کے گرد جو تالاب اور دلدلیں تھیں انہیں صاف کرایا جس سے لوگ ملیریا سے محفوظ ہو گئے۔ نویں صدی میں ہارون الرشید کے بیٹے المامون نے دارالحکمۃ بنایا اور سائنسی اور معاشرتی علوم کی تعلیم و تحقیق کے میدان میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ اتنے کم عرصے میں اتنا علمی کام ہوا ہو۔ دارالحکمۃ کے پہلے ڈائرکٹر حنین ابن اسحاق نے طب اور فلسفہ پر جالینوس کی تمام کتابوں اور طبیعیات پر ارسطو کی کتابوں کا یونانی سے ترجمہ کیا۔ اس نے 873ء میں وفات پائی۔ اس سے پہلے اس نے یونانی بائیبل کا عربی میں ترجمہ کر لیا تھا۔ اس کے شاگردوں نے بعد میں افلاطون، بقراط (ہپوکراٹیس)، طولمی، یوکلیڈ، فیثا غورث اور نوفلاطونی فلسفیوں کی کتابیں عربی میں ترجمہ کیں۔ اس شہر کے ابتدائی باشندوں میں سے ایک ابو جعفر محمد ابن موسیٰ الخوارزمی نے آٹھویں صدی کے شروع میں الجبرا دریافت کیا۔ پہلے عرب فلسفی الکندی نے عقل و استدلال کو فروغ دینے کے لیے انتھک محنت کی اور نوفلاطونی فلسفے اور اسلامی فلسفے کا امتزاج پیش کیا۔ ایک اور فلسفی اور طبیب الرازی نے طب پر ایک ضخیم انسائیکلو پیڈیا لکھی اور الغزالی یقیناً اس شہر کے علمی حلقوں میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ ۱۰۶۷ء میں بغداد میں جو پہلا دینی مدرسہ یعنی مدرسۃ النظامیہ قائم ہوا تھا غزالی اس کے شیخ الجامعہ تھے۔

اب بغداد میں کیا باقی رہ گیا ہے؟ میں سوچ رہا تھا۔ بغداد جو علوم و فنون کا سرچشمہ تھا۔ بغداد جو عالمی کلچر کا مرکز تھا اور جس نے یورپ کو انسان بنایا، بغداد جس نے یورپ کو سول سائٹی اور بربریت میں تمیز کرنا سکھایا، طب اور جادو ٹونے میں فرق کرنا سکھایا، تجربی طریقہ کار کی اہمیت سمجھائی، بغداد جس نے مغرب کو تعلیمی اور فلسفیانہ طریق کار بتائے، سرجیکل آلات بنانا سکھائے، دنیا کو یونیورسٹی کا ماڈل بنا کر دیا جس میں نصاب تعلیم کا مکمل خاکہ، مختلف علوم کی اصطلاحات اور انتظامیہ کا مکمل ڈھانچہ موجود تھا۔ یہی بغداد تھا جس نے یورپ کو سوانح حیات، ناول نگاری، شہروں کی تاریخ اور تاریخی اور متنی تنقید کی اہمیت سکھائی۔ مختصر یہ کہ یہ بغداد ہی تھا جس نے لبرل انسان نوازی کا بیش قیمت ورثہ دیا۔ لیکن خود پرست یورپ نے اس ورثہ کو سندباد، الہ دین، حرم کی نیم عریاں عورتوں کے ساتھ ملا کر جنوں اور پریوں کی کہانیوں میں منتقل

کر دیا۔اس طرح اس کے معانی اور مفہوم کو ہی غت ربود کر دیا۔

میں چلتا رہا، چلتا رہا مگر مجھے مشکل سے ایک آدھ ہی ایسی چیز نظر آئی جو چند صدی پہلے کی ہو۔ تیرھویں صدی کا مدرسہ۔ المدرسۃ المستنصریہ، جو کسی زمانے میں بہت بڑی یونیورسٹی تھا، اس وقت بھی موجود تھا، مگر نہایت خستہ حالت میں۔ دجلہ پر عباسی محل اب بھی موجود تھا۔ یہ بھی اسی زمانے کا ہے۔ تمام قدیم آثار خستہ حالت میں ہیں۔ میں سوق السرائے کی طرف مڑ گیا۔ وہاں کتابوں کی دکانیں تھیں۔ چند دکانوں پر پرانی کتابیں اور مخطوطے رکھے تھے۔ بازار کے مغرب میں سڑک کے دوسری جانب کپڑے اور لباسوں کی دکانیں تھیں جن میں عربی اور مغربی لباس ٹنگے تھے۔ میں اپنا سوٹ کیس لیے سوق الصفافیر کی طرف چلا گیا۔ وہاں کچھ کاری گر کام کر رہے تھے۔ ایک آدمی پیتل کی پلیٹ کو گلدان بنانے میں لگا ہوا تھا۔ایک اور آدمی جگ بنا رہا تھا۔ایک خاص لے کے ساتھ یہاں کھٹ کھٹ کی آواز آ رہی تھی ۔اس سے آگے میں اس موڑ کی طرف مڑا جہاں چائے اور گرم مسالوں کی خوشبو آ رہی تھی ۔ایک اور موڑ مڑنے کے بعد میں شارع رشید پر تھا۔

میں نے دیکھا کہ سڑک خالی ہوتی جا رہی ہے۔اچانک وہاں زندگی کے آثار ہی جیسے ختم ہونا شروع ہو گئے۔ لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے اور دکان دار اپنی دکانیں بند کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایک آدمی ایک دکان کے سامنے حیران پریشان کھڑا ہے۔ کہیں سے دو فوجی نمودار ہوئے۔ انہوں نے اس آدمی کو پکڑا اور قریب کی دکان میں دھکیل دیا۔ اور پھر دکان کا دروازہ بند ہو گیا۔ ان چھوٹی چھوٹی دکانوں کے اوپر ایک ہیلی کاپٹر اڑ رہا تھا۔کسی نے مجھے بھی فرنیچر کی ایک دکان میں دھکیل کر فوراً دروازہ بند کر لیا۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا صدر مملکت کا شاہی جلوس گزر رہا تھا۔ ایک کار دو کاریں اور پھر کاریں ہی کاریں۔ میں نے دو سو تک تو گنا پھر میری گنتی ختم ہو گئی۔

میں نے برابر کھڑے آدمی سے پوچھا ''یہ صدر جا رہے ہیں؟

'جی ہاں ۔صدر احمد حسن البکر ۔'' اس نے سرسری طور پر جواب دے دیا۔'' ۱۹۶۸ء میں بعث انقلاب کے بعد یہ صدر بنے ہیں۔''

ہم نے ایک دوسرے سے اپنا تعارف کرایا۔ وہ شخص وزیریہ یونیورسٹی بغداد میں پولیٹکل سائنس کا پروفیسر نکلا۔

''تو یہ بعث ہیں؟اس کا کیا مطلب ہے؟'' میں نے اس کی تدریسی جبلت کو مہمیز دینے کے لیے بڑی معصومیت سے سوال کیا۔

بعث کا مطلب ہے احیا۔دوبارہ زندہ ہونا۔اس نے بتایا۔بعث پارٹی والے کہتے ہیں کہ عربوں کو جس ذلت کا سامنا کرنا پڑا ہے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں اپنی اصل عرب قومیت کی طرف واپس جانا پڑے گا۔انہیں متحدہ عرب قومیت کی طرف واپس جانا ہوگا۔ان کا مقدس اور ابدی مشن یہ ہے کہ عربوں کو سوشلزم کے پرچم تلے اکٹھا کیا جائے۔یہ عرب قوم پرستی کا احیا چاہتے ہیں۔بعث پارٹی کے لوگ عرب تاریخ کے تمام ادوار سے ماورا (اور اس میں اسلامی تاریخ بھی شامل ہے)ایک قدرتی عوامی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔''

''گویا بعث پارٹی کا نظریہ بنیادی طور پر نجات کا نظریہ ہے۔یعنی ارضی جنت کی طرف جانے کا راستہ؟'' میں نے سوال کیا۔

''آپ نے زیادہ صحیح طور پر پیش کیا ہے۔'' اس نے جواب دیا،''بعث فلسفہ کے روحانی رہنما مائیکل عفلق نے یہ نظریہ مسیحائی کے باطنی فلسفہ کے طور پر تخلیق کیا ہے۔عربی میں بعث کا لفظ مسیحی عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ کے دوبارہ زندہ ہوجانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔اسی لیے عربی میں ایسٹر کو یوم البعث کہا جاتا ہے۔چنانچہ عفلق نے یہ پارٹی بناتے ہوئے جب بعث کا لفظ منتخب کیا تو اس کا مقصد عربوں کو ایک آفاقی اور ابدی مشن کا تصور دینا تھا جو اسلامی تقاضوں سے بھی بالا اور ماورا ہے۔عفلق کا کہنا تھا کہ بعث فلسفہ کے تین بنیادی نکات یعنی اتحاد، آزادی اور سوشلزم کی اساس عیسائی عقیدے کی تثلیث پر ہے۔مجھے حیرت ان کے اعلان پر تھی کہ بعث پارٹی آزادی پر ایمان رکھتی ہے۔بعث کے آئین میں کہا گیا ہے کہ تقریر، تحریر، اجتماع، عقیدے اور آرٹ کی آزادی وہ متبرک حق ہے جسے کوئی طاقت بھی نہیں چھین سکتی۔لیکن وہ اس آزادی کو کمیونسٹوں کی طرح استعمال کرتے ہیں۔تقریر، تحریر، نشرو اشاعت اور اجتماع کا حق صرف حکومت کے پاس ہے۔عام شہری اس کے رحم وکرم پر ہیں۔''

''تو ان کے نزدیک سوشلزم کا کیا تصور ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''بعث آئیڈ الوجی اپنے آپ کو سائنٹفک سوشلزم کے ساتھ روحانی سوشلزم کے طور پر بھی دیکھتی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔اس کے بعد اس نے وضاحت کرنا شروع کی کہ انقلاب کی روح ہر چیز کی رہنمائی کرتی ہے۔عفلق کا دعویٰ ہے کہ انقلاب سماجی اور سیاسی پروگرام ہے۔

ایک ایسی قوت اور ایسی جد وجہد جو عربوں کو نئی زندگی کی طرف لے جاتی ہے۔ ان کے نزدیک انقلاب کا مقصد نظام تبدیل کرنے سے زیادہ لوگوں کو تبدیل کرنا ہے۔ انقلاب کے عمل میں بعث پارٹی کا رول یہ ہے کہ وہ عوام کو تبدیل کرے اور انہیں اس راستے پر چلائے جس پر چل کر وہ متحدہ عرب قومیت کے تصور کے مطابق ایک ایسا معاشرہ تخلیق کریں جس میں عوام کی فلاح و بہبود کی ضمانت مل سکے۔''

عرب چاہیں نہ چاہیں بعث پارٹی انہیں ان کی موعودہ جنت تک پہنچائے گی اور اس راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو دور کرے گی۔ یعنی وہ اقتدار حاصل کرے گی۔ چونکہ اس پارٹی کی جڑیں عوام میں نہیں ہیں اس لیے الیکشن میں اسے زیادہ ووٹ نہیں ملتے۔ اس لیے وہ اپنے دشمنوں کو مارنے پر تل جاتے ہیں۔ عراق اور شام میں بعث پارٹی کی تاریخ انقلاب، جوابی انقلاب اور قتل و خون سے بھری ہوئی ہے۔

اس سے مجھے حسن بن صباح کے حشیشین یاد آگئے۔ مجھے بتایا گیا کہ اپنی آنکھیں کھلی رکھو اور ابھی اور دیکھو۔ اگر صدر حسن البکر رکاوٹ بنے تو یاد رکھو کہ نائب صدر ان کے پیچھے کھڑے ہیں۔

''وہ کون ہے؟''

''صدام حسین۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اب ہماری باتیں خطرناک ہوتی جا رہی ہیں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''آپ سے باتیں کر کے خوشی ہوئی۔'' یہ کہہ کر اس نے سڑک کی طرف دیکھا۔ صدر کا جلوس گزر چکا تھا اور اب سڑک صاف تھی۔ وہ جلدی سے وہاں سے نکل لیا۔

سڑک پر پھر زندگی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ میں نے شارع جمہوریہ پر اپنی تلاش کی مہم پھر شروع کر دی۔ آخر میں مسجد خلفا کے پاس پہنچ گیا۔ یہ سادہ مگر خوبصورت میناروں والی بڑی باوقار مسجد ہے۔ میں اس کے باہر والے صحن میں داخل ہوا۔ وہاں فوارے کے پاس ایک بھکاری کھڑا تھا۔ اس نے مانگنے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

''جب تک میں نماز پڑھوں تم میرے سوٹ کیس کا خیال رکھو۔ میں تمہیں ایک دینار دے دوں گا۔'' میں نے اس سے کہا۔ وہ ان عراقیوں کے مقابلے میں زیادہ ہٹا کٹا دکھائی دیتا تھا جو میں نے بغداد میں دیکھے تھے۔

''مگر ابھی تو نماز کا وقت نہیں ہوا۔'' اس نے حیرت سے کہا۔

''میں شکرانہ کے نفل پڑھنا چاہتا ہوں۔ میں نے کل رات بڑی مصیبت میں گزاری ہے اور مشکل سے ہی میرا سوٹ کیس بچا ہے۔

بھکاری نے ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔ ''اس شہر پر چور اچکوں اور قاتلوں نے قبضہ جمار کھا ہے۔ مجھے دو دینار دو۔ میں تمہارے سامان اور جوتوں کی حفاظت کروں گا۔''

میں نے کہا ٹھیک ہے اور مسجد میں چلا گیا۔ نفل پڑھنے کے بعد میں عباسی دور کے فن تعمیر کے اس نادر نمونہ کی خوبصورتی دیکھتا رہا۔ باہر نکلا تو وہ بھکاری غائب تھا۔ وہ میرا سوٹ کیس اور جوتے بھی لے بھاگا تھا۔ یہ مسجد میرے دماغ پر محض اس لیے ہی نقش نہیں ہوگئی ہے کہ وہاں میرا نقصان ہوا تھا بلکہ یہی وہ مسجد ہے جو عراق کی پہلی جنگ میں سی این این اور دوسرے ٹیلی وژن نیٹ ورک کے کیمروں کی زد میں رہی۔ یہ نیٹ ورک جب ہوٹل کی چھت سے وہاں پیش آنے والے واقعات اپنے ناظرین کو دکھاتے تھے تو یہی مسجد سامنے ہوتی تھی۔

میں نے سستے سے چپل، ایک تھیلا اور کچھ سامان خریدا اور ابونواس کا وہ مشورہ یاد کیا جو اس نے مجھے خواب میں دیا تھا۔ اب میرے پاس کوئی سامان نہیں تھا اس لیے میں زیادہ دور تک جاسکتا تھا۔ میں نے شام جانے کا فیصلہ کیا۔ اور ایک لمبے اور تھکا دینے والے سفر کے بعد میں حلب پہنچ گیا۔ جب بغداد مسلم دنیا میں علم وفضل کا گہوارہ تھا تو حلب تجارت کا مرکز تھا۔ وہ مراکش میں فیض، مصر میں اسکندریہ، مشرقی ایران میں نیشا پور اور وسط ایشیا میں سمر قند کا مقابلہ کرتا تھا۔ یہاں سے دنیا کے ہر خطے کے ساتھ کاروبار ہوتا تھا۔ یہ یورپ کے لیے بھی کاروباری مرکز تھا۔ یہاں سے دنیا بھر کا سازوسامان دوسرے ملکوں کو بھیجا جاتا تھا۔ یہاں وینس، املفی اور جینوا کے تاجر سامان خریدنے آتے تھے۔ یہ کاروباری دنیا کی جنت تھا۔ ایک تو یہ حقیقت میرے پیش نظر تھی دوسرے مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ عربی سائنسی علوم کی تاریخ کا ایک ادارہ بھی وہاں قائم کیا جانے والا ہے۔ اسی لیے میں وہاں پہنچا تھا۔

حلب کا چھتا ہوا بازار عرب دنیا کے ان چند بازاروں میں سے ہے جو ابھی تک زمانے کی دستبرد سے بچا ہوا ہے۔ معمولی تبدیلیوں کے ساتھ یہ بازار اسی طرح موجود ہے۔ اس بازار میں چلنا ایسا ہی ہے جیسے اپنے آپ کو کسی بھول بھلیاں میں کھو دینا۔ وہاں ہر کونے پر حیرت کا سامان موجود تھا اور ہر راستہ کسی پوشیدہ خزانہ کا دروازہ کھولتا تھا۔ اس بازار میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں تھی جس کی تراش خراش اور بناوٹ میں صدیوں کی مہارت اور کاریگری کا نمونہ نظر نہ آتا

ہو۔ کاریگروں نے اپنی انتھک محنت اور خون پسینے سے ایسی چیزیں بنائی تھیں جو فن کا اعلیٰ نمونہ بھی تھیں اور روز مرہ استعمال کا سامان بھی۔ اکثر چیزیں روز مرہ استعمال کی ہی تھیں جیسے غالیچے، قالین، کپڑا، لیمپ، پلیٹیں اور جگ وغیرہ مگر سادہ سے سادہ چیز کو بھی فن کاری کا خوبصورت شاہکار بنا دیا گیا تھا۔ ایک جگہ میں نے دیکھا کہ ایک پورا خاندان بھیڑوں کے اون سے دھاگہ بنا رہا ہے۔ اس کے قریب ہی دوسری جگہ اسی دھاگے سے قالین بنے جا رہے تھے۔ اس کے سامنے ایک دکان میں بچے کچھے اون سے رنگ برنگے غالیچے بنائے جا رہے تھے۔ یہی امتزاج بازار کی عمارت میں بھی نظر آتا ہے۔ ہر گنبد دوسرے گنبد کو سہارا دے رہا ہے۔ ہر سرنگ دوسری سرنگ کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ اب میں نے ایک کھیل کھیلنا شروع کیا۔ میں بازار کے ایک دروازے سے داخل ہوتا اور گھومتا گھامتا اسی دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا۔ مگر وہ کوئی اور ہی دروازہ ہوتا۔ میں نے کئی بار کوشش کی مگر ہر بار ناکام ہوا۔ ہمیشہ شہر کے کسی دوسرے حصے کی طرف ہی نکلتا۔ بازار میں اندھیرا سا تھا۔ صرف دکانوں میں روشنی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ یہاں روشن دانوں کو اس طرح ڈیزائن کیا گیا ہے کہ ان سے آنے والی دھوپ کی کرنیں وہاں چلنے پھرنے والوں کو راستہ بھلا دیتی ہیں۔ اس بازار کے پیچیدہ راستوں کا معمہ حل کرنے میں ناکامی کے بعد ایک دن میں قالینوں کی ایک دکان میں جا بیٹھا۔

''اہلاً وسہلاً۔ یہ آپ کا ہی گھر ہے۔'' دکان دار نے میرا خیر مقدم کیا۔ وہ فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ پیچھے کوئی آدمی قالین بن رہا تھا۔

میں دکان دار کے پاس قالینوں کے ایک گٹھے پر بیٹھ گیا۔ ''آرام سے بیٹھیے۔ آپ خیریت سے تو ہیں؟''

''بہت تھک گیا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اس بازار میں گھومنا تو بالکل ہی تھکا دیتا ہے۔''

''جی ہاں،'' اس نے جواب دیا ''نئے آنے والوں کے لیے کسی کی مدد کے بغیر راستہ تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے۔ آپ چائے پئیں گے؟'' میں نے سوچا عربوں کی مہمان نوازی اور سخاوت ابھی زندہ ہے۔ یہاں تک کہ کچھ لوگ تو اس مہمان نوازی میں خود ہی کنگال ہو گئے۔ غریب سے غریب عرب بھی آپ کے سر ہو جائے گا کہ یہ گھر آپ کا ہی ہے۔ آپ یہاں ٹھہریں۔ چائے تو ضرور پئیں۔ بلکہ کھانا بھی یہیں کھائیں۔ اگر آپ اس کی دعوت قبول نہیں کریں گے تو اسے تکلیف ہوگی اور اگر دعوت قبول کر لیں گے تو وہ اپنی واحد بھیڑ بھی آپ

کے کھانے لیے ذبح کر دے گا۔ میں جانتا تھا کہ یہ دکان دار بھی ایسا ہی ہے۔

ایک چھوٹی سی لڑکی گول سی ٹرے میں رکھ کر چائے لائی۔ وہ دکان دار خریداروں کے ساتھ مصروف تھا اور میں وہاں بیٹھا چھوٹے سے گلاس میں میٹھی شہد چائے پی رہا تھا۔ میرا گلاس خالی ہوتا تو وہ مجھ سے پوچھے بغیر ہی اسے پھر بھر دیتا۔ ایک گھنٹہ اسی طرح گزر گیا۔ ہم حلب اور لندن کی زندگی کا موازنہ کر رہے تھے۔ ''آپ وقت کے پیچھے دوڑتے ہیں اور ہم وقت کو اپنے اندر بہنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ اسی بات چیت میں اس نے سوال بھی کر لیا۔ ''کوئی چیز پسند آئی آپ کو؟''

میرے مُنھ سے نکلنے ہی والا تھا کہ میں تو چائے پینے آیا تھا۔ مگر ایک دم اپنے آپ کو روک لیا۔ مجھے ایک عجیب سے جذبہ نے گھیر لیا۔ شاید یہ اس شخص کی مہربانی تھی جو میرے لیے بالکل ہی نئی تھی۔ میں نے کچھ سوچا اور ایک کشن کور کی طرف اشارہ کیا ''اس کشن کور میں رنگوں کا نازک استعمال مجھے بہت اچھا لگا۔''

''ہاہا۔'' اس نے ہنسی میں جواب دیا۔ ''یہ کشن کا کور نہیں ہے گدھے کی جھول ہے، کیا خیال ہے اب کافی ہو جائے؟''

''نہیں۔ اب مجھے چلنا چاہیے۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا ''میں پھر آپ کی دکان کی طرف سے گزرا تو ضرور کافی پیوں گا۔''

''ابھی ظہر کا وقت ہے۔ باہر بہت گرمی ہوگی عصر تک یہاں ٹھہرو پھر چلے جانا۔ اس وقت تک دھوپ کی شدت بھی کم ہو جائے گی۔ دوپہر میں یہ بازار ہی ایسی جگہ ہے جو پورے شہر میں سب سے زیادہ ٹھنڈا رہتا ہے۔ یہاں تم آرام سے رہو گے اور پھر ابھی ہم دوپہر کا کھانا بھی تو کھانے والے ہیں۔ اگر تم ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ گے تو ہماری عزت افزائی ہوگی۔'' اس نے اصرار کیا۔

کھانے کے دوران میں اس نے بتایا کہ گدھے کی جھول پانچ سولیرا کی ہے۔ لیکن میں تمھیں ساڑھے چار سو میں دے دوں گا۔ پانچ سولیرا بیس ڈالر کے برابر بنتے تھے۔ کھانے کے بعد ہم نے ترکی کافی پی۔ اس کے بعد اس نے کہا۔ اب تم اس غالیچے پر آرام کر لو۔

میں نے اس کی بات مان لی اور میں لیٹتے ہی گہری نیند سو گیا۔ جاگا تو سورج ڈوب چکا تھا۔ میرے جاگتے ہی مجھے پھر چائے مل گئی چھوٹی بچی مجھ سے کافی مانوس ہو گئی تھی۔ وہ میری گود

میں بیٹھ گئی اور اپنے ہاتھ میری گردن میں ڈال لیے۔

''اب تو تم ہمارے خاندانی دوست بن گئے ہو۔'' دکان دار نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اس لیے اب یہ گدھے کی جھول صرف ڈھائی سو لیرے میں تمہاری ہے۔''

''مجھے ایک بات بتاؤ۔'' میں نے اس سے کہا ''کبھی کوئی آدمی تمہاری دکان سے خالی ہاتھ بھی گیا ہے؟''

''میری چائے پینے کے بعد تو کوئی بھی خالی ہاتھ نہیں گیا۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔

میں گدھے کی جھول اپنے کندھے پر ڈال کر دکان سے باہر نکلا تو میں نے سناوہ بچی اپنے باپ سے کہہ رہی تھی ۔ اگر لندن میں گدھے نہیں ہوتے تو یہ اس جھول کا وہاں کیا کریں گے۔'' میرا خیال ہے ۔ وہاں کے اور لوگوں کی طرح وہ بھی اسے اپنے گھر کی دیوار پر ٹانگ لیں گے۔'' باپ نے جواب دیا۔

بازار کی بھول بھلیوں سے نکل کر میں اپنے ہوٹل کی طرف چلا تو آدھی رات ہو رہی تھی۔ میں نے کئی دن سے داڑھی نہیں بنائی تھی۔ سوچا کہ اب اس داڑھی کا صفایا کرنے کے لیے ریزر بلیڈ خرید لینا چاہئیں۔ میں نے دوسرے بازار کا رخ کیا۔ ابھی تک بازار لوگوں سے بھرے ہوئے تھے ۔ مجھے چینی مٹی کا ایک برتن اچھا لگا تھا اور میں اسے دیکھ رہا تھا کہ تڑ تڑ تڑ کی آواز آنا شروع ہوگئی۔ میں ہتھیاروں کا ماہر تو نہیں ہوں مگر مشین گن کی آواز بہر حال پہچانتا ہوں۔ چاروں طرف ہنگامہ مچ گیا۔ دکان دار ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے برتنوں کی دکانیں ٹوٹے پھوٹے برتنوں سے بھر گئیں۔ میں بھاگ کر سیاحت کی ایک دکان کے فولادی دروازے کے پیچھے چھپ گیا۔ تڑ تڑ تڑ کی آوازیں آرہی تھیں اور چیزوں کے ٹوٹنے کی آوازیں بھی برابر آرہی تھیں۔ فائرنگ کی آواز رکتی تو ایک ڈراؤنی سی خاموشی چھا جاتی۔ مجھے مشکل سے ہی سانس آرہی تھی۔ میں زمین پر پڑے انسانوں کے درمیان کھڑا ہوا تھا جو میری طرح مشکل سے ہی سانس لے رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے ڈرتے ڈرتے سر باہر نکال کر دیکھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ دکانوں کے پاس ایک ٹینک کھڑا تھا۔ سڑک فوجیوں سے بھری ہوئی تھی۔ وہ سب عمارت کی اوپر والی منزل کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تڑ تڑ کی آواز پھر آئی ۔ یہ آواز اوپر سے آرہی تھی۔ میں نے دوبارہ نیچے دیکھا تو ٹینک نے دوبارہ فائرنگ شروع کر دی تھی ۔ چند منٹ بعد پوری عمارت ملبہ کا ڈھیر بن چکی تھی ۔ فولادی دروازے کے پیچھے ہم سب سانس روکے

کھڑے تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ اب کیا ہوگا۔ فوجی ایک لاش گھسیٹتے ہوئے باہر لائے۔ اس کے سر پر عمامہ تھا جس سے اس کا داڑھی والا پورا چہرہ بھر گیا تھا۔ اس کے سفید کپڑے اور اس کی سفید عبا بھی سرخ ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے ساتھ موجود لوگوں کی کھسر پسر سنی، ''اخوان المسلمون۔ اخوان اخوان۔''

دوسری صبح اسی طرح داڑھی بڑھی ہوئی اور بائیں کاندھے پر گدھے کی جھول ڈالے میں نے دمشق کے لیے ٹیکسی پکڑی۔ ٹیکسی میں سات آدمی سوار تھے چار تو پیچھے ٹھنسے ہوئے بیٹھے تھے جن میں ایک میں بھی تھا اور تین آگے والی سیٹ پر تھے۔ ٹیکسی ستر کیلومیٹر سے بھی زیادہ کی رفتار سے چلی جا رہی تھی، مگر لگتا تھا کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ میرے ساتھ جو آدمی پھنسا ہوا بیٹھا تھا وہ کچھ پریشان سا لگ رہا تھا۔ وہ کبھی دائیں دیکھتا تھا کبھی بائیں۔ اس نے مجھے سگریٹ پیش کیا۔ میں نے نرمی کے ساتھ انکار کر دیا۔ اب اس نے سگریٹ کا پیکٹ ڈرائیور کی طرف کیا۔ ڈرائیور نے مجھے اشارہ کیا۔ وہ منھ ہی مُنھ میں کچھ کہہ رہا تھا۔ سب مسافر ایک طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے بھی ادھر دیکھا۔ ایک فوجی گاڑی ہمارے پیچھے آ رہی تھی۔ فوجیوں نے اشارہ کیا اور ٹیکسی ایک جھٹکے کے ساتھ ٹھہر گئی۔ دو فوجی کلاشنکوف اٹھائے ہماری طرف آئے اور ہمیں گھیر لیا۔ تیسرے فوجی نے چیخ کر حکم دیا اور ہم اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے ایک ایک کر کے باہر آ گئے۔ چوتھے فوجی نے ٹیکسی کی ڈکی کھولی اور سارا سامان باہر نکال کر پھینک دیا۔ جو فوجی حکم دے رہا تھا اس نے مجھ سے پوچھا۔ تمہارا سوٹ کیس کون سا ہے؟ میں نے کہا میرے پاس تو کوئی سامان نہیں ہے۔ اس نے میرا پاسپورٹ مانگا۔ اس نے پاسپورٹ اپنے بائیں ہاتھ میں لیا۔ تصویر کو دیکھا اور دایاں ہاتھ میرے گالوں پر پھیر کر بڑھی ہوئی داڑھی کے بال محسوس کیے۔ پھر میرے کاندھے پر پڑی گدھے کی جھول دیکھی، مسکرایا اور پاسپورٹ واپس کر دیا۔ وہ مجھے کوئی احمق انسان سمجھا تھا۔ اس کے بعد اس نے ہر ایک کے شناختی کاغذات دیکھنا شروع کیے۔ پیچھے جو فوجی ڈکی کا سامان دیکھ رہا تھا اس نے ایک چیخ سی ماری۔ جیسے کہہ رہا ہو ''مل گیا۔'' اس نے ایک سوٹ کیس اپنے ساتھیوں کے سامنے پھینک دیا۔ اس نے اس سوٹ کیس کا تالا توڑ لیا تھا۔ اس میں رائفلیں بھری ہوئی تھیں۔ جو آدمی میرے ساتھ بیٹھا تھا اب وہ بالکل خاموش تھا۔ ایک فوجی نے اسے کلاشنکوف کا کندا مارا۔ اب رائفلیں نکل آئی تھیں تو کوئی بھی نہیں بول رہا تھا۔ جیسے ہر شخص جانتا تھا کہ کون کیا ہے اور یہ کیا ہو رہا ہے۔ فوجیوں نے ایک ہی لفظ بولا اور وہ تھا اخوان اور اس کے

بعد جب وہ فوجی اس شخص کو پکڑ کر لیے جا رہے تھے تو اس نے پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا۔
مسلمانوں کا روایتی شہر حماۃ دمشق اور حلب کے درمیان واقع ہے۔ ٹیکسی ہمیں لے کر ایک موڑ مڑی تو ایسا لگا جیسے فوج کی ایک پوری بٹالین اس شہر کی طرف جا رہی ہے۔ شامی بعث پارٹی کی حکومت اخوان المسلمون کے گڑھ حماۃ شہر کو روئے زمین سے ایسے صاف کرنے پر تلی ہوئی تھی جیسے بلیک بورڈ سے چاک۔ دمشق بغداد کی طرح ہی بے کیف سا نظر آیا۔ شاید یہ میری اپنی ذہنی کیفیت کی وجہ بھی ہو۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو دمشق یونیورسٹی جانے پر آمادہ کیا۔ وہاں پوری عرب دنیا کا وہ میڈیکل کالج ہے جہاں عربی زبان میں طب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ میرے لیے صلاح الدین ایوبی کے مقبرہ پر جانا بھی ضروری تھا جس کا سرخ گنبد ہے اور جو امیہ مسجد کے باغ میں واقع ہے۔ مقبرہ قدیم شہر کے بازار سوق الحمیدیہ کے سامنے ہے۔ رومن دیوار نے اسے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ میں نے سلیمانیہ مسجد میں دو نفل ادا کیے۔ یہ مسجد عثمانیہ انداز میں 1554 میں تعمیر کی گئی تھی۔ میں اس کے نازک اور ستواں میناروں کی خوبصورتی دیکھتا رہا۔ ان میں ایک سفید اور ایک کالی قطار میں پتھر لگائے گئے ہیں۔ میں جب وہاں دعا مانگ رہا تھا تو سوچ رہا تھا کہ یہ دعا قدیم اور مردہ تاریخ کے لیے ہے یا مردہ حقیقت کے لیے۔ دمشق میں تاریخ نے مجھے اس حقیقت کے سامنے لا کھڑا کیا تھا جو مردہ نہیں ہے مگر بہت دور بھی ہے۔ شہر کی دیواریں صدر حافظ الاسد کی تصویروں سے بھری پڑی تھیں۔ صدر حافظ الاسد شام کو بعث پارٹی کی جنت بنانے میں مصروف تھے۔ میری نگاہ جدھر بھی اٹھتی تھی حافظ الاسد مجھے دیکھ رہے ہوتے تھے۔ آخر مجھ سے اور نہیں دیکھا گیا۔

آخر جب میں عمان پہنچا تو میرے دم میں دم آیا اور مجھے احساس ہوا کہ اب میں سکون سے سانس لے رہا ہوں۔ اس کے بعد میں نے اپنے آس پاس دیکھنا شروع کیا۔ یہاں میری آنکھوں نے مشرق وسطیٰ کے شہروں میں ایک انتہائی خوبصورت اور پر سکون شہر دیکھا۔ تیل کی دولت چھن چھن کر تیل سے محروم اس ملک میں آئی ہے اور اس کا یہ دارالحکومت اپنے انداز کا واحد شہر بن گیا ہے۔ شہر کے وسط میں موجود دو ہزار سال پرانے رومن ایمفی تھیٹر سے، جسے اپنی اصلی شکل میں بحال کر دیا گیا ہے، شہر کے نواحی علاقوں تک جہاں نئے تعمیر شدہ مکانوں کی آبادیاں ہیں، جن میں سے اکثر مکان سنگ مرمر کے ہیں، روایتی عرب فنِ تعمیر کے ساتھ جدید فنِ تعمیر کے شاہکار بکھرے نظر آتے ہیں۔ بغداد اور دمشق کے مقابلے میں یہاں کہیں بھی گھٹیا اور

عامیانہ پن دکھائی نہیں دیتا، صرف دولت کی ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے۔ میں نے یہاں چند دن رائل سائنٹفک سوسائٹی میں گزارے یا اردن یونیورسٹی میں اپنے دوستوں سے ملاقاتیں کیں۔ اس کے بعد میں نے فلسطینیوں کے کیمپ بقا جانے کا فیصلہ کیا۔

بقا کیمپ عمان کے شمال مغرب میں کوئی دس کیلومیٹر دور واقع تھا۔ عمان کے وسط سے ٹیڑھی میڑھی سڑکوں اور سات پہاڑیوں پر چلتے ہوئے جب کیمپ پہنچے تو ہم وہ سب دیکھنے کو تیار نہیں تھے جو وہاں نظر آیا۔ ہم بقا کے نزدیک پہنچے تو سب سے پہلے ہمیں ریڈیو ٹیلی اسکوپ کا بہت بڑا ڈش ایریل نظر آیا۔ دور سے نرسریوں کی قطاریں بھی نظر آرہی تھیں جو نیم دائرے میں سیلوفین سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ان کے اوپر وہ ڈش انٹنا یوں لگ رہا تھا جیسے ایک دیو قامت طشتری آسمان سے اترنے والا من وسلوی حاصل کرنے کے لیے لٹکا دی گئی ہے۔ دوسری طرف نظر گئی تو غربت و افلاس کا انتہائی افسوس ناک نمونہ دکھائی دیا۔ یہ وہ عارضی مکان تھے جو یہاں سے وہاں تک پھیلے ہوئے تھے۔ پیچھے ہم جدید زمانے کے جو ٹیکنالوجی اور امارت اور ثروت دیکھ کر آئے تھے ان کے مقابلے میں یہ نظارہ صدیوں پرانے اجڑے ہوئے شہر کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ وہاں دکھ اور کرب کا راج تھا۔ لیکن یہ دکھ اور یہ کرب کیمپوں کے اندر محسوس نہیں ہوتا تھا۔ وہاں پختہ عزم اور جو جذبہ حکم رانی کر رہا تھا وہ عزم اور وہ ہمت ہر چہرے پر نظر آتی تھی۔ مردوں کے خستہ حال چہرے، جوان عورتوں کے کمھلائے ہوئے چہرے اور بچوں کے معصوم چہرے ارادے کی اس پختگی سے چمکتے دکھائی دیتے تھے۔ ہر طرف بچے کھیلتے پھر رہے تھے۔ ایک اسکول کے پاس میں نے چند بچوں کو فٹ بال کھیلتے دیکھا۔ ان کی یونیفارم پرانی تو تھی مگر صاف ستھری تھی اور بچے بھی تمیز دار نظر آتے تھے۔ وہ لڑکے میرے گرد جمع ہو گئے۔ ایک بچے نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اسکول کے اندر لے گیا۔ وہ مجھے اسکول میں گھماتے ہوئے فخر محسوس کر رہا تھا۔

ایک عورت بچے کو سینے سے لگائے طبی مرکز میں جا رہی تھی۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی اندر چلا گیا۔ ویٹنگ روم میں مریض خاموشی سے لکڑی کی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر نبیل حارث نے باہر نکل کر میرا استقبال کیا۔ اس نے مجھ سے معذرت کی کہ پہلے وہ اس عورت اور اس کے بچے کو دیکھ لے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس پردے کے پیچھے سے باہر آیا جہاں اس کا کنسلٹنگ روم تھا اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں مجھ سے باتیں کرنے لگا۔

"کیا حال ہے۔"

"الحمد للہ" میں ٹھیک ہوں۔ اس کے لہجے پر مجھے ہنسی آ گئی تھی مگر میں نے اسے دبا لیا۔

نبیل اسی طرح بولتا رہا۔ اس نے بتایا کہ وہ حیفہ میں پیدا ہوا اور کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور سے طب کی تعلیم حاصل کی۔ وہیں اس نے اردو بولنا سیکھی۔ ہم وہاں سے نکل کر کیمپ کی بڑی سڑک پر آ گئے۔ سڑک کے ایک طرف کپڑے اور ضروری اشیا کی دکانیں تھیں دوسری طرف مختلف اشیا مرمت کرنے کی دکانیں تھیں جو کافی مصروف نظر آتی تھیں۔ میں نے ایک چھوٹی فاؤنڈری دیکھی جہاں لوہے کے پلنگ بن رہے تھے۔ ایک جانب لکڑی کے تختوں کے کھوکھے تھے جن پر سبزی ترکاری بک رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی گندے پانی کی نالی بہہ رہی تھی۔ ان کے درمیان چند عورتیں بیٹھی تھیں جو ٹافیاں، جوتے اور بنیان وغیرہ بیچ رہی تھیں۔ ہم ایک عمارت کے پاس سے گزرے جس پر اقوام متحدہ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اس پر جو بورڈ لگا تھا اس پر لکھا تھا "بقا ایمرجنسی کیمپ نمبر ۳۹۰۷"۔ یہ مرکز جرمنی کی امداد سے بنایا گیا تھا۔ دروازے کے باہر جو مرسیڈیز کار کھڑی تھی وہ وہاں عجیب سی لگ رہی تھی۔

"یہ کیمپ ۱۹۶۸ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد بنایا گیا تھا جب اسرائیل نے مغربی کنارے پر قبضہ کر لیا تھا۔" نبیل نے مجھے اردو میں بتایا۔ "اسرائیل کے قبضے کے بعد اس علاقے کے چار لاکھ افراد مہاجر بن گئے تھے۔ اس کیمپ میں ستر ہزار فلسطینی مہاجر آباد ہیں۔ پہلے یہ خیموں میں رہتے تھے اب انہوں نے دیواریں بنا لی ہیں۔ یہ ایک چھوٹا سا شہر بن گیا ہے جس کی اپنی معیشت ہے، اپنا کلینک ہے اور اپنے اسکول ہیں۔ اسکولوں میں اٹھارہ سے بیس ہزار تک طلبہ ہیں اور یہاں تعلیم کی شرح اسی فیصد ہے۔ اسے عارضی کیمپ بنایا گیا تھا مگر ہم قریب بیس سال سے یہاں رہ رہے ہیں۔ ہم یہی سوچتے ہیں کہ اپنے گھروں کو واپس جائیں گے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں سوچتے۔" وہ ٹھہرا پھر بولا "اس جہنم میں بھی ہم زیادہ سے زیادہ نارمل زندگی گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ہماری جنت تو فلسطین واپسی کے بعد ہی ملے گی اور ہم ضرور وہاں جائیں گے۔" اس کی آواز اور چہرے سے اس کے عزم کا اظہار نمایاں ہو رہا تھا۔

ہم ایک گلی میں داخل ہوئے۔ گلی کے بیچ میں کھلی نالی بہہ رہی تھی۔ دونوں جانب چونے سے پتے گھر تھے اور اینٹوں کی دیواروں پر ٹین کی چھتیں پڑی تھیں۔ اکثر لوگوں نے ٹین پر پتھر رکھے ہوئے تھے کہ کہیں وہ ہوا سے اڑ نہ جائیں۔ چند منٹ بعد ہم سنٹر پہنچ گئے۔ وہاں اردن

کمیونٹی کالج کی لڑکیاں صفائی کر رہی تھیں ۔ کچھ لڑکیاں کھیل کے میدان کی دیواروں پر سفیدی کر رہی تھیں ۔ کچھ لائبریری میں کتابوں کی کیٹلاگنگ کر رہی تھیں ۔ میں فٹ بال گراؤنڈ کی ٹوٹی دیوار میں سے باہر نکل آیا ۔ وہاں چھوٹے چھوٹے بچّے اسکول سے گھر جا رہے تھے ۔

ایک چھوٹا سا لڑکا میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور مُنھ اٹھا کر مجھے دیکھنے لگا ۔ وہ مسکرا رہا تھا ۔ اس کے دانتوں کے بیچ خلا تھا ۔ میں نیچے جھکا اور اس کے گال پر ہاتھ پھیرا ۔ ”تمھیں اسکول اچھا لگتا ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا ۔

”بہت اچھا لگتا ہے ۔“ اس نے کسی جھجک کے بغیر جواب دیا ۔

”بڑے ہو کر تم کیا بنو گے؟“

”میں اپنے وطن کے لیے لڑوں گا ۔“ اس نے فوراً جواب دیا ۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا ۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ یہ عزم صرف میرے الفاظ میں ہی نہیں ہے میرے دل و دماغ میں بھی ہے ۔ وہ نظارہ دیکھنے کے قابل تھا اور وہ للکار بھی تھی کہ آگے کیا ہونے والا ہے ۔

وہاں سے میں دبئ چلا گیا جہاں سے میرا ارادہ لندن جانے کا تھا ۔ دبئ کوئی شہر یا شہری ریاست نہیں ہے بلکہ وہ عمارتوں کے لیے ایک پلاٹ ہے ۔ اس شہر کو نئے سرے سے تعمیر کرنے کے لیے تیل کی دولت استعمال کی جا رہی ہے ۔ شہر کو شاپنگ مال کی عجائبات میں تبدیل کیا جا رہا ہے جہاں صارفین کے کلچر کی تمام ہی چیزیں موجود ہوں گی ۔ وہاں سب کچھ ہے مگر روح نہیں ہے ۔ مجھے وہاں مابعد الطبیعیات کی موت نظر آئی ۔ مجھے یہ دیکھ کر کوئی حیرت نہیں ہوئی کہ وہاں سائنس اور ٹیکنالوجی میں کوئی بھی ایسی شے نہیں تھی جسے دیکھنے کو میرا جی چاہتا ۔ چنانچہ میں نے ایک وزیر سے ملاقات کی جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ سائنس کی پالیسی کے وزیر ہیں ۔ اتفاق یہ ہوا کہ جس وقت میں وزیر کے محل پر پہنچا تو اسی وقت نوکری کا امیدوار ایک ایشیائی مزدور بھی وہاں جا رہا تھا ۔ وہ دھوتی اور بنڈی میں تھا اور میں جین اور ٹی شرٹ پہنے ہوئے ۔ دونوں ایک ہی طبقے کے نظر آتے تھے ۔ پہرے دار نے ہم دونوں کو ادھر آتے دیکھا ۔

”تم لوگوں کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہے ۔“ وہ گیٹ کی جھری سے چیخا ۔ ”چلے جاؤ یہاں سے ۔“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ مجھے ملاقات کا وقت دیا گیا ہے ۔ مگر ابھی میں پوری بات بھی نہیں کرنے پایا تھا کہ اس نے الیکٹرانک گیٹ بند کر دیا ۔

”یہاں کام ملنا مشکل سے مشکل ہوتا جا رہا ہے ۔“ اس مزدور نے مجھے تسلی دینے کی

کوشش کی۔ ''یہ سب تیل کی وجہ سے ہے۔ آپ جانتے ہیں نا، تیل کی قیمتیں کم ہوگئی ہیں۔ اب وہ پرانی بات نہیں رہی۔''

مجھے اس کی بات اچھی لگی۔ اب میں اس وزیر سے اپنی ملاقات بھول گیا اور اس مزدور کے ساتھ باتیں شروع کردیں۔

''تم کب سے کام تلاش کررہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''پچھلے ہفتے سے۔'' وہ بولا۔ ''پچھلے ہفتے تین دن کا کام مل گیا تھا۔ اس کے بعد سے بے کار پھر رہا ہوں۔'' وہ تھوڑا ٹھہرا اور پھر مسکرایا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ کوئی آدمی بے کار ہو اور اس طرح مسکرائے بھی۔ ہم دونوں سڑک کی طرف چلنے لگے۔

''میں لارڈ احمد ہوں۔'' اس نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لارڈ احمد؟'' میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے سوال کیا۔

''جی لارڈ احمد۔ ہندوستان میں میرے خاندان کی بہت زمینیں ہیں۔'' ہم بہت بڑے زمین دار تھے۔ ان دنوں ہم ان شیخوں کی طرح ہی رئیس تھے۔ مگر انگریزوں نے پھر ملک کا بٹوارہ کردیا۔ میں پاکستان ہجرت کرگیا۔ ہندستان سے آنے کے بعد اب میں صرف لارڈ ہی رہ گیا ہوں اور اب دبئی میں کام تلاش کرتا پھرتا ہوں۔ آپ کیا کرتے ہیں؟''

''میں ادیب ہوں''

''ادیب؟ ہنہ، آپ کتابیں لکھتے ہیں؟''

''ابھی تو میں نے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ مگر لکھنے کا ارادہ ہے۔''

''کس بارے میں لکھیں گے؟''

''مسلم ملکوں میں تعمیر و ترقی، سائنس اور ٹیکنالوجی کے مستقبل کے بارے میں۔''

''لوگوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ آپ لوگوں پر کتاب لکھنا نہیں چاہتے؟''

''کیوں نہیں لکھنا چاہتا۔'' میں نے کہا ''بالکل، میں لوگوں کے بارے میں کتاب لکھنا چاہتا ہوں۔''

''مجھ جیسے لوگوں کے بارے میں، ان شیخوں کے بارے میں۔''

''ہاں ہاں۔ دونوں کے بارے میں۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں شرطیہ کہتا ہوں کہ آپ صرف بڑے لوگوں کے بارے میں کتابیں لکھنا چاہتے ہیں۔کیونکہ وہ دلچسپ لوگ ہوتے ہیں۔ان لوگوں نے اپنے لیے جنت بنالی ہے اور آپ ان کی جنت سے متاثر ہوگئے ہیں۔آپ سمجھتے ہیں کہ ہم جیسے لوگ جو اس جنت سے باہر کردئے گئے ہیں ایسے دلچسپ لوگ نہیں ہیں۔''

''نہیں نہیں، میں نے جلدی سے کہا''غریب لوگ دلچسپ ہوتے ہیں بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ عام آدمی شیخوں سے کہیں زیادہ دلچسپ ہوتا ہے۔''

''اچھا ایک بات بتائیے۔''اس نے موضوع بدلا''آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟''

''ہوں''میں بڑبڑایا''میں تمہیں دیکھ رہا ہوں لارڈ احمد۔''

''میں نے کیسے کپڑے پہنے ہوئے ہیں؟''

''آپ نے دھوتی اور بنڈی پہنی ہوئی ہے۔''

''ہاہاہا''اس نے ہنسنا شروع کر دیا۔''آپ نے تو ہمیں دیکھنا بھی نہیں سیکھا۔غریبوں کے بارے میں آپ کیسے لکھ سکتے ہیں۔آپ جسے دھوتی کہہ رہے ہیں میرے لیے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔میرے لیے یہ رات کو سلیپنگ سوٹ بن جاتی ہے۔جب یہ پھٹ جاتی ہے تو اس کے دو ٹکڑے کر لیے جاتے ہیں۔ایک ٹکڑا تولیہ بن جاتا ہے اور دوسرے کو میں کندھے پر ڈالے پھرتا ہوں پسینہ پونچھنے کے لیے اور جب یہ زیادہ پھٹ جاتی ہے تو میں اس کی لمبی لمبی دھجیاں کر لیتا ہوں۔ان دھجیوں سے تیل کے چراغ کی بتی بنتی ہے۔آخر میں یہ وہیں چلی جاتی ہے جہاں سے آئی تھی۔یعنی دھرتی ماتا کے پاس۔''

یہ تمام انکشافات ہضم کرنے میں مجھے چند منٹ لگے۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ میرا مطلب ہے کہ تم دبئی کیسے آئے؟''

''گاؤں میں زندگی گزارنا مشکل ہوگیا تھا۔میں نے سوچا کچھ کرنا چاہیے۔میں کراچی چلا گیا۔وہاں کوئی کام نہیں ملا تو میں دبئی آگیا۔''پھر وہ آگے کو جھکا اور آہستہ سے بولا''میں غیر قانونی ہوں۔میرے پاس ریزیڈنٹ ویزا نہیں ہے۔''

''تمہیں اپنے بچے یاد نہیں آتے؟ تمہارا بیٹا یا بیٹی تم سے ملنے یہاں آتے ہیں؟''

''ہاں۔''اس نے جواب دیا''مجھے بہت یاد آتے ہیں۔مگر میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔جہاں بھی کام ہوگا بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے وہاں مجھے وہاں جانا تو پڑے گا۔''

''تو اب کیا کرو گے؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' وہ بولا ''بس کام کی تلاش میں ہی مارا مارا پھروں گا۔'' پھر ایک لمحہ بعد اس نے آہستہ سے کہا ''اور پولیس سے بچتا بچاتا پھروں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے آنکھ ماری۔ میں بھی مسکرادیا۔

''آپ میرے اوپر کتاب لکھیں گے؟''

ابھی میں نے جواب بھی نہیں دیا تھا کہ اس نے اپنی طرف ایک پولیس والے کو آتے دیکھ لیا ''مجھے اس کا تراشہ ضرور بھیج دینا۔'' اس نے میرا ہاتھ دبایا اور پلک جھپکتے وہاں سے غائب ہوگیا۔

دوسرے دن میں نے باقاعدہ لباس پہنا اور صبح ہی صبح ہوٹل سے نکل لیا۔ اس بار پہریدار نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر مجھے اندر جانے دیا۔ وزیر نے سوئمنگ پول کے ساتھ باغ میں میرا استقبال کیا۔ معلوم ہوا کہ وزیر صاحب کو سائنس اور ٹیکنالوجی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میرے ہر سوال کا ایک بنا بنایا جواب موجود تھا۔ ''اگر ہم ہر چیز خرید سکتے ہیں تو اس کے بارے میں ہمیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔'' وہ باتیں تو مجھ سے کر رہا تھا مگر اس کی نگاہیں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ وہ مجھے نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں بھی سوال کر کر کے تھک گیا تھا۔ اب میں نے سوئمنگ پول کی طرف دیکھا جو بہت ہی بڑا تھا۔ ''شاید آپ کا خاندان بڑا ہے اس لیے یہ اتنا بڑا سوئمنگ پول ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، نہیں، ایک اوسط سا خاندان ہے۔ مگر میں دور تک تیرنا پسند کرتا ہوں۔''

میں نے سر ہلایا کہ میں سمجھ گیا ہوں۔

''آپ کو معلوم ہے میرے ہاں تین سوئمنگ پول ہیں۔'' وزیر نے کہا۔ ''یہ ٹھنڈے پانی کا ہے، اس میں نارمل درجہ حرارت رہتا ہے ادھر اگر آپ کھڑے ہو کر دیکھیں تو ایک اور پول ہے جو جاڑوں کے لیے ہے۔ اسے خاص درجۂ حرارت تک گرم رکھا جاتا ہے۔''

میں کھڑا ہوگیا اور وہ سوئمنگ پول دیکھنے لگا۔ ''لیکن دبئی میں تو سال بھر ایک ہی درجہ حرارت رہتا ہے''؟ میں نے کہا۔

''ہاں، مگر صبح کو ٹھنڈ ہو جاتی ہے۔ تیسرا سوئمنگ پول اس طرف ہے۔'' اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور ایسی جگہ لے گیا جہاں سے تیسرا پول نظر آتا تھا۔

''مگر وہ تو خالی ہے۔ اس میں تو پانی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''کبھی کبھی میرا تیرنے کو دل نہیں بھی چاہتا۔''

مشرق وسطیٰ کے سفر میں میں نے خاصے فاصلے طے کیے۔ لیکن وہ فاصلے اس سے زیادہ نہیں تھے جو وہاں کے حکم رانوں اور محکوموں کے درمیان موجود ہیں۔ عام آدمی عدل و انصاف کے ساتھ زندگی گزارنے کی جو خواہش رکھتا ہے وہ ہمیشہ حکم رانوں کے اس تصور سے متصادم رہی ہے جو وہ ایک آئیڈیل زندگی کے بارے میں رکھتے ہیں۔ میں جانتا تھا کہ میری تلاش کو اس تصادم سے ہی کوئی شکل ملے گی۔

باب ۔ ۷

مکّے کی حفاظت

میں تہذیب کے دہانے پر ہو آیا تھا۔ میرے خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود جب بھی میں مسلم دنیا کی طرف توجہ کرتا تو اپنے ارد گرد مجھے ایک ایسا جذبہ دکھائی دیتا جس کے بل پر جدید دور کی ابتری اور افراتفری میں ماضی کی عظمت کے احیا کا راستہ تلاش کیا جا سکتا ہے۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ تہذیب کا مطلب صرف مادی اور ٹیکنیکل ترقی ہی نہیں ہے۔ ہماری اصل منزل یہ ہے کہ اس نصب العین کا مغز دریافت کیا جائے، اور ان اقدار اور اُن روحانی رویوں کی تخلیق نو کی جائے جنھوں نے اسلام کا سنہری دور پیدا کیا تھا۔ ہر شخص کو افق پر روشنی نظر آ رہی تھی۔ میرے مسلمان دوست یہ کہتے نہیں تھکتے تھے کہ اسلام کا احیا ہو رہا ہے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس گفتگو میں سارا زور اس بات پر ہی ہوتا تھا کہ مادی وسائل جمع کرنے سے ہی یہ مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں تیل پیدا کرنے والے ملکوں کی تنظیم OPEC کے قیام اور ۱۹۷۰ء کی دہائی میں اس تنظیم کے ایک عالمی طاقت کے طور پر ابھرنے سے یہ یقین ہونے لگا تھا کہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ بس شروع ہی ہونے والی ہے۔ تیل کی دولت مشرقِ وسطیٰ اور اسلام کو نئی رفعتوں سے ہم کنار کرنے والی ہے۔ اسلامی ملکوں کی تنظیم OIC جسے سعودی عرب کے شاہ فیصل کی رہنمائی میں مسلم ملکوں نے قائم کیا تھا، مسلمانوں کے اتحاد کا ایک مثالی نمونہ دکھائی دے رہی تھی۔ بادشاہ، سربراہ مملکت اور وزرائے خارجہ کے اجلاس کبھی رباط میں تو کبھی جدہ یا اسلام آباد میں برابر ہو رہے تھے۔ ان اجلاسوں میں ظلم و زیادتی اور نا انصافی کے خلاف جدوجہد کرنے اور

باہم تعاون کے راستے تلاش کرنے پر غور کیا جارہا تھا۔ تاریخ میں پہلی بار اسلامی انقلاب کا لاوا ابل رہا تھا اور پھر ایران میں یہ لاوا پھٹ بھی پڑا تھا۔

۱۹۷۵ء کے جاڑوں کی ایک سہ پہر، جب زمانۂ حال بالکل تاریک نظر آرہا تھا اور آنے والے دور کی روشنی ہی اس مایوسی کو کسی حد تک دور کررہی تھی، میں اپنے لندن کے فلیٹ میں بیٹھا ہوا تھا۔ آرام کرسی میں دھنسا ہوا میں اپنے آپ کو اس امید افزا ماحول کے مطابق بنانے کی کوشش کررہا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ دروازہ کھولا تو ایک ناقابل یقین منظر نے میرا استقبال کیا۔

''برادر ضیا'' اس نے کہا۔ ''میں آپ کو ایک ایسی پیش کش کرنے آیا ہوں جسے آپ رد نہیں کریں گے۔''

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ ہمیشہ دو دو کی جوڑی میں کیوں آتے ہیں۔ دروازے پر خش خشی داڑھی والے دو آدمی کھڑے تھے۔ یہ منظر میرے سامنے تھا اور اندر آنے کے لیے میرے اشارے کا منتظر تھا۔ ایک صاحب کے بارے میں تو معلوم ہوا کہ وہ سمیع انجوی ہیں۔ وہ شکل وصورت سے مستشرقیت کی قلمی تصویر نظر آتے تھے۔ ان کے لمبے لمبے بال پونی ٹیل میں بندھے ہوئے تھے اور دل کو برمانے والی بڑی بڑی گہری کالی آنکھیں تھیں۔ وہ عرب شیخ کا مغربی تصور اور روڈولف والنٹینو کی طلسماتی شخصیت کا ملا جلا نمونہ دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے ساتھی شاگرد پیشہ قسم کی چیز نظر آرہے تھے۔ اس لیے وہ پیچھے کھڑے تھے۔ وہ کچھ ایسے کھڑے فلیٹ کے اندر جھانک رہے تھے جیسے وہ جلد سے جلد اپنے جسم کا بوجھ کہیں رکھ دینا چاہتے ہیں۔

میں نے ان عجائبات کو اندر بلا لیا۔ اب سمیع نے اپنا تعارف کرایا۔ اس نے بتایا کہ حال ہی میں اس نے آسٹن یونیورسٹی ٹیکسس سے فن تعمیر میں ماسٹرز کیا ہے۔ اس کا ساتھی بوڈو روش ہے جو جرمن ماہر تعمیرات فرائی اوٹو کا شاگرد ہے۔ یہ جرمن ماہر خیمے کے انداز میں عمارتیں ڈیزائن کرنے کے لیے مشہور تھا۔ بوڈو حال ہی میں مسلمان ہوا تھا۔ وہ دونوں ہنگامی حالت میں میرے پاس آئے تھے اور میری مدد چاہتے تھے۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں بیٹھ جاؤں اور سلائیڈ پروجیکٹر پر ایک منصوبے کی تصویریں دیکھوں۔ پروجیکٹر وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ پروجیکٹر سیٹ کرنے میں انہیں کچھ دیر لگی۔ میں خاموش بیٹھا تماشہ دیکھتا رہا۔

ڈرائنگ روم کی روشنی بجھا دی گئی اور اس کی جگہ پروجیکٹر کی روشنی سامنے دیوار پر ڈالی گئی۔ میرے سامنے مسجد نبوی تھی۔ مسجد کے مختلف مناظر کئی پہلوؤں سے دکھائے جارہے تھے۔

ساتھ ساتھ سمیع کا تبصرہ بھی جاری تھا۔ ''اگر چہ مدینے نے علم وفضل سے معمور ایک نامیاتی تہذیب کو جنم دیا اس کے باوجود وہ ہمیشہ ایک سادہ سا شہر ہی رہا۔ سمیع نے کہا۔ اس نے وضاحت کی کہ شہر کی معاشرتی اور تجارتی زندگی اس مسجد کے گرد ہی گھومتی ہے۔ اصل مسجد دھوپ میں سوکھی ہوئی اینٹوں سے بنائی گئی تھی۔ اس کا فرش کچا تھا اور چھت کھجور کے پتوں کی تھی جس پر مٹی کا لیپ کیا ہوا تھا۔ یہ چھت کھجور کے تنوں پر کھڑی تھی۔ یہ مسجد وقت کے ساتھ ساتھ کئی بار تعمیر کی گئی اور خلفاء اور بادشاہوں نے اس کی آرائش اور زیبائش میں اضافہ کیا۔ عثمانی سلطنت نے خاص طور سے اس پر بہت زیادہ توجہ دی اور ترک ماہرین تعمیر نے اس کی شان وشوکت کو بڑھایا۔ اب مسجد کیا یک مرکزی دروازہ ہی تصویر سامنے آئی۔ یہ دروازہ سولھویں صدی میں سلطان سلیمان عالیشان نے خوبصورت سرامک ٹائلوں سے بنوایا تھا۔

میری آنکھیں ان مقامات کی زیارت کر رہی تھیں جو میرے دل میں بسے ہوئے تھے مگر اس وقت تک میں وہاں گیا نہیں تھا۔ انجوی کی آواز نے مجھے چونکا دیا ''سعودی سلطنت کے قیام کے بعد شہر مدینہ کو دو بار نئی شکل دی گئی ہے۔ شاہ عبدالعزیز کے زمانے میں ترک اثر باقی تھا۔ شہر کے دروازے پر ایک عالیشان قلعہ قرونِ وسطیٰ کی یادگار تھا جہاں سے شہر کا دفاع کیا جاتا تھا۔ سڑکیں پلستر کی ہوئی دیواروں کے کونوں سے گھری ہوئی تھیں۔ دیواروں کی کھڑکیاں جالی دار تھیں۔ مسجد نبوی سرخ گلاب کے رنگ کی تھی جس کے مینار ترک انداز کے تھے اور اونچے اونچے دروازوں پر طلائی خطاطی کی ہوئی تھی۔ یہ خطاطی ترک خطاطوں نے کی تھی۔ اس نے یہ سب چیزیں مجھے دکھائیں۔ پھر اس نے پروجیکٹر بند کر دیا۔ اب صرف سمیع کی آواز آرہی تھی۔ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۵ء کے دوران مسجد میں توسیع کی گئی۔ یہ دو سعودی بادشاہوں کا زمانہ تھا۔ اب اسے بھورے پتھروں سے نومملوک اسٹائل میں تعمیر کیا گیا۔ یہ دونوں اسٹائل ایک دوسرے کی ضد تھے۔ اس عرصے میں شہر کا بیشتر حصہ اسی طرح رہنے دیا گیا۔ صرف چند جدید ہوٹل بنائے گئے جو قدیم مکانوں پر چھائے ہوئے تھے۔ یا پھر کار پارکنگ کے لیے جگہیں بنائی گئیں جو آنکھوں کو اچھی نہیں لگتی تھیں۔

اب خاموشی چھا گئی۔ پھر انجوی کی آواز ابھری۔ ''جون ۱۹۷۳ء میں ایک اور تبدیلی رونما ہوئی۔ چند دن کے اندر''۔ یہ کہہ کر اس نے بل ڈوزر کی سلائیڈز دکھانا شروع کیں جو قدیم ثقافتی ورثے یعنی پرانی عمارتیں منہدم کر رہے تھے۔ پورا شہر زمیں بوس کر دیا گیا۔ کسی نے

شکایت نہیں کی۔ ظاہر ہے کتنے لوگوں کو پتہ چلا ہوگا کہ کیا ہوگیا۔ چودہ برس کی تاریخ اور روایات مٹی میں مل گئیں۔ سمیع خاموش بیٹھا تھا اور ربوڈ وروش تیزی کے ساتھ سلائیڈز دکھا رہا تھا۔ جدید شہر کی سلائیڈز جس میں بڑی بڑی سڑکیں اور کھلی کھلی گلیاں تھیں اور شوخ وشنگ اور انوکھے ہوٹل تھے۔ عثمانی دور کی مسجدوں کی جگہ بدشکل نئی مسجدیں تھیں۔

انجوی نے آہستہ سے کہا، ''یہی کام اب مکہ میں بھی کرنا ہے۔''

''پانچ سال کے اندر ہمیں مکہ کو بچانا ہے۔'' اب روش بولا ''اس نیک کام کے لیے ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔'' ان دونوں نے مل کر ایسی پیش کش کی جس سے میں انکار نہیں کرسکتا تھا۔ ''حاجی ریسرچ سنٹر میں آجایئے۔'' میں انکار بھی کیسے کرسکتا تھا۔ آخر مکہ ہی تو ہر مسلمان کے جسمانی اور روحانی سفر کی آخری منزل ہے۔ سعودی عرب ہی تو وہ ملک ہے جو اسلامی شریعت کو اس کی تاریخی عظمت کے ساتھ جدید دور سے ہم آہنگ کرسکتا ہے۔ تیل کی دولت سے بھی سب سے زیادہ وہی فائدہ اٹھاتا ہے۔ اوپیک کے فلسفے کے پیچھے بھی اسی کی طاقت ہے۔ اس کے انتہائی شائستہ وزیر تیل شیخ یمانی کے اس مطالبے نے مغربی ملکوں کو کافی متاثر کیا ہے کہ سب سے زیادہ تیل استعمال کرنے والے مغربی ملکوں کو اس قدرتی دولت کی مناسب قیمت ادا کرنا چاہیے اور یہ کہ یہ تیل ہمیشہ نہیں رہے گا۔ اسدلیل سے ترقی پذیر ملکوں کو بھی یہ کہنے کا موقع ملا کہ ان کے خام مال کی قیمتیں بھی مناسب ہونا چاہئیں۔ یمانی نے کہا کہ سعودی عرب کو اس وقت کے لیے متبادل وسائل تلاش کرنا ہیں جب اس کے پاس تیل نہیں رہے گا اور اس کے لیے سرمایہ چاہیے۔ تیل کی قیمتیں بڑھیں تو ساری دنیا میں تہلکہ مچ جائے گا اور یہ احساس پیدا ہوگا کہ اس طرح ترقی کی رفتار کم ہوسکتی ہے۔ تیسری دنیا میں یہ شعور پیدا ہوا کہ تیل پیدا کرنے والے اور اسے استعمال کرنے والے ملکوں کے درمیان موجود عدم توازن کم کیا جاسکتا ہے۔ اس سے نئے مباحث، نئے خیالات نے جنم لیا اور مغرب اور تیسری دنیا میں نئے وسائل کی تلاش کا آغاز ہوا۔ اب یہ بحث شروع ہوئی کہ اس کے جو نتائج سامنے آئیں گے ان سے کیسے عہدہ برآ ہوا جائے گا۔ خاص طور سے اسلام کی جائے پیدائش میں اسلامی عینیت پسندی پھوٹے گی اسے کس طرح سنبھالا جائے گا۔ اگر مقصد یہ ہے کہ ان ذرائع و وسائل کو جو قومی دولت کی پیداوار کا سبب بنتے ہیں محفوظ کر کے صحیح ترقیاتی کاموں پر لگایا جائے اور اس کے ساتھ ہی اپنے روحانی ورثے پر فخر کرنے اور اپنے اندر خوداعتمادی پیدا کرنے کا جذبہ ابھارا جائے تو مکے کو مدینے کے

حشر سے بچایا جاسکتا ہے۔ میرے کمرے کی دیوار پر جو تصویریں دکھائی جا رہی تھیں وہ تو ایک غلط قسم کی مادی ترقی کی نشان دہی کرتی تھیں۔ اگر کہیں کوئی امید کی کرن نظر آتی ہے اور مسلمانوں کی ترقی کی کوئی سبیل بن سکتی ہے تو جنت کا یہ نیا راستہ بنانے کے عمل میں شریک ہونے کے لیے سعودی عرب ہی سب سے زیادہ مناسب ملک ہوسکتا ہے۔

انجوی کو میرے ان خیالات سے کوئی غرض نہیں تھی۔ جوں ہی میں نے ان کی پیش کش قبول کی وہ فوراً کھڑا ہوگیا اور پہلے میرے بائیں گال کا بوسہ لیا پھر دائیں گال کا۔ اس کے بعد وہ میری ناک بھی چومنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے پیچھے ہٹا دیا۔ سب طے ہوگیا۔ اب صرف میری اس نئی مہم کی تفصیل طے کرنا باقی رہ گئی تھی۔ سلائیڈز اور پروجیکٹر اکٹھے کیے جانے لگے۔ ''ایک بات اور رہ گئی،'' روش بولا۔ ''میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اس سلسلے میں آپ میری مدد کرسکتے ہیں۔''

بھری سردیوں میں یہ بہار کا جھونکا تھا اور اس سہ پہر کا کتنا خوبصورت اختتام۔ روش کی شادی کرانے میں مجھے چند ہفتے ہی لگے۔ قریب ایک مہینے بعد میں جدہ میں تھا۔ انجوی کے بعد اور بھی کئی لوگوں سے اس سلسلے میں رابطہ رہا۔ اس نے بہت سے مسلمان دانشوروں کو اکٹھا کرلیا تھا۔ وہ سب اکٹھے ہوئے تو حاجی ریسرچ سنٹر وجود میں آگیا۔ روش کے علاوہ وہ تین اور بھی نومسلم تھے۔ ان میں جیمز اسمٰعیل گبسن تھا جو برطانوی ٹاؤن پلانر تھا۔ پیٹر اینڈ یٰن تھا جو انگریز ٹرانسپورٹ انجینئر تھا اور ایک امریکی سوشیا لوجسٹ جمیل براؤنسن تھا۔ میں جو طبیعیات اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کا ماہر تھا اور میرے ساتھ دو اور برطانوی مسلمان تھے، ظفر عباس ملک، جو آرٹسٹ اور ڈیزائنر تھے اور زکی بداوی جو شریعت پر تبحر رکھتے تھے۔ ایک اور صاحب تھے جو مصر سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ مویشیوں اور ان کی بیماریوں کے ماہر تھے۔ انجوی نے سنٹر قائم کرنے میں اپنی فلمی اداکاروں والی شخصیت اور سعودی شاہی خاندان کے ساتھ اپنے تعلقات سے پورا کام لیا۔ شاید قائم کرنا غلط لفظ ہے۔ انجوی ہمیشہ کسی نہ کسی طرح اس کے لیے سرمایہ اکٹھا کرلیا کرتا تھا۔ وہ بوریاں بھر بھر کے ریال لے آتا تھا اور ہم انتہائی مہنگا ریسرچ کا ساز و سامان خریدتے اور بھاری بھاری معاوضہ پر غیر ملکی ماہرین کی خدمات حاصل کرتے۔

میں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ ریسرچ سنٹر میں کام شروع کردیا۔ مکہ میرے لیے وہ روشنی ہے جو ہمیشہ میرے دل و دماغ میں دمکتی رہتی ہے۔ یہ وہ نور ہے جس کی جانب ہر

مسلمان اپنا رخ کرتا ہے۔ یہی وہ باتیں ہیں جو مجھے حرمین شریفین کے اپنے پہلے سفر میں یاد آتی رہیں۔ مکہ وہ مقام ہے جہاں پیغمبر اسلام پیدا ہوئے اور یہیں پر کعبہ واقع ہے۔ میں جب حرم میں داخل ہوا تو اس لمحے کی شدت نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا۔ میرے اندر سے ایک حیرت زدہ آواز آئی ''میں یہاں ہوں۔'' میرے سامنے کعبے کی عمارت تھی۔ طلائی تاروں سے مرصع سیاہ غلاف میں ملبوس چوگوشیہ عمارت۔ مسلمانوں کے لیے دنیا بھر میں اس عمارت سے زیادہ اور کوئی عمارت اتنی مانوس اور اتنی پر کشش نہیں ہے۔ میں یہاں ہوں۔ کعبہ خاموش اور پر سکون تھا۔ میں مشکل سے ہی سانس لے رہا تھا۔ لگتا تھا کہ سارے جہان کی تتلیاں پر پھیلائے یہاں اُڑ رہی ہیں۔ میں اسی ہوا کے جھونکے کے ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ مجھے بالکل احساس نہیں تھا کہ میں چل رہا ہوں۔ میں طواف کر رہا تھا۔ کعبے کے گرد سات چکر لگا رہا تھا۔ یہ وہ احساس تھا جس کے ساتھ عمر بھر زندہ رہا جا سکتا ہے لیکن اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔

کعبہ اسلام کی سب سے نمایاں اور ممتاز علامت ہے۔ یہ خدا کا گھر ہے جسے حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کیا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ جو اسلام کے علاوہ یہودی اور عیسائی مذہب کے پیغمبر بھی ہیں۔ ان کی زندگی کے واقعات یہاں بکھرے پڑے ہیں۔ اس مخصوص مقام نے مسلمانوں کو ایک مرکز مہیا کیا ہے جس کی طرف مُنھ کر کے وہ پانچ وقت کی نماز ادا کرتے ہیں۔ جو مسلمان مالی استطاعت رکھتے ہیں وہ زندگی میں کم سے کم ایک بار حج کی سعادت ضرور حاصل کرتے ہیں۔

اسلامی عبادات کے تمام عملی مظاہر میں حج سب سے زیادہ انسانی توجہ کا مرکز بنتا ہے۔ اس مقدس فریضے کی ادائیگی کے لیے مسلمان ساری زندگی روپیہ پیسہ جمع کرتے ہیں۔ ہر مسلمان یہاں ایمان کی تلاش میں نہیں آتا بلکہ وہ اپنا ایمان مزید پختہ کرنے اور اپنے آپ کو اس ایمان کے لیے وقف کرنے یہاں آتا ہے۔ حج مسلمانوں کے روحانی تجربہ کی معراج ہے۔ لغوی طور پر حج کا مطلب ہے انتہائی کوشش۔ اسی لیے حج ایک سعی اور ایک کوشش ہے۔ یہاں مسلمان اپنی ساری جسمانی اور روحانی طاقتیں ایک ہی مقصد کے لیے مرکوز کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ روحانی ترفع حاصل کرتا ہے۔ کعبہ ایک زندہ تاریخ ہے۔ اس کا تقدس اس کے جغرافیہ سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ وہ حرم ہے، پناہ گاہ، ایک ذہنی کیفیت ہے۔ ایک عظیم تجربہ۔ یہ ابتداء ہے، حال ہے اور دوام ہے۔

اس جذبہ سے سرشار ہر مسلمان کبھی ایک جگہ جاتا ہے، کبھی دوسری جگہ اور یہ اس کی

زندگی کا انتہائی پیچیدہ تجربہ ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے اس روحانی اور جسمانی سفر کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارا سنٹر مکہ اور حج کے دنوں کا ایک کمپیوٹر ماڈل تیار کر رہا تھا۔ ہمارا کافی وقت اعداد و شمار اکٹھے کرنے میں لگا۔ ہر قسم کے اعداد و شمار۔ ماحولیات سے لے کر شہر کے طبعی جغرافیہ اور ٹریفک کی روانی تک، سب ہمارے پیش نظر تھے۔ ہم یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ تاریخی اور ثقافتی مقامات کون سے ہیں اور کہاں ہیں، آبادی کی نقل و حرکت کا کیا نظام ہے۔ مکہ والوں کی ثقافتی اور معاشرتی عادات کیسی ہیں۔ کاروباری حالات اور ان کا بڑھتا ہوا حجم کیسا ہے، ہوٹل کتنے ہیں اور کہاں کہاں ہیں۔ اور ان کی تعداد کیسے بڑھ رہی ہے۔ ہنر مند مزدوروں کی کتنی مانگ ہے۔ یہ سب اعداد و شمار کمپیوٹر میں فیڈ کیے جا رہے تھے اور پھر حج کے دوران ہماری سرگرمیاں اپنے عروج پر پہنچ گئیں۔

حج کے دوران مکہ کی آبادی چار گنا بڑھ جاتی ہے۔ مکہ کے پانچ لاکھ شہری دنیا بھر سے آنے والے بیس لاکھ عازمین حج کی مہمان داری کرتے ہیں۔ حج ذوالحج کی نو، دس، گیارہ اور بارہ تاریخ کو ہوتا ہے۔ اس دوران عازمین حج ایک مقام سے دوسرے مقام پر جاتے ہیں۔ میں نے اپنے پانچ سالہ قیام کے دوران ایک ایک ملک کے باشندوں پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ پہلے سال پاکستانی باشندوں کی عادات و اطوار اور ان کے رہن سہن کا مطالعہ کیا۔ دوسرے سال نائجیریا کے باشندوں کا اور اسی طرح دوسرے ملکوں کے لوگوں کا۔ میں نے یہ دیکھا کہ انہیں کیا کیا مشکلیں پیش آتی ہیں۔ کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں نے انہیں عام لباس اتار کر احرام باندھتے اور ایک روحانی کیفیت سے دوسری کیفیت میں داخل ہوتے دیکھا۔ میں ان کے ساتھ حرم کے اندر گیا اور انہیں طواف کرتے غور سے دیکھا۔ یہاں عورت مرد سب اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ عورت اور مرد الگ الگ نہیں ہوتے۔ سب کا مقصد اور مطمح نظر ایک ہی ہوتا ہے۔ کوئی نہیں سوچتا کہ کون کیا ہے۔ طواف کے بعد صفا اور مروہ کی سعی کی جاتی ہے۔ اس کے بعد مکہ سے باہر منیٰ چلے جاتے ہیں۔ میں ان کے ایک ایک قدم کا معائنہ کرتا رہا۔

اس کے بعد میدان عرفات جاتے ہیں۔ وہاں دوپہر پہنچتے ہیں۔ جب سورج نصف النہار پر ہوتا ہے تو وقوف کیا جاتا ہے۔ عرفات میں مسجد النمرہ کے اندر اور باہر بیس لاکھ مسلمان نماز ادا کرتے ہیں۔ دنیا بھر میں اس کی نظیر اور کہیں نہیں ملتی۔ یہاں قوم، نسل اور زبانوں کا فرق مٹ جاتا ہے اور مسلمانوں کے اندر اتحاد اور اخوت کا عظیم جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ اس ہجوم میں

انسان ہوتا ہے اور اس کا خدا اور کوئی شے ان کے درمیان نہیں ہوتی۔ ہر جانب لبیک اللھم لبیک کی آواز ہوتی ہے۔

نویں تاریخ کو سورج ڈوبنے کے ساتھ ہی عرفات سے مزدلفہ کی جانب روانگی شروع ہوجاتی ہے۔ مزدلفہ خشک پہاڑیوں سے گھرا ہوا کھلا میدان ہے۔ وہاں عازمین کھلے آسمان کے نیچے رات گزارتے ہیں۔ دس تاریخ کی صبح کو وہ منٰی روانہ ہوجاتے ہیں جہاں وہ تین دن گزارتے ہیں۔ اس دوران میں وہ قربانی کرتے ہیں اور جمرات میں شیطانوں کو پتھریاں مارتے ہیں۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے اندر کے شیطان سے نجات حاصل کرلے۔ اس فریضہ کے بعد ہر شخص سر کے بال منڈاتا ہے اور احرام اتار دیتا ہے۔ اب اس کا حج مکمل ہوگیا۔

ہماری ٹیم نے مناسک حج کی ایک ایک تفصیل کو ریکارڈ کیا۔ ہم نے اندازہ کیا کہ حرم کی جانب جانے والوں کا ہجوم کتنا ہوتا ہے۔ ہم نے یہ دیکھا کہ جب ایک ہی وقت میں ایک لاکھ افراد خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہیں تو ہر فرد پر کتنا دباؤ ہوتا ہے۔ نیز یہ اندازہ کیا کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں کتنا وقت لگتا ہے۔ ہم نے مقدس مقامات کے گرد چلنے والی ٹریفک کے حجم کا اندازہ کیا اور یہ دیکھا کہ اس سے ماحول کتنا آلودہ ہوتا ہے۔ ہم نے عازمین حج کی رہائش کے انتظام کا جائزہ لیا۔ ان کی صحت کے مسائل ریکارڈ کیے اور ان مقامات کو مارک کیا جہاں رکاوٹیں یا حادثے پیش آسکتے ہیں۔ ہم نے ہوائی جہاز سے تصویریں کھینچیں، خاص خاص اوقات کی فلمیں بنائیں اور ہر پہلو سے مناسک حج کو کمپیوٹر میں ریکارڈ کیا۔ پھر ہم نے حج کے ماضی، حال اور مستقبل کا بغور جائزہ لیا۔ اب ہر چیز ہمارے کمپیوٹر ماڈل میں محفوظ تھی اور ان سے کئی اہم اشارے ہمیں مل رہے تھے۔ ہمارے لیے مکہ کی حرکیات اور نزاکتیں اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ نکلیں، جتنا ہم سمجھ رہے تھے۔ اس شہر میں ایک دوسرے کے ساتھ منسلک بہت سی چیزیں تھیں جن سے حج کے نظام کا توازن قائم تھا۔ اس کے ٹیلے، اس کی پہاڑیاں، اس کی وادیاں، اس کے میدان، اس کی ماحولیاتی فضا اور اس کی طبعی خصوصیات قرآن کی زبان میں اس ''بنجر وادی'' کو کثیر قومیتی اور کثیر پہلو صفات عطا کرتی ہیں۔ مناسک حج کا پورا ماحول اس طرح ہوتا ہے کہ عازمین اس میں اس طرح بہتے چلے جاتے ہیں جیسے نرم روندی کا پانی۔ عازمین کے گروہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک، پہاڑیاں چڑھتے، وادیوں سے گزرتے،

جھاڑیوں اور خشک میدانوں کو عبور کرتے اور سایہ دار پیڑوں کے نیچے آرام کرتے اپنے اپنے حساب سے راستہ طے کرتے ہیں۔ لیکن ضروری مناسک ادا کرنے کے لیے صحیح مقام پر سب بروقت پہنچ جاتے ہیں۔ اتنے نفیس اور نازک نظام کا کوئی آسان سا تجزیہ نہیں کیا جاسکتا اور نہ اس کا کوئی ایک ہی ٹیکنکل حل تلاش کیا جاسکتا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی سے جو تبدیلیاں سامنے آئی ہیں یہ سارا نظام اس سے مطابقت نہیں رکھتا۔ حج روحانی تجربہ سے ایک ڈراؤنے خواب کی سی رکاوٹوں کی طرف بڑھتا جا رہا ہے جس میں ہر حاجی کی زندگی کسی نہ کسی طرح خطرے سے دوچار ہو رہی ہے۔

یہاں جن تجربات کا سامنا کرنا پڑا انجوی نے ہمیں پہلے ان سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ دن ہو یا رات ہر وقت شہزادے، وزرا اور بااثر تاجر ہمارے سنٹر میں آتے رہتے تھے۔ وہ خاموش بیٹھے ہمارے کمپیوٹر کی تصویریں دیکھتے رہتے کہ عازمین حج کس طرح پانی کے قطروں کی طرح بہتے چلے جا رہے ہیں، کس طرح ان مقامات کی نشان دہی کی جا رہی ہے جہاں آگ لگ جانے، عمارت وغیرہ منہدم ہوجانے یا انسانی سانسوں اور بسوں کے دھویں سے انسانوں میں دم گھٹنے کے حادثات ہوسکتے ہیں۔ یا ہم کمپیوٹر پر ایسی فرضی تصویریں بناتے کہ کسی مقام پر ایک دم بہت زیادہ ہجوم ہوجانے یا کوئی اور غیر متوقع صورت حال پیدا ہوجانے سے کیا کچھ ہوسکتا ہے۔ ہماری یہ تمام ملاقاتیں ایک ہی انداز میں ختم ہوتیں۔ وہاں آنے والے مہمان اپنی جسمانی حرکتوں سے حیرت اور خوشی کا اظہار کرتے اور ہمیں شاباش دیتے۔ ایک عام حرکت یہ بھی تھی کہ وہ سی سی کی آواز نکالتے اور ایک ہاتھ ہونٹوں تک لے جا کر اس طرح آگے کرتے کہ انگوٹھا اور شہادت کی انگلی ایک دوسرے سے ملے ہوتے اور باقی تین انگلیاں اوپر اٹھی ہوتیں۔ وہ ہماری مشینوں اور ان کی کارکردگی سے تو بہت متاثر تھے مگر ان کے نتائج سے خوش نہیں تھے۔ جب بااثر شخصیتوں نے ہماری بنائی ہوئی فرضی تصویریں دیکھیں تو وہ بے ساختہ اپنے دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیاں اپنے گالوں پر لے گئے اور انہیں نیچے کی طرف کھینچا اور ایسا تاثر دیا جیسے کہہ رہے ہوں ''کتنی خوبصورت ہیں۔'' سنٹر کے باہر اپنی چمچماتی ہوئی نئی مرسیڈیز کاروں کے پاس بھی انہوں نے ایسا ہی کیا۔

ٹیکنالوجی کے بارے میں سعودی باشندوں کا رویہ ایسا ہی ہے جیسے یہ بھی دینیات ہو۔ ان کے نزدیک دونوں میں ثنویت یا کثرت کی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ ایک ہے، پیغمبر ایک ہے

اور امت ایک ہے۔ چونکہ آراء کی کثرت نے اسلام کو نقصان پہنچایا ہے اس لیے مکہ کے بارے میں کئی رائیں اور عازمین حج کے مختلف مسائل کے مختلف حل بھی تباہی کا باعث بن سکتے ہیں۔ عازمین حج کے مسائل کا واحد حل ہے جدید ٹیکنالوجی۔ اگر مکہ سے باہر جانے والی دو رویہ سڑک سے ٹریفک جیم پیدا ہوتا ہے تو تین رویہ، چار رویہ یا چھ اور آٹھ رویہ سڑکیں بنادی جائیں۔ اس مسئلے پر غور کرنا ضروری ہی نہیں ہے کہ زیادہ سڑکوں سے اور بھی ہجوم ہوگا۔ اگر سچ ایک ہے تو مقدس مقامات کو بھی اس واحد سچ کی عکاسی کرنا چاہیے۔ چنانچہ ہر چیز کو ایک ہی سطح پر ہونا چاہیے۔ مکّے میں تاریخ یا ثقافتی روایات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ حالانکہ قرآن کہتا ہے کہ انسانی فطرت اور انسانی معاشرہ میں تنوع رکھا گیا ہے۔ مجھے وہ بدقست دن یاد ہیں جب عثمانی دور کی ایک لائبریری منہدم کر کے زمین صاف کردی گئی تھی۔ پرانے روایتی مکان، قدیم مساجد، اور مقدس علاقوں کی مقناطیسی گلیاں اور موڑ اور پہاڑیاں اور وادیاں سب خاک میں ملا دی گئی تھیں۔ ہر چیز سپاٹ اور یکساں کردی گئی تھی۔ ہم اپنے سنٹر میں بہت روئے پیٹے اور ان کے سامنے بے شمار دلائل کے ڈھیر لگادئے کہ یہ سب غلط ہورہا ہے مگر بے کار۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اپنے بے شمار دشمن بنا لیے۔ ان میں سب زیادہ زہریلا دشمن بن لادن گروپ تھا۔ بن لادن خاندان اصل میں تو جنوبی یمن کے شہر حضرموت سے تعلق رکھتا ہے لیکن سعودی عرب کے شاہی خاندان سے اس کے بہت ہی گہرے تعلقات ہیں۔ اس خاندان کے بزرگ محمد بن لادن نے ۱۹۳۰ء میں تعمیرات کا کام شروع کیا تھا اور اس نے بڑی بڑی سڑکیں اور عظیم الشان شاہی محل تعمیر کیے۔ شاہی خاندان اس سے اتنا خوش ہوا کہ اسے صرف حرم شریف کی تعمیر نو اور آرائش وزیبائش کا کام ہی نہیں دیا گیا بلکہ ملک کے اندر تمام متبرک مقامات کی تعمیر ومرمت کا کام صرف اسی کو دے دیا گیا ہے۔ اب بن لادن گروپ دینی جوش کے ساتھ اس کام میں بھی لگا ہوا ہے۔ ہم جتنا احتجاج کرتے کہ قدیم تاریخی عمارتیں گرانے اور نئی عمارتیں بنانے کا کام کچھ دن کے لیے روک دیا جائے تاکہ اس کے بارے میں غور کرلیا جائے کہ مستقبل میں اس کے کتنے ناقابل تلافی نقصان ہوں گے، اتنا ہی توڑ پھوڑ کا کام اور بھی تیز کر دیا جاتا۔

۱۹۷۹ء میں میں نے پانچواں حج کیا۔ ۱۹۷۷ء میں میرے والد بھی میرے ساتھ تھے۔ میری والدہ چونکہ بہت ہی زیادہ مہم باز ہیں اس لیے وہ انجوی سے میری ملاقات سے بھی پہلے ہی حج کرچکی تھیں۔ ۱۹۷۷ء کے آخر میں میری شادی ہوئی، چنانچہ ۱۹۷۸ء کے حج میں میری

بیوی بھی میرے ساتھ تھیں۔ میں نے کہہ تو دیا کہ وہ میرے ساتھ تھیں لیکن دراصل انہوں نے اسی سال الگ حج کیا تھا۔ کیونکہ وہ حج میں نے حج ریسرچ سنٹر کے اپنے ساتھی ظفر ملک اور ایک گدھے کے ساتھ پیدل کیا تھا۔ ہم جدہ سے ستر کیلومیٹر دور پہاڑیاں اور ریگستان عبور کرتے مکہ پہنچے تھے۔ ہمارے چلنے کی رفتار کا تعین گرمی اور دھوپ کی تپش کرتی تھی اور پھر ہم اس علاقے کا لینڈ اسکیپ، اس کے رنگ، اس کی شکل وصورت اور اس کی روشنی اور سائے اپنے اندر جذب کرتے جاتے تھے۔ میں چل رہا تھا تو میرا دماغ اور میری روح مناسک حج کی دائمی ادائیگی اور اس کے تسلسل کے تصور سے سرشار تھے۔ مجھے ایک ایک قدم پر یہ احساس رہتا تھا کہ مجھ سے پہلے اس کرۂ ارض پر کتنی ہی نسلیں اسی طرح یہ متبرک سفر کر چکی ہیں۔ جب مکہ پہنچا تو میں ہر جگہ گیا اور ہر مرحلے کے مناسک ادا کیے۔ میرے پیدل سفر کا مقصد یہ تھا کہ قدیم روایت تازہ کی جائے اور یہ ظاہر کیا جائے کہ پیدل چلنا صرف ایک انسانی عمل ہی نہیں ہے بلکہ حج کا جو روحانی مقصد ہے اسے پورا کرنا بھی ہے۔

لیکن اس سال میں ایک عام سا عازم حج تھا۔ میں حاجیوں کی بس میں بیٹھا تھا جو تیز دھوپ میں پیچیدہ سڑکوں، چوراہوں اور موڑوں سے گزرتی گیارہ گھنٹے میں منیٰ پہنچی۔ راستے میں میں نے بے شمار بڑی بڑی ائیر کنڈیشنڈ کاریں دیکھیں جو امیر اور طاقت ور لوگوں کو لیے جا رہی تھیں۔ وہ مقام جہاں شیطان کو پتھر مارے جاتے ہیں اسے ملٹی اسٹوری کا پارک بنا دیا گیا ہے۔ وہاں پتھر مارنے والوں کا اتنا ہجوم تھا کہ میں لوگوں کے پیروں کے نیچے کچلتے کچلتے بچا۔ سارا ہجوم ایک ہی طرف کو جا رہا تھا اور ہر شخص اس فکر میں تھا کہ وہی سب سے پہلے یہ فریضہ ادا کرلے۔ پیچھے سے ریلے پر ریلا چلا آرہا تھا۔ منیٰ، عرفات اور مزدلفہ کے سارے سفر میں میں برابر کھانستا کھنکارتا رہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہاں بسوں اور کاروں کا جو اسی ٹن زہریلا دھواں ہر روز پھیلتا ہے وہ سب میرے اندر ہی جا رہا ہے اور میرے روئیں روئیں کو زہر آلود کر رہا ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد میں ڈی ڈی ٹی سے بھیگ جاتا جو ہوا میں اڑنے والے ہیلی کاپٹر مسلسل عازمین حج کے سروں پر چھڑک رہے تھے۔ کعبے میں بھی مجھے مسلسل مذہبی پولیس کی چھڑیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا جو ذرا ذرا سی بات پر ٹوک دیتی تھی۔ میں حرم شریف میں بیٹھا تھا تو مجھے لگا جیسے میں ریلوے کے انڈر گراؤنڈ اسٹیشن میں بیٹھا ہوں جہاں اسکلیٹر بھی لگے ہوئے ہیں۔ میں نے کعبے کے اوپر دیکھا۔ لاتعداد آرک لائٹس کی روشنی میں حرم سے باہر کا بھی سارا علاقہ ایسی رات میں

ڈوبا ہوا تھا جہاں اندھیرے کا گزر تک نہیں ہے۔ میں وہ جگہ دیکھ رہا تھا جہاں حرم سے اونچا اور قریب قریب اس پر چھایا ہوا شاہی محل تعمیر کیا جا رہا تھا۔ اسی لمحہ میرے اوپر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی۔ ایک ماورائی نفرت نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ میں نے حج کرلیا۔ لیکن اسی لمحہ میں اس سے بیزار بھی ہوگیا۔ جب میٹر اور اینٹی میٹر ٹکراتے ہیں تو کچھ بھی نہیں بچتا۔ میں وہ لمحہ کیسے برداشت کرسکتا تھا جس لمحے ہر شے کو نیست و نابود کیا جا رہا تھا۔ میں نے جو کچھ دیکھا وہ محض تہذیبی روایات پر حملہ ہی نہیں تھا بلکہ وہ ان روحانی اور فلسفیانہ قدروں پر بھی حملہ ہے جنہوں نے ہمیں ثروت مند بنایا ہے اور جو اتنی ہی نازک اور نفیس ہیں جتنی لکڑی کی کھڑکیوں پر بنی ہوئی وہ نازک جالیاں جو ان تمام قدیم چیزوں کے ساتھ تیزی سے مٹائی جا رہی ہیں جو اب تک روایات کے تخلیق یا مکانات کی حفاظت کرتی رہی ہیں۔ کنکریٹ اور اسفالٹ کی سڑکیں اور عمارتیں جھلسا دینے والی گرمی کو اپنے اندر محفوظ کرتی ہیں اور پھر اسے باہر اگل دیتی ہیں۔ یہ طاقت اور اقتدار کی نشانیاں ہیں۔ میرے اردگرد جتنے بھی لوگ تھے وہ گرمی اور ناقابل برداشت حدت ان سب کے دماغ ماؤف کر رہی تھی۔ یہ گرم ہوا اور حرارت انہیں صرف ایک ایسے اسلام کے لیے ہی تیار کرسکتی ہے جو انسانوں کے بنائے ہوئے اس بنجر لینڈ اسکیپ میں دوسری دنیاؤں کو نہ دیکھے بلکہ سیدھی لائن میں ہی دیکھے اور دنیا کو اندھیرے اور اجالے میں تقسیم کردے۔ مکے کے ساتھ جو ہو رہا تھا وہی میرے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ بھلا اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔ مکہ عالم اسلام کی اپنی ایک چھوٹی سی دنیا ہے۔ وہاں پانچ سال گزارنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اب یہاں سے چلا جانا چاہیے۔

باب۔۸

سعودی عرب سے روانگی

جیسے ہی حج مکمل ہوا میں نے شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی کے انتظامی دفتر ''ادارہ'' کو روانگی کے ویزا کی درخواست پیش کر دی۔ روانگی کا ویزا محض درخواست بھیج کر نہیں لیا جا سکتا۔ میں نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا تھا۔ خواب کو حقیقت بننے میں کئی دن لگتے ہیں۔ لیکن میرا فیصلہ اچانک تھا۔ لیکن روانگی کا ویزا لینا بھی ایک مشکل مرحلہ تھا۔ اوّل تو مجھے اس رشتے سے اپنا ناطہ توڑنا تھا جو میں نے اتنی محبت سے قائم کیا تھا۔ پھر اس کے لیے کئی کاغذوں اور فارموں پر دستخط کرنا تھے اور اس کام کے لیے مجھے اپنے آپ کو تیار بھی کرنا تھا۔ اس کام میں کئی ہفتے لگ گئے۔ کبھی ایک دفتر سے دستخط کرائے جاتے تو کبھی دوسرے دفتر سے۔ اس طرح پورے اٹھارہ دستخط کیے گئے اور اٹھارہ دستخط کرائے گئے۔ ہر ایک دستخط کے ساتھ کوئی نہ کوئی اہم مسئلہ منسلک ہوتا تھا۔ جیسے میں نے ایک ایسے فارم پر دستخط کیے کہ میں اپنے ساتھ اپنے دفتر یعنی یونیورسٹی کی کوئی چیز نہیں لیے جا رہا ہوں۔ اس بات کی یقین دہانی کے لیے کہ میں نے لائبریری سے جو کتابیں نکلوائی تھیں وہ میں اپنے ساتھ تو نہیں لیے جا رہا ہوں میں نے ایک فارم پر دستخط کیے۔ یا پھر یہ کہ میں نے اپنے معاہدے کے مطابق تمام ذمہ داریاں پوری کی ہیں۔ ایک فارم پر یہ دستخط بھی کیے گئے کہ میں نے اپنے پانچ سال کے قیام میں کسی کو ناراض تو نہیں کیا اور میں کسی مکان کا کرایہ ادا کیے بغیر تو نہیں جا رہا ہوں۔ اس تمام کارروائی کے بعد اب انتظامی دفتر کے سربراہ کے دستخط ہی رہ گئے تھے۔

اب میں انتظامیہ کے ڈائریکٹر یا مدیر عبدالعزیز الترکی کے سامنے پیش ہوا۔ وہ ایک دبلے پتلے اور باز کی سی تیز آنکھوں والے انسان تھے جو بہت ہی بڑی میز کے پیچھے بیٹھے تھے۔ میں نے عرض کیا ''کیا آپ میری درخواست پر دستخط فرما دیں گے۔'' انہوں نے مجھے دیکھا، مسکرائے اور بولے ''ان شاء اللہ۔'' میں بھی مسکرایا۔ ہم دونوں کی مسکراہٹیں مختلف معانی رکھتی تھیں۔ ان کی مسکراہٹ سے بے نیازی ظاہر ہورہی تھی اور میرے چہرے پر جو مجبوری کی مسکراہٹ تھی وہ کہہ رہی تھی میں آپ پر یقین کروں یا نہ کروں؟

انہوں نے پھر وہی لفظ دہرایا۔ ان شاء اللہ۔ یہ واحد لفظ ہے جو ان لوگوں کی فکر اور ان کی ذہنیت کی غمازی کرتا ہے۔ وہ اپنا سب کام اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر اللہ نے چاہا۔ اگر اللہ کی مرضی ہوئی۔ اس سے انسان اور دنیا کی تخلیق کی تمام پیچیدگیاں سامنے آجاتی ہیں۔ ہم کچھ نہیں کرسکتے جو کرے گا اللہ ہی کرے گا کیونکہ انسان کے ہر عمل کے ساتھ بہت بھاری ذمہ داریاں منسلک ہوتی ہیں اور ان میں ایسی فلسفیانہ پیچیدگیاں ہوتی ہیں جو انسان کی دسترس سے باہر ہیں۔

''ان شاء اللہ'' الترکی نے اپنے آپ سے کہا۔ ''میں تمہارے کاغذات کل تک دیکھ لوں گا اور تم کل اپنے سفر پر روانہ ہوجاؤ گے۔ ان شاء اللہ۔ تم بیٹھتے کیوں نہیں؟ ہمارے ساتھ چائے پیو۔'' سعودی عرب کے تمام باشندوں کی طرح وہ بھی صاف گوئی سے زیادہ خوش خلقی کا مظاہرہ کررہے تھے۔ چائے کے لیے ان کی دعوت قبول نہ کرنے کا مطلب تھا انہیں ناراض کرلینا اور اس کا میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

ایک فراش یا چپراسی اندر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ننھی منی چائے کی پیالیاں تھیں اور دوسرے ہاتھ میں پیتل کی روایتی کیتلی۔ کمرے میں موجود ہر شخص کو خاموشی کے ساتھ میٹھی چائے پیش کی گئی۔ جیسے ہی چائے ختم ہوتی فوراً ہی پیالی دوبارہ بھر دی جاتی۔ اگر کسی کو مزید پینا نہ ہوتی تو وہ پیالی کو اپنے سینے کی طرف لے جا کر اس کے کنارے پر انگلی مارتا۔ ثابت ہوا کہ ان سے کوئی بھی فیصلہ کرانے کے لیے اپنے گردوں پر دباؤ ڈالنا ضروری ہوتا ہے۔ میں بھی خاموشی سے بیٹھا پیالی پر پیالی چائے پیتا رہا۔ آخر الترکی نے میری طرف دیکھا اور پھر عام عربوں والا کام کیا۔ انہوں نے اپنی ٹھوڑی اوپر اٹھائی، ایک ہاتھ اوپر لے جا کر جیسے مکھی اڑائی اور دانتوں ہی دانتوں میں کہا ''ان شاء اللہ بکرہ۔'' یعنی کل کام ہوجائے گا ان شاء اللہ۔ ان کے اس بیان میں کسی قسم کی یقین دہانی نہیں تھی، ان کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ آج تو اللہ کی مرضی نہیں ہے۔ کل

بھی دیکھیں گے کہ اللہ کی مرضی ہوتی ہے یا نہیں۔ اللہ کے کام میں کون دخل دے سکتا ہے۔ یقین کے ساتھ کوئی بات کہنا کفر ہے۔ اب میرے لیے اس دفتر میں بیٹھا رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میرے لیے منطقی عمل یہی تھا کہ وہاں سے نکل لوں۔ ظاہر ہے آج میری درخوست پر آخری دستخط نہیں ہو سکتے۔ دوسرے دن میں وہاں گیا تو ان کا ''بکرہ'' یا کل ابھی نہیں آیا تھا اور پھر یہ بکرہ کئی ہفتے نہیں آیا۔ آنحضرت ﷺ نے واضح طور پر کہا تھا کہ اللہ کی مرضی پر چھوڑنے کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ خود کوئی فیصلہ ہی نہ کیا جائے۔ مقصد یہ تھا کہ خود فیصلہ کرو اور پھر اللہ پر چھوڑ دو، اس دعا کے ساتھ کہ اللہ اس کام کو کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اب میں نے بھی دعائیں شروع کر دیں کہ اللہ جلد سے جلد میرا کام کرا دے۔

ایک دن میں سورج نکلنے سے پہلے ہی ان کے دفتر پہنچ گیا۔ میں ان کی میز کے سامنے ایک صوفے پر ڈٹ کر بیٹھ گیا اور کتاب پڑھنے لگا۔ چند منٹ بعد وہ آئے اور حیران ہوئے کہ میں مُنھ اندھیرے وہاں کیسے پہنچ گیا۔ چونکہ اس وقت وہاں اور کوئی نہیں تھا اس لیے مجبوراً انہیں خیر مقدمی کلمات میرے لیے ہی کہنا پڑے۔

''اہلاً وسہلاً۔''

''اہلاً۔'' میں نے بھی کہا۔

''کیف حال۔'' (کیا حال ہے)

''کیف حال۔'' میں نے بھی جواب دیا۔

''الحمدللہ۔ اللہ یبارک فی۔ اللہ یبارک فی۔''

''الحمدللہ۔ اللہ یبارک فی، اللہ یبارک فی، اللہ یبارک فی۔'' انہوں نے دو دو بار کہا تھا تو میں نے تین تین بار کہا۔

وہ اپنی ایگزیکٹیو کرسی پر آرام سے بیٹھے اور تھوڑا توقف کیا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ میں نے ایک بار بھی کتاب سے آنکھیں نہیں اٹھائیں۔

''کیف صحت؟''

''کیف صحت''

''الحمدللہ۔ اللہ یبارک فی، اللہ یبارک فی۔''

''الحمدللہ، اللہ یبارک فی۔ اللہ یبارک فی۔ اللہ یبارک فی۔''

میں نے ایک لحظہ کو بھی آنکھیں اوپر نہیں اٹھائیں۔

''ایش خبر؟'' (کیا خبریں ہیں؟) انہوں نے کہا۔

''ایش خبر؟'' میں نے بھی اسی طرح کہا۔

''الحمد للہ، یبارک فی۔ اللہ یبارک فی۔''

''الحمد للہ۔ اللہ یبارک فی۔ اللہ یبارک فی۔''

اب وہ بے قابو ہو گئے۔ انہوں نے آگے جھک کر دیکھنے کی کوشش کی کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں۔ میں اسی طرح پڑھتا رہا۔ میں نے کتاب اس طرح رکھی ہوئی تھی کہ وہ یہ دیکھ نہیں سکتے تھے کہ کیا کتاب ہے۔ آخر مجبور ہو کر انہوں نے سوال کر ڈالا۔

''کیا پڑھ رہے ہو؟''

''یہ ابن المرزبان کی کتاب ہے۔ ان بہت سے جانداروں پر کتوں کی فضیلت کے بارے میں جو کپڑے پہنتے ہیں۔'' میں نے کتاب پر سے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔

''اوہ۔'' ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اپنے چہرے پر حیرت کے تاثرات لائیں یا مسکرائیں۔

''آپ نے یہ کتاب پڑھی ہے؟ یہ کئی کہانیوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ کہانیاں اس گفتگو پر مبنی ہیں جو دسویں صدی کے بغداد میں مرزبان اور اس کے دوست کے درمیان ہوئی۔ وہ اس بات پر غور کر رہے تھے کہ عربوں کا اخلاقی معیار کتنا گر گیا ہے اور ان میں ذمہ داری کا احساس کتنا کم ہو گیا ہے۔ وہ ان دنوں کو یاد کر رہے تھے جب ہر کام مستعدی کے ساتھ بروقت ہو جاتا تھا اور وہ آدمی کے سب سے اچھے دوست کتے کی تعریف کر رہے تھے کہ وہ کیسا وفادار اور ذمہ دار ہوتا ہے۔'' میں ٹھہرا اور پھر کہا۔ ''کتے کی خوبی ہے اس کی وفاداری، ذہانت، فوراً ردِ عمل اور اس کی حفاظت کی سرشت۔''

''میں آپ کو اس کی نظم پڑھ کے سناتا ہوں۔'' میں نے کن انکھیوں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں، نہیں۔'' انہوں نے کہا ''اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

مگر میں نے پھر بھی پڑھنا شروع کر دیا۔

''تم نے اے عرب، وہ تمام خصلتیں اختیار کر رکھی ہیں جو کتے سے بدتر ہیں۔

کتا مدد اور حفاظت کرتا ہے۔
وہ وفادار ہوتا ہے اور وہی کام کرتا ہے جو تم اس سے کراتے ہو۔
وہ پورے محلّے کی چوکیداری کرتا ہے۔
وہ یہ کام رضا کارانہ طور پر کرتا ہے کسی مجبوری سے نہیں۔
وہ تمہارا غصہ دور بھگاتا ہے اور تمہاری پریشانیاں دور کرتا ہے۔
اگر تم اس کی طرح ہوتے تو میرے سینے پر دہکتی انگیٹھی کی طرح سوار نہ ہوتے۔

ترکی نے قہقہہ لگایا ''مرزبان نے کتاب کے نام میں بہت سے لوگ کہہ کر اسے مبہم کردیا ہے۔ یہ بات مجھے اچھی لگی۔ کم سے کم اس نے یہ نہیں کہا کہ تمام لوگوں نے وہ خصلتیں اختیار کرلی ہیں جو کتے سے بدتر ہیں۔''

میں نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور دستخط کرنے کا اشارہ کیا۔ ترکی نے ہاتھ اٹھایا اور اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ میں ان کے قریب ایک چھوٹی سی کرسی پر جا بیٹھا۔ انہوں نے اپنا دایاں بازو میرے کاندھوں پر رکھا اور آہستہ سے کہا ''میرے بھائی، چپکے سے بتا دو، تم کتنی رقم اپنے ساتھ لیے جا رہے ہو؟''

''پچاس ہزار پاؤنڈ نقد۔'' میں نے کسی جھجھک کے بغیر جواب دیا۔ ''یہ رقم میں نے پانچ سال اپنے سنٹر میں کام کرکے جمع کی ہے۔''

اب ترکی نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا ''بس؟ اتنی سی رقم ہے۔ لاؤ دکھاؤ تمہاری فائل کہاں ہے۔''

شطرنج کا کھلاڑی کیسپروف بھی یہ چال نہیں چل سکتا تھا۔ میں اپنی چال میں کامیاب ہوگیا تھا۔ ترکی نے کاغذات کے انبار میں میری فائل تلاش کرنا شروع کی۔ انہوں نے ایک کاغذ اٹھایا رکھ دیا۔ پھر دوسرا اٹھایا رکھ دیا۔ پھر کچھ فائلیں ادھر ادھر کیں۔ کچھ فائلیں میز کے ایک کونے سے اٹھا کر دوسرے کونے پر رکھیں۔ ''یہیں ہونا چاہیے اسے۔'' وہ مُنھ ہی مُنھ میں بڑبڑائے۔ پھر کچھ فائلیں اِدھر اُدھر کیں۔ آخر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے ''مجھے نہیں ملتی تمہاری فائل۔ وہ تو کھو گئی۔''

انہوں نے میرے چہرے پر غصے کے آثار دیکھے۔ ''ملیش'' انہوں نے کہا فکر نہ کرو۔ چند سال یہاں اور رہو۔ ذرا سوچو تو، تم اور کتنے پاؤنڈ جمع کرلوگے۔''

اب مجھے شہ مات ہوگئی تھی ۔ فتح حاصل کرتے کرتے مجھے ان کی IBM یعنی انٹر کانٹی نینٹل بیلسٹک مزائل نے شکست دے دی تھی ۔ مسلم دنیا کی آئی بی ایم ہے انشاء اللہ، بکرہ، اور ملیش ۔ شاید میرے مُنھ سے آئی بی ایم زور سے نکل گیا تھا۔

''آئی بی ایم ؟'' انہوں نے آگے جھک کر سوال کیا۔

''جی ہاں، آئی بی ایم ۔ ٹرانس نیشنل بیماری جو ساری عرب دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔''

اب دستخط کرانے کا کام دوبارہ شروع کرنا پڑا۔ اس بار میں نے ایک اور راستہ اختیار کیا۔ میں سیدھا عبداللہ نصیف کے پاس جا پہنچا۔ نصیف میرے ساتھ لندن میں FOSIS میں کام کرتے تھے۔ اب وہ اس یونیورسٹی کے صدر تھے۔ نصیف نے ہی انجوی کو میرے گھر بھیجا تھا اور یہ نصیف کا اثر ورسوخ ہی تھا جس کی وجہ سے ریسرچ سنٹر کام کر رہا تھا۔ وہ ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد لندن سے واپس آگئے تھے ۔ پہلے وہ یونیورسٹی کے سیکریٹری جنرل رہے پھر ترقی کر کے صدر بن گئے تھے۔ وہ میرے مرّبی بھی تھے اور دوست بھی ۔ اب مجھے ان کی ضرورت پڑ گئی تھی۔

نصیف نے مجھے دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ کچھ گڑ بڑ ہے۔ ''میں جانا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا اور میں اس کی لمبی چوڑی وضاحت کرنا چاہتا تھا مگر وہ مجھے فوراً اپنے دفتر میں لے گئے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ معاملہ کیا ہے ۔ میں ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا'' میں دفتری قواعد کے مطابق چلنے کی کوشش کر رہا تھا مگر ۔۔۔'' میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی انہوں نے مجھے ٹوک دیا۔ ''میں سب جانتا ہوں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے کسی کو ٹیلی فون کیا ۔ کچھ دیر وہ باتیں کرتے رہے پھر میری طرف دیکھ کر مسکرائے'' میں نے آپ کو آج ہی ویزا دلانے کا طریقہ ڈھونڈ لیا ہے۔''

انہوں نے اپنے فراش سے کہا کہ شیخ عبداللہ کو بلاؤ۔

تھوڑی دیر بعد شیخ عبداللہ کمرے میں داخل ہوئے اور ادب کے ساتھ ایک کونے میں کھڑے ہوگئے ۔ میں شیخ عبداللہ کو بخوبی جانتا تھا۔ وہ چھوٹے سے قد کے آدمی تھے ۔ ان کی عمر ہوگی یہی کوئی ساٹھ سال ۔ یونیورسٹی کے ملازموں کو ویزا دلانا ان کی ذمہ داری تھی ۔ اس لیے انہیں یونیورسٹی میں بہت اہمیت حاصل تھی ۔ ہر ملازم سال دو سال میں دو بار ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا تھا ۔ ایک بار ویزا لینے اور دوسری بار ان کا شکریہ ادا کرنے۔ حالانکہ یہ ان کا فرض تھا ۔ اگرچہ ان کے پاس ماتحتوں کی ایک فوج تھی اس کے باوجود ان کے ہاں بھی اس کام میں تین ہفتے سے کم نہیں لگتے تھے۔

نصیف نے انہیں ایک خط دیا "اسے جوازہ لے جاؤ۔" انہوں نے میری طرف اشارہ کیا "اور یاد رکھو۔ ویزا آج ہی ملنا چاہیے۔"

عبداللہ ایسے حیران کھڑے تھے جیسے وہ کسی دیوار سے ٹکرا گئے ہوں۔ "یہ نہیں ہوسکتا۔ یہ نہیں ہوسکتا" وہ بڑبڑائے "میں نے ان کے لیے ویزا لینے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ مگر تین دن سے پہلے وہ کسی طرح بھی نہیں مل سکتا۔"

"یہ کام آج ہی ہوگا۔ میں جوازہ کے ڈائریکٹر سے خود بات کرتا ہوں۔"

"مگر"

"یہ میرا حکم ہے۔ سیدھے جوازہ چلے جاؤ۔"

شیخ عبداللہ نے حکم بجالانے کا اشارہ کیا۔ اس نے پہلے اپنی ناک کی نوک کی طرف انگلی اٹھائی پھر دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی اپنی دائیں آنکھ کی طرف لے گیا۔

نصیف میری طرف دیکھ کر مسکرایا "آپ اس کے ساتھ جائیے اور جب تک کام نہ ہو جائے اس کے ساتھ ہی رہیے۔"

میں شیخ عبداللہ کے پیچھے پیچھے باہر نکلا۔

شیخ عبداللہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جیسے جم سی گئی تھی۔ اب وہ پہلے سے زیادہ سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ میں نے بھی سوچا کہ اس وقت اس کے ساتھ بات کرنا مناسب نہیں ہے اس لیے میں خاموشی کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ اپنے دفتر میں داخل ہوا۔ نصیف کا خط اور میرے کاغذات ایک فائل کور میں رکھے اور اپنے اسسٹنٹ کو بتایا کہ وہ ایک خاص کام سے پاسپورٹ آفس جارہا ہے اور اب دفتر نہیں آئے گا۔ ہم عبداللہ کی پرانی فورڈ پک اپ میں پرانے ہوائی اڈے کے قریب وزارت داخلہ کے دفتر کی طرف روانہ ہوگئے۔

جوازہ میں ہم سیدھے وزارت داخلہ کے ویزا سیکشن کے ڈائریکٹر کے دفتر میں چلے گئے۔ شیخ عبداللہ نے میری فائل ڈائریکٹر کے سامنے رکھ دی۔ ڈائریکٹر نے بڑی توجہ سے خط پڑھا۔ پھر اس پر کچھ لکھا اور شیخ عبداللہ سے کہا کہ اسے فلاں کھڑکی پر لے جاؤ۔ وہ کھڑکی اصل میں ایک بہت بڑی دیوار میں چھوٹا سا سوراخ تھی۔ وہ قریب اسی ضرب پچاس سینٹی میٹر کی تھی جس پر دس دس سینٹی میٹر کے فاصلے سے پانچ فولادی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ بیک وقت دو درجن کے قریب لوگ اس سوراخ میں سے اپنے کاغذات اندر پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے اور زور

زور سے بول بھی رہے تھے ۔یہ تماشہ دیکھ کر میرا دل بیٹھنے لگا۔ میں نے سوچا۔ بھول جاؤ ویزا، ہم تو کھڑکی کے قریب بھی نہیں جاسکتے۔

شیخ عبداللہ نے میرے خیالات پڑھ لیے۔اس نے میرا کاندھا تھپ تھپایا'' فکر نہ کرو۔ میں جانتا ہوں مجھے کیا کرنا ہے۔تم یہیں ٹھہرو اور تماشہ دیکھو۔''

اس نے فاسٹ بولر کی طرح اس ہجوم سے دور ہٹ کر اپنے قدم گنے۔ پھر اپنی عبا کا دامن اٹھا کر اسے اپنی کمر کے گرد باندھ لیا۔اب وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔اس کے مُنھ میں سونے کا ایک دانت چمک رہا تھا۔اس کے بعد اچانک اس نے ایک زور کی چیخ ماری'' یا اللہ'' اور افغان مجاہد کی طرح دوڑتا ہوا میدان جنگ میں کود گیا۔کھڑکی کے گرد جمع لوگ ایک دم گھبرا گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہوگیا ہے۔عبداللہ بجلی کی تیزی سے ان کے سروں اور کاندھوں پر چڑھتا ہوا کھڑکی پر پہنچ گیا تھا۔اس نے لوگوں کے سروں پر سے اترنے سے پہلے ہی فائل کھڑکی کے اندر کھڑے آدمی کے ہاتھ میں دے دی۔ اس کے بعد نہایت آرام کے ساتھ واپس آکر میرے ساتھ کھڑا ہوگیا۔

''میں کبھی ناکام نہیں ہوا۔'' اس نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

''میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ کی عمر کا آدمی اتنا پھرتیلا اور اتنا طاقت ور ہوسکتا ہے۔''میں نے مرعوب ہو کر کہا۔

''میری بیوی بھی یہی کہتی ہے۔'' وہ مسکرایا۔دھوپ میں اس کا سونے کا دانت چمک رہا تھا۔

''یہ کرتب کرتے ہوئے آپ کو کھڑکی کی سلاخیں کبھی نہیں لگیں؟''

''کبھی نہیں۔''

''اب کیا کرنا ہے؟''

''جویا''اس نے دائیں ہاتھ کی انگلیاں انگوٹھے سے ملائیں اور انہیں سینے کے قریب لے گیا۔''جویا''۔یعنی انتظار۔

آدھ گھنٹے بعد کھڑکی بند ہوگئی اور ہجوم بکھر گیا۔کچھ لوگ ادھر ادھر کھڑے ہوگئے ۔ کچھ سائے کی تلاش میں پیچھے ہٹ گئے ۔ میں اور عبداللہ ایک پیڑ کے نیچے اکڑوں بیٹھ گئے ۔

سعودی باشندوں نے انتظار کو فنِ لطیف کا درجہ دے دیا ہے ۔ ان کے ہاں جویا ایک بہت ہی عام لفظ ہے۔اس کا تعلق وقت کے بارے میں بدوؤں کے تصور سے ہے۔کہا جاتا ہے

کہ ان کی تاریخ میں بدوؤں کے پاس کچھ بھی کرنے کو نہیں ہوتا تھا اور نہ ان کی کوئی ملکیت ہوتی تھی۔ ان کے پاس وقت ہی وقت ہوتا تھا۔ وہ ادھر ادھر گھومنے پھرنے میں وقت گزارتے تھے۔ انہیں کوئی جلدی نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ انتظار سعودی زندگی کا ایک لازمی حصہ بن گیا ہے۔ اس سلسلے میں سعودیوں کے تصور وقت کا تصادم مغربی سائنس دانوں یا کاری گروں کے ساتھ اس وقت ہوتا ہے جب سائنس داں کوئی کام کرتے ہوئے سیکنڈوں اور منٹوں کا حساب لگاتے ہیں اور سعودی باشندے زندگی کو موسموں اور برسوں کے حساب سے دیکھتے ہیں۔ سعودی باشندے کسی بھی کام کے لیے کبھی کوئی وقت مقرر نہیں کرتے۔ اگر کوئی سعودی آپ سے کہے ان شاء اللہ، بکرہ وہ آپ کے پاس آئے گا۔ تو سمجھ لیجے کہ اس کا مطلب آنے والا کل بھی ہو سکتا ہے، پرسوں بھی اور مستقبل قریب بھی، بلکہ قیامت سے پہلے کوئی دن بھی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ملاقات کا وقت گھنٹے یا منٹ کے حساب سے نہیں دیا جاتا بلکہ نمازوں کے اوقات کے حساب سے دیا جاتا ہے۔ اگر وہ ظہر کی نماز کے بعد کا وقت دے گا تو اس کا مطلب ہوگا ظہر کے بعد سورج غروب ہونے تک کسی وقت بھی۔ وقت کا حساب بھی گھنٹوں میں رکھا جاتا ہے۔ اگر پانچ بجنے میں بیس منٹ ہوں یا پانچ بج کر بیس منٹ ہوئے ہوں تو وہ پانچ بجے ہی کہے گا۔

عجیب بات ہے کہ وقت کا یہ تصور وہابی مسلک کا لازمی جزو بن گیا ہے۔ یہ مسلک سعودی عرب کا سرکاری مسلک ہے۔ اس کے بانی عبدالوہاب تھے جو ۱۷۰۳ء میں نجد کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ حنبلی مسلک سے تعلق رکھتے تھے جو چار اسلامی مسالک میں سب سے سخت مسلک ہے۔ عبدالوہاب قرآن اور سنت کی طرف رجوع کرنے پر زور دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہمیں اصل اسلام کی طرف واپس جانا چاہیے۔ وہابی عید میلادالنبی منانے اور بزرگوں کے مزاروں پر جانے والی رسموں کو بدعت کہتے ہیں۔ وہ عوام میں موجود عام مذہبی رسموں کے سخت خلاف ہیں۔ یورپ میں عیسائی اصلاح پسندوں کے برعکس عبدالوہاب ان مذہبی رسموں کو غلط سمجھتے تھے جو عام مسلمانوں میں رواج پا گئی ہیں۔ ان کی اصلاحی تحریک نے بیشتر مسلمانوں کو اسلام کے اصل پیغام کی طرف راغب کیا۔ یہ اصل پیغام ہے مساوات اور عدل سے پیدا ہونے والی وحدت اور اخلاقیات۔ ان کے نزدیک اللہ اور انسان کے درمیان کوئی واسطہ اور وسیلہ نہیں ہے۔ یہ تصور مغرب کی لبرل روایات کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جہاں شہری حقوق اور نمائندہ جمہوری اقتدار اس عقیدے سے جنم لیتی ہیں کہ ہر انسان خدا کی نظر میں برابر کا درجہ رکھتا

ہے اور بادشاہ اور پادری کی طاقت بھی کسی کا درجہ کم نہیں کرسکتی۔ یورپ کی تاریخ میں اس نقطۂ نظر کو پیورٹن کہا جاتا ہے۔

سعودی عرب کا مسلک تیرھویں صدی کے سیاسی مفکر ابنِ تیمیہ کے افکار پر مبنی ہے۔ ابن تیمیہ کے زمانے میں اسلامی دنیا زبردست بحران سے گزر رہی تھی۔ صلیبی جنگوں کے بعد منگولوں نے مسلم ملکوں میں تباہی مچا رکھی تھی اس وقت مسلمانوں کو حوصلہ دینے اور انہیں متحد رکھنے کے لیے ابن تیمیہ کے افکار سامنے آئے۔ ابن تیمیہ مسلمانوں کے مسلکی اختلافات اور باہمی تفرقے کو ان کی سب سے بڑی کمزوری مانتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اسلام کی تشریح و تعبیر میں اتفاق و اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ابن تیمیہ کا نظریہ یہ ہے کہ قرآن اور سنت میں ہر چیز موجود ہے۔ اسلام میں مذہبی موشگافیوں اور فلسفیانہ بحثوں کی گنجائش بھی نہیں ہے۔ قرآن کی لفظی اور لغوی تفسیر ہی کی جانی چاہیے۔ اگر قرآن کہتا ہے کہ اللہ عرش پر موجود ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ عرش پر بیٹھا ہے۔ عرش و کرسی کی ماہیت اور مقصد کے بارے میں کوئی بحث نہیں ہونی چاہیے۔ استعاراتی یا علاماتی طور پر تشریح اور تفسیر نہیں کی جاسکتی۔

میں نے وہابیت کے بارے میں مدینہ یونیورسٹی کے طلبہ سے بہت کچھ سیکھا۔ حج کے زمانے میں ہم اپنے کام میں مدد لینے کے لیے سینکڑوں طلبہ کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ تو سعودی ہوتے تھے مگر زیادہ تر وہ دوسرے مسلمان ملکوں کے ہوتے تھے۔ وہ سب سرکاری وظیفے پر پڑھ رہے ہوتے اور جانتے تھے کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد انہیں بہت کم تنخواہ پر ملازمت ملے گی۔ ان سب کو داعی یا مبلغ بنانے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ان کا کام یہ ہوتا کہ وہ ایشیا، افریقہ حتیٰ کہ یورپ کے ملکوں میں بھی جاتے اور وہاں اسلامی مرکز، مسجدیں اور مدرسے چلاتے اور تبلیغ کرتے۔ وہ پڑھتے کیا تھے (یا کیا پڑھتے ہیں؟) اور وہ کیا تبلیغ کریں گے؟ ان داعیوں کے بیان سے میں نے اندازہ لگایا کہ ان کے لیے صرف ایک ہی زمانہ ہے۔ اور وہ ہے زمانۂ حال۔ ان کے نزدیک کوئی حقیقی ماضی نہیں ہے۔ اور کسی متبادل مستقبل کا تصور بھی کوئی نہیں ہے۔ ان کا دائمی زمانۂ حال ماضی کے ایک مختصر سے خاص دور کے سائے میں زندہ ہے۔ یہ دور ہے اسلام کے اوائل میں آنحضرتؐ کا دور۔ اسلامی تاریخ کا درخشندہ ماضی اپنی تمام عظمتوں کے ساتھ ان کے یہاں مفقود ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے وہ اس تاریخ کو قبول ہی نہیں کرتے۔ وہ اسے تحریف سمجھتے ہیں۔ اسی لیے یہ دیکھ کر کوئی

نہیں ہوتی کہ مکے کے متبرک مقامات اور تہذیبی ورثے کے ساتھ سعودیوں کا کوئی جذباتی

حیرت نہیں ہوتی کہ

لگاؤ نہیں ہے۔

مدینہ یونیورسٹی کے طلبہ انتہائی شدت کے ساتھ اپنی مربی سعودی حکومت اور اپنے مسلک کے وفادار تھے۔ انہیں جس وہابیت کی تعلیم دی جاتی تھی اس کا مطلب تھا سعودی شاہی خاندان کے ساتھ وفاداری۔ صرف اتنا ہوا تھا کہ قبائلی وفاداری کی جگہ اب اسلام نے لے لی تھی۔ اس دائرہ سے جو بھی باہر تھا وہ شاہی خاندان کا دشمن اور اس طرح کافر قرار دیا جاسکتا تھا۔ ان میں وہ مسلمان بھی شامل تھے جو وہابی مسلک کو نہیں مانتے۔ اس فہرست میں شیعہ، صوفی اور وہ سنی بھی شامل ہیں جو دوسرے مسالک سے تعلق رکھتے ہیں۔ داعیوں اور سعودی معاشرہ کے عام لوگوں کے نزدیک راسخ العقیدہ مسلمانوں اور بدعتی مسلمانوں کے درمیان ایک واضح حد موجود ہے۔ یہ دوست اور دشمن کا فرق ہے۔ یہ طلبہ اکثر کہا کرتے تھے کہ کافروں کے ساتھ کسی قسم کا لین دین بھی کفر ہے۔ انہیں دوست بنانا تو دور کی بات ہے ان کی ملازمت کرنا، ان سے مشورہ لینا یا ان سے کسی قسم کا مالی فائدہ اٹھانا بھی ناجائز ہے۔

سعودی عرب میں غیر ملکی باشندوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے۔ ان کے کام اور ان کے عہدے کے حساب سے انہیں سعودی باشندوں سے الگ رکھا جاتا ہے۔ عورتوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہاں تمام عورتیں الگ تھلگ کر دی گئی ہیں بلکہ ہر موقع اور ہر مقام پر عورتوں کی الگ حیثیت نمایاں نظر آتی ہے۔ تمام مرد دھوبی کے دھلے سفید جھک جلابیہ پہنتے ہیں۔ شدید گرم علاقوں میں سفید رنگ ہی قدرتی رنگ ہے۔ یہ رنگ دھوپ اور گرمی جذب نہیں کرتا۔ لیکن قانون کی رو سے ہر عورت کے لیے سر سے پیر تک سیاہ عبایہ میں ملبوس ہونا ضروری ہے۔ کالا رنگ دھوپ اور گرمی خوب جذب کرتا ہے۔ عورتیں ننجا پہلوانوں کی طرح کالا عبایہ اوڑھتی ہیں اور سر پر اسلامی حجاب کی جگہ ایسا نقاب پہنتی ہیں جس میں صرف ایک پتلی سی جھری ہوتی ہے۔ اس جھری میں سے ہی وہ باہر کی دنیا دیکھ سکتی ہیں۔ یہ پابندی صرف ایک جگہ نظر نہیں آتی اور وہ جگہ ہے مسجد الحرام جہاں اسلام کا روایتی لباس اور حجاب دکھائی دیتا ہے۔

شروع میں تو میں نے ان طلبہ کی باتوں پر یقین نہیں کیا اور سمجھا کہ یہ محض شدت پسند طلبہ کی اپنی باتیں ہیں۔ مجھے سعودی معاشرے کے بارے میں اپنے مشاہدے پر بھی شبہ ہی تھا۔

چونکہ میری پرورش برطانیہ میں ہوئی تھی اس لیے میں سمجھتا تھا کہ میں اس معاشرے کو تعصب کی آنکھ سے دیکھ رہا ہوں۔ کیونکہ میں نے دیکھا تھا کہ انجوی اور نصیف انتہائی نفیس، انسان دوست اور مہذب انسان تھے۔ انہیں دیکھ کر تو کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ انتہا پسندی بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے۔ اپنے رہنے سہنے کے انداز اور میل جول میں نصیف نہایت نستعلیق انسان تھے۔ ان کے اردگرد پورا معاشرہ عدم رواداری کا مثالی نمونہ تھا لیکن وہ تہذیب و شائستگی، رواداری اور بھل منساہٹ کا جیتا جاگتا مجسمہ تھے۔ اسی لیے سب ان کی عزت کرتے تھے۔ پھر مجھے اندازہ ہوا کہ نجدیوں اور حجازیوں میں یہی فرق ہے۔ شاہی خاندان نجد سے تعلق رکھتا ہے۔ نجد سعودی سلطنت کا شمالی علاقہ ہے۔ حجاز میں مکہ اور جدہ واقع ہیں۔ حجاز کا مطلب ہے وہ باڑھ جو دو چیزوں کو الگ کرتی ہے۔ حجاز مردہ بنیاد پرستی اور قرآن کی طرف زندگی افروز رویّے کے درمیان واضح تفریق کرتا ہے۔

سعودی عرب کے بانی شاہ عبدالعزیز جب فاتح کی حیثیت سے حجاز میں داخل ہوئے تو وہاں کے اکثر خاندان ان کا خیرمقدم کرنے گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ صرف نصیف خاندان ہی ایسا تھا جو باہر نہیں آیا تھا۔ اس خاندان کو اپنے تہذیبی ورثے پر ناز تھا۔ اس خاندان کے بزرگ محمد نصیف جو ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے تھے اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم مانے جاتے تھے اور ان کے مکان میں جو بڑے بازار کے وسط میں واقع تھا، نہایت شاندار لائبریری تھی۔ اس لائبریری میں ہزاروں کی تعداد میں کتابیں، قدیم مخطوطے اور ۱۹۲۴ء کے بعد کے اخبارات موجود تھے۔ ہندوستان۔ ملائیشیا، انڈونیشیا، ایران، سوڈان، مصر، مراکش، شام اور لبنان کے علماء و فضلاء سب ان کے پاس آیا کرتے تھے۔ لیکن وہ نجدی بادشاہت کے حق میں نہیں تھے۔ اسی لیے اس خاندان کو اس کی قیمت ادا کرنا پڑی۔ وہ باقی معاشرے سے کٹ سا گیا۔ جدہ کے باقی مکان تو مکہ کی طرح مغربی فن تعمیر کی نقل بن گئے لیکن نصیف خاندان کا مکان ابھی تک اپنی روایتی وضع قطع اور شان و شوکت کے ساتھ اسی طرح کھڑا ہے۔ اس کے لیے اس خاندان کو زبردست جنگ لڑنا پڑی ہے۔ گرمیوں میں جب جدہ کا درجہ حرات چالیس ڈگری سیلسیس تک پہنچ جاتا ہے تو پورے شہر میں یہی ایک مکان ہے جو ٹھنڈا رہتا ہے۔ جب بجلی چلی جاتی تھی اور ایئرکنڈیشنرز بند ہو جاتے تھے اور ان دنوں اکثر ایسا ہوتا تھا، تو میں اس گھر کے سامنے بہت بڑے پیڑ کے سائے میں جا کر بیٹھ جاتا تھا۔ شیشہ (حقہ) پینے کے لیے یہ بہترین

جگہ تھی۔

سعودی وہابیت کا اصل مزہ میں نومبر ۱۹۷۹ء میں چکھا۔ اس مہینے چند جوشیلے لوگوں نے مسجد الحرام پر قبضہ کرلیا تھا۔ ابتدائی تاریخوں کے زرد چاند کے سائے میں اور کعبے کا طواف کرنے والے ہزاروں عقیدت مندوں کی موجودگی میں بدوؤں کے ایک گروہ نے اپنے عبایہ سے اچانک سب مشین گن، ریوالور اور بندوقیں نکالیں اور ہوا میں گولیاں چلانا شروع کردیں۔ انہوں نے طواف کرنے والوں کو باہر نکالا اور کعبے کے تمام دروازے اندر سے بند کر لیے۔ ان کے سینتیس سالہ لیڈر محمد عبداللہ القحطانی نے امام مہدی ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس گروہ میں اکثریت کا تعلق عتیبہ قبیلے سے تھا جس نے ۱۹۰۲ء میں جزیرہ نما عرب پر شاہ عبدالعزیز کے قبضے میں ان کی مدد کی تھی۔ اس کے علاوہ چند یورپی اور امریکی نومسلم بھی ان میں شامل تھے۔ ان کا تعلق المشترین فرقے سے تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جنت پانے کے لیے ہر مسلمان کو تن من دھن سے مذہب کی طرف راغب ہوجانا چاہیے۔ ان کا الزام تھا کہ سعودی حکومت عیسائیوں کے ساتھ تعاون کر رہی ہے، شیعہ الحاد کی حمایت کر رہی ہے، اسلام کی ایک سے زیادہ تشریح کی اجازت دے کر تفرقہ پیدا کر رہی ہے، ٹیلی وژن اور فلم کی اجازت دے رہی ہے اور اس نے دولت کو متبرک بنا دیا ہے۔ اس وقت مکہ ساری دنیا سے کٹ گیا تھا اور کعبہ کو فوج اور نیشنل گارڈ نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ حالانکہ نیشنل گارڈ کا اصل کام شاہی خاندان کی حفاظت کرنا ہے۔ لیکن ان باغیوں کو کعبے سے نکالنے سے پہلے ضروری تھا کہ انہیں موت کی سزا سنائی جاتی۔ یہ فریضہ سلطنت کے مفتی شیخ عبدالعزیز بن باز کو ادا کرنا پڑا۔

بن باز نابینا تھے۔ میں انہیں اکثر کعبے کا طواف کرتے دیکھا کرتا تھا۔ اس کا ایک ہی منظر ہوتا۔ کوئی طالب علم ان کا دایاں کاندھا تھامے انہیں طواف کراتا ہوتا اور ان کے عقیدت مندوں کا ہجوم ان کے دائیں ہاتھ کو بوسہ دینے کی کوشش کر رہا ہوتا۔ بن باز انہیں اپنا ہاتھ تھامنے کی اجازت تو دے دیتے مگر جونہی کوئی اسے بوسہ دینے کے لیے اپنے ہونٹ قریب لاتا تو وہ اپنا ہاتھ کھینچ لیتے۔ سعودی ریاست کے خلاف باغیوں کے الزامات بن باز کو پڑھ کر سنائے گئے۔ انہیں باغیوں کے خیالات سے اتفاق تھا۔ انہوں نے کہا۔ حکومت کو کافروں سے تعلقات نہیں رکھنا چاہئیں، شیعہ فرقے کی ملحدانہ سرگرمیوں کی ہرگز اجازت نہیں ہونا چاہیے۔ اسلام میں ہر قسم کی تصویر حرام ہے۔ اس میں ٹیلی وژن اور فلم کی تصویریں بھی شامل ہیں اور یقیناً دولت کو

متبرک درجہ نہیں ملنا چاہیے۔ یہ تو وہ مانتے تھے لیکن جس چیز سے بن باز کو اختلاف تھا وہ یہ تھی کہ یہ کام سعودی عرب میں بھی ہوتے ہیں۔ ان کا بیان تھا کہ ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔ چنانچہ مسجد الحرام میں پانی بھر دیا گیا اور تمام باغی ڈوب گئے۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ باغی منافق اور غیر دیانت دار سعودی حکومت کے مقابلے میں کم سے کم اپنے عقیدے سے پوری طرح وابستہ تو تھے اور وہی وہابیت کے اصلی نمائندے بھی تھے۔

مختلف ادوار میں اور دنیا کے وسیع علاقے میں اسلامی تاریخ کی پیچیدگی اور تنوع سے انکار کر کے اور اسلام کی مختلف اور کثیرالجہات تشریح کو رد کر کے وہابیت نے اسلام کو اس کی تہذیبی اور اخلاقی بنیاد سے محروم کر دیا ہے اور اسے اوامر و نواہی کے خشک ریگستان میں قید کر دیا ہے۔ اس بات پر اصرار کرنا کہ قرآن اور سنت کی لفظی اور لغوی تشریح کے سوا کوئی اور تشریح کرنا کفر ہے اور اس کے خلاف حکومت اور معاشرہ کی طاقت استعمال کرنا مطلق العنانی اور آمریت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

دو بجے کے قریب جب دفاتر بند ہونے کا وقت تھا، جوازہ کی کھڑکی کھلی۔ کھڑکی میں سے ایک ہاتھ نکلا اور اس نے فائل ہوا میں اچھال دی۔ ایک آدمی جو بڑے صبر کے ساتھ سائے میں بیٹھا انتظار کر رہا تھا ادھر لپکا اور فائل پکڑ لی۔ پھر اسے کھول کر دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس کے چہرے پر کامیابی کی مسکراہٹ تھی۔ چند لمحے بعد وہ ہاتھ پھر نکلا اور ایک اور فائل باہر آ گئی۔ ایک اور آدمی اٹھا اور اس نے وہ فائل ہوا میں ہی پکڑ لی۔ یہ تماشہ کئی منٹ اسی طرح جاری رہا۔ آخر وہ ہاتھ باہر نکلا تو شیخ عبداللہ نے، جو اکڑوں بیٹھا تھا، چھلانگ لگائی اور اسے نیچے گرنے سے پہلے ہی پکڑ لیا۔

اس نے فائل کو کھولا اور دیکھنا شروع کیا۔ میں بھی پریشانی کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا

''ویزا مل گیا؟''

''ابھی نہیں۔'' شیخ عبداللہ نے جواب دیا۔ ''تمہیں ویزا تو نہیں ملا۔ مگر ڈاکٹر نصیف کے خط کی عزت افزائی ہو گئی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔ مجھے ایسی صورت حال سے کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ لیکن میں اتنا

ضرور جانتا ہوں کہ تم کل اس ملک سے باہر جاسکتے ہو۔''

''مجھے تو یہاں سے جانا ہے باقی جو ہوتا ہے ہوتا رہے۔'' میں نے کہا۔

میں نے شیخ عبداللہ سے فائل لے لی۔ میرے پاسپورٹ کے ساتھ ایک سرکاری مراسلہ سا لگا ہوا تھا۔ شیخ عبداللہ نے اس مراسلے کی طرف اشارہ کیا اور کہا ''میرے خیال میں یہ ایمرجنسی ویزا ہے۔ تم مجھے پڑھ کر سناؤ۔''

''تم پڑھو۔'' میں نے وہ مراسلہ اسے دے دیا ''میری عربی اتنی اچھی نہیں ہے۔''

''میری بیوی بھی مجھ سے یہی کہتی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے وہ مراسلہ پھر مجھے دے دیا۔

اب مجھے عجیب سا خیال آیا۔ ''تمام فائلیں ایک ہی رنگ کی ہوتی ہیں۔ کھڑکی سے جب کوئی فائل باہر پھینکی جاتی ہے تو یہ بالکل نہیں بتایا جاتا کہ وہ کس کی فائل ہے، تو چھلانگ لگا کر فائل پکڑنے والے آدمی کو یہ کیسے معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ فائل اسی کی ہے؟''

''یونیورسٹی کے پاسپورٹ سیکشن کے انچارج تم ہو یا میں؟'' شیخ عبداللہ میرے سوال سے ناراض ہوگیا تھا۔ ''میں تمہیں ہر بات نہیں بتا سکتا۔ تم یہ مراسلہ لے کر ایرپورٹ جاؤ۔ وہ تمہیں ملک سے باہر جانے کی اجازت دے دیں گے۔''

''خلاص۔'' اس نے اپنے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا ''خلاص'' اس نے پھر دہرایا۔

میرے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی اس نے اپنی پک اپ میں چھلانگ لگائی اور روانہ ہوگیا۔

دوسرے دن رمضان کا پہلا روزہ تھا۔ اس مہینے میں اس ملک کی زندگی بالکل ہی نیا رخ اختیار کرلیتی ہے۔ سارا سعودی عرب رات بھر جاگتا ہے۔ سویرے سویرے جب سحر کی توپ داغی جاتی ہے تو پورا ملک سونے چلا جاتا ہے۔ اس طرح کی بارہ توپیں جدہ میں داغی جاتی ہیں۔ سڑکیں اور گلیاں ویران ہوجاتی ہیں، دفاتر اور دکانیں بند ہوجاتی ہیں۔ صرف دس سے ایک بجے تک چند گھنٹے کے لیے کھلتی ہیں اور پھر بند ہوجاتی ہیں۔ سورج غروب ہونے سے پہلے زندگی کے آثار پھر نمودار ہونا شروع ہوتے ہیں۔ افطار کی توپ داغنے کے ساتھ ہی چہل پہل دوبارہ شروع ہوجاتی ہے۔ سارا آسمان روشنیوں سے جگمگا اٹھتا ہے اور سڑکیں اور گلیاں موٹر کاروں اور انسانوں سے بھر جاتی ہیں۔ وہ سب دوسرے دن کے لیے سامان خریدنے باہر نکل پڑتے ہیں۔ رات کو دس بجے کے قریب تمام دفتر کھل جاتے ہیں اور دو بجے تک کھلے رہتے ہیں۔ بعض

ریستوراں اور تجارتی مراکز صبح صادق تک کاروبار کرتے رہتے ہیں۔ حیرت تو اس بات پر ہوئی ہے کہ سعودی باشندے کتنی جلدی رات کو جاگنے اور دن بھر سونے کی عادت ڈال لیتے ہیں۔

مکہ کے محاصرے کے بعد میں نے اسلام میں دائمی اور عارضی قدروں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ انہی دنوں میں نے ''مسلم تہذیب کا مستقبل'' مقالہ لکھنا شروع کیا تھا۔ یہ میری جانب سے یہ جاننے کی کوشش تھی کہ اسلامی معاشرہ کا مستقبل کیا ہوگا اور کیا ہونا چاہیے۔ میں نے دلیل دی کہ زمانہء حال ہمیشہ نہیں رہتا۔ اسلام کو ہر زمانے، ہر معاشرے اور ہر قسم کے حالات کے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا چاہیے۔ جو چیز تبدیل ہوتی ہے وہ تسلسل کے بارے میں ہمارا شعور ہے اور جوں جوں ہمارا شعور پختہ ہوتا ہے ایک خاص دور کا اسلام دوسرے دور کے اسلام کے مماثل نظر نہیں آتا، سوائے عبادات کے۔ میں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہابیت نے اسلام میں دو قسم کی مابعد الطبیعیاتی خرابیاں پیدا کی ہیں۔ پہلی یہ کہ قرآن اور سیرت النبی کی ایک سے زیادہ تشریح اور تعبیر پر پابندی لگا دی۔ اور اس طرح عام مسلمانوں کو اپنے طور پر نتائج اخذ کرنے کی اجازت سے محروم کر دیا۔ انسان آسمانی کتاب سے اپنا رشتہ اس کی تشریح اور تعبیر کے حوالے سے ہی رکھ سکتا ہے۔ اس کتاب کے متن کو نئے سرے سے سمجھنے اور نئے زمانے کے حالات کے مطابق اس کی تشریح کا رشتہ قائم رکھے بغیر مسلم معاشرے ہوا میں معلق ہو کر ہی رہ جائیں گے۔ اگر ہر بات پہلے سے طے شدہ ہے تو پھر کوئی بھی نئی چیز پیدا ہونا محال ہے۔ تمام عقل و شعور اور انسانی فہم غیر متعلق اور بے کار محض ہو جائیں گے کیونکہ پہلے کبھی چند باریش مردہ انسانوں نے جو کچھ کہہ دیا ہے اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔

دوسرے، وہابیت نے یہ تصور پیش کر کے کہ صحابہء کرام کے ساتھ ہی تمام اخلاقی اصول و ضوابط اپنی معراج کو پہنچ چکے ہیں اس اصول کی نفی کر دی ہے کہ انسانی فکر اور نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کی انسانی صلاحیت ارتقا پذیر رہتی ہے۔ بلکہ اس نے اسلامی تہذیب کو مسلسل زوال کا شکار کر دیا ہے۔ میں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ آج اور مستقبل میں بھی افراد اور معاشروں کے لیے نہ صرف یہ ممکن ہے بلکہ ضروری بھی ہے کہ اسلامی اقدار کو سمجھنے اور انہیں بروئے کار لانے کے لیے ان معیاروں سے بھی بلند ہو جائیں جو صحابہء کرام اور ان کے معاشرے نے قائم کیے تھے۔ میں نے تو یہ بھی لکھا کہ ہمیں ایسی اقدار قائم کرنا چاہئیں جو واضح طور پر صحابہء کرام کی وضع کردہ اقدار سے ممیز ہوں۔

وہابی نقطۂ نظر سے یہ کافرانہ خیالات ہیں اور میں نے انہیں اپنے دل میں ہی رکھا۔ لیکن جب مقالہ مکمل ہوگیا تو میں نے اس پر نظرثانی کرنے میں پوری رات لگادی۔ میں نے اس کا ایک فرضی سا عنوان رکھ کر اسے حج کے بارے میں دوسرے مضامین کے اندر چھپا کر رکھ دیا کہ ایئر پورٹ پر ان کی چیکنگ ہوگی۔ ایک چھوٹا سوٹ کیس جس میں کتابوں کے وہ قدیم نسخے تھے جو میں کسی نہ کسی طرح نکال لایا تھا، میں پہلے ہی بند کر چکا تھا۔ ایک دوست میرا فرنیچر، اسٹیریو اور وہ ہیمک (کپڑے یا کینوس کا لیٹنے والا جھولا) اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ ہوگیا تھا۔ وہ ہیمک میں نے اپنے کمرے میں لٹکا لیا تھا۔ اور میں اس پر لیٹ کر کبھی قرآن اور کبھی مغربی موسیقی کے کیسٹ سنا کرتا تھا۔ یہ سارا سامان میں نے جدہ میں قیام کے دوران اکٹھا کیا تھا۔ میں نے اپنے مضمون کا مسوّدہ اور اپنے بچائے ہوئے پچاس ہزار پاؤنڈ سعودی ایئر لائن کے بیگ میں رکھے اور ہوائی اڈے روانہ ہوگیا۔

میں اس خیال سے سات بجے کے قریب ہوائی اڈے پہنچ گیا کہ گیارہ بجے جدہ سے جانے والی سعودی ائر لائن کی پرواز پکڑ لوں گا۔ نئے شاہ عبدالعزیز ہوائی اڈے کے مقابلے میں جو بیس کلومیٹر دور تھا جدہ کا پرانا ہوائی اڈہ کار میں شرفیہ سے چند منٹ کے فاصلے پر تھا اور میں شرفیہ میں رہتا تھا۔ جدید ایئر پورٹ کی خیمہ نما عمارتوں اور ٹیکنالوجی کی نئی سہولتوں کے باوجود پرانا اڈہ کسی صورت بھی اس سے کم تر نہیں تھا۔ میں وہاں سب سے پہلے پہنچ گیا۔ لیکن میری بکنگ نہیں تھی۔ اس لیے میں نے کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے فلسطینی کو اپنی دکھ بھری داستان سنانا شروع کردی۔ میری دادی کا انتقال ہوگیا ہے۔ میرے چچا بھی گزر گئے ہیں۔ پچاس سے زائد عمر کے میرے تمام رشتے دار اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ مگر اس شخص پر اس داستان کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

''اب آپ مجھ سے اور کس کس کو مروانا چاہتے ہیں؟''

اب وہ تھوڑا سا مسکرایا۔ ''اچھا ٹھیک ہے۔ یہ رمضان کا مہینہ ہے اس لیے میں تمہارا اعتبار کیے لیتا ہوں۔'' مسلمانوں پر رمضان کے مقدّس مہینے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے محبت اور اخوّت کے ساتھ پیش آنے لگتے ہیں اور سب ایک دوسرے کی ضرورت کا خیال رکھتے ہیں اور ان میں ضبط نفس کا جذبہ پیدا ہوجاتا ہے۔

''لیکن رمضان میں بھی ہمیں اپنا پیٹ تو بھرنا ہوتا ہے۔'' اس نے کہا۔ میں نے دیکھا وہ ڈیسک کے پیچھے اپنی شہادت کی انگلی انگوٹھے پر رگڑ رہا تھا۔ اس کا انداز کہہ رہا تھا ''فلوس۔'' میں

نے چپکے سے پچاس ریال اس کی طرف بڑھا دئے۔

"عام حالات میں تو تمہیں ویٹنگ لسٹ پر ہونا چاہیے تھا مگر چونکہ تمہاری داڑی کا۔۔۔"
وہ تھوڑا ٹھہرا اور پھر بولا "میں تمہیں سیٹ دینے کا خطرہ مول لیے لیتا ہوں۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنا پاسپورٹ اس کے حوالے کر دیا۔

اس نے پاسپورٹ کے ورق الٹنا شروع کیے "اس میں تو واپسی کا ویزا ہی نہیں ہے" وہ کچھ پریشان سا ہو گیا۔

"ویزا ہے۔" میں نے کہا۔ "میرے پاس ایمرجنسی ویزا ہے۔ پاسپورٹ میں ایک کاغذ رکھا ہے۔"

اس نے اس کاغذ کو غور سے دیکھا اور بولا "ایمرجنسی ویزے پر کوئی بھی اس ملک سے باہر نہیں گیا۔ مگر خیر، یہ رمضان کا مہینہ ہے۔" میں اس شخص کے الفاظ پر غور ہی کر رہا تھا کہ میں نے دیکھا پورٹر میرے سوٹ کیس پر غلط ٹیگ لگا رہا ہے۔

"لندن لندن۔ میں چیخا۔ روم نہیں لندن۔"

"چیخو مت، رمضان ہے۔" اور اس نے میرے سوٹ کیس پر غلط ٹیگ لگا دیا اور اسے کنوئیر بیلٹ پر رکھ دیا۔

"اپنا سامان بھول جاؤ اور اپنے ویزے کی فکر کرو۔" فلسطینی نے میرا پاسپورٹ اور بورڈنگ کارڈ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

پاسپورٹ کنٹرول پر دو افسر الگ الگ ڈیسک پر بیٹھے پاسپورٹ اور ایگزٹ کارڈ پر مہریں لگا رہے تھے۔ میں نے ایگزٹ کارڈ بھرا اور وہاں کھڑا ہو گیا۔ اب میں نے اپنا پاسپورٹ اور وہ کاغذ ایک افسر کے حوالے کیا جس میں میرے بلیک لسٹ نہ ہونے کی تصدیق کی گئی تھی۔
اس نے بڑے آرام سے اس کاغذ کا جائزہ لیا اور کافی وقفے کے بعد بولا "معاف کیجیے، مجھے ایگزٹ ویزا دینے کا اختیار نہیں ہے۔ آپ کو مدیر کے پاس جانا چاہیے۔"

"ان کا دفتر کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔
اس شخص نے یونہی ایک طرف اشارہ کر دیا۔ "ادھر۔"
میں وہاں سے نکلا اور ائیر پورٹ کے پاسپورٹ سیکشن پہنچا۔ تین آدمی اندر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے پاسپورٹ اور کلیرنس شیٹ میز پر رکھ دی۔ "جناب والا، میرے پاس

ایمرجنسی ایگزٹ ویزا ہے۔ مجھے ڈائریکٹر کے دستخط چاہئیں۔''
ایک افسر بڑی مشکل سے اٹھا۔ اس نے کلیرنس ویزا کا بغور جائزہ لیا۔ پھر وہ ایک میز کی طرف گیا جو ایک بہت ہی بڑے رجسٹر سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس نے رجسٹر کے ورق الٹے اور وہاں میرا نام دیکھنے کی کوشش کی۔ پھر دوبارہ چیکنگ کے بعد رجسٹر بند کر دیا۔ اس کے بعد اس کاغذ پر دستخط کیے اور ایک اور دفتر کی طرف اشارہ کر دیا۔

وہاں ایک بہت ہی چھوٹے قد کا آدمی ایک بہت ہی بڑی میز کے پیچھے بیٹھا تھا۔ میں نے اپنا کاغذ اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے کافی دیر اس کا مطالعہ کیا۔ پھر اس کے نیچے دستخط کر دیے۔ ''تمہیں فائنل کلیرنس، آمد کے دفتر میں امیگریشن آفس سے ملے گی۔''

''آمد کے دفتر میں؟'' میرا خون کھولنے لگا تھا۔ فلائٹ کا وقت ہو چلا تھا۔ ''آمد؟ مجھے ایگزٹ ویزا چاہیے آمد کا ویزا نہیں۔''

''چیخو مت، رمضان ہے۔ میں جانتا ہوں تمہیں کیا چاہیے۔ لیکن تمہیں قاعدے کے مطابق چلنا پڑے گا۔ خلاص۔'' اب ایک لفظ بھی بولے بغیر میں نے کاغذ اس کے ہاتھ سے لیا اور دوڑتا ہوا ڈیپارچر لاؤنج سے ٹرمینل ون کے باہر نکل گیا۔ میں بھاگتے ہوئے نائجیریا کے ایک حاجی سے بھی ٹکرایا جو سر پر ٹوکری رکھے جا رہا تھا۔ میں پرانی ایئر پورٹ روڈ پر بھاگا اور آمد پر پہنچ گیا۔

آمد والی لاؤنج پر ایک بدو سپاہی نے مجھے روک لیا۔ وہ مجھے زبردستی روک رہا تھا مگر میں نے اس سے پیچھا چھڑایا اور سب سے پہلے جو دفتر نظر آیا اس میں گھس گیا۔ وہاں ایک لمبی سی داڑھی والا آدمی ایک بڑی سی کرسی پر تنہا بیٹھا تھا۔ ''السلام علیکم'' میں نے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر اس کی داڑھی پکڑ لی اور اسے بوسے دینے لگا۔ میں نے اس کے دائیں جانب بوسہ دیا پھر بائیں جناب دیا، پھر نیچے اس کی گردن پر بوسہ دیا۔

وہ بزرگ افسر ایک دم گھبرا گیا۔ وہ پریشان بھی نظر آتا تھا اور خوش بھی۔

''میرے اخی، مجھے بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

میں نے ساری صورت حال بتائی۔

''فکر نہ کرو'' وہ بولا ''تمہارے کاغذ پر ابھی کئی اور دستخط ہوں گے۔ مگر میں تمہارے ساتھ چلوں گا اور دستخط کراؤں گا۔ بہر حال یہ رمضان کا پہلا دن ہے۔'' اپنے قواعد وضوابط پورے

کرنے کے بعد وہ مجھے ڈیپارچر لاؤنج لے گیا۔ ہم سعودی گراؤنڈ اسٹاف کے پاس پہنچ گئے۔

''فلائٹ SV172۔''

''جلدی کرو۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔'' کوچ میں بیٹھ جاؤ۔''

میں کوچ میں بیٹھ گیا۔ میں وہاں اکیلا ہی تھا۔ ڈرائیور نے دروازہ بند کیا اور جہاز کی طرف چل دیا۔ میں پریشان بیٹھا تھا۔ آدھے راستے میں کوچ رک گئی۔

''واپس چلو، واپس چلو۔'' کوئی چیخا۔

میں کھڑکی سے دیکھ رہا تھا کہ جہاز ابھی رن وے پر کھڑا ہے۔ ایک بہت ہی لمبی چوڑی کار سعودی پرچم لہراتی کوچ کے قریب سے گزر گئی۔ چند منٹ بعد شہزادے کی شکل والا ایک آدمی جہاز میں سوار ہو رہا تھا۔ ساتھ میں اس کے درباری تھے۔

''لو، تمہاری سیٹ تو گئی۔'' کوچ کے فلپینی ڈرائیور نے کہا۔'' ان دنوں کوئی بھی شہزادہ ملک کے اندر نہیں رہتا۔ یہ رمضان ہیں نا۔''

''ہاں، میں جانتا ہوں یہ رمضان ہیں۔''

میری آنکھوں کے سامنے میرا جہاز اڑا جا رہا تھا۔ میں نے اپنی انگلیوں سے فتح کا الٹا نشان بنایا اور آسمان کو دیکھنا شروع کر دیا۔

باب - ۸

آسمانی انقلاب

مجھے پورا یقین ہے کہ وہ میرے جہاز کا رولز رائس کا انجن نہیں تھا جو میری فلائیٹ لندن لایا بلکہ وہ میری جذباتی توانائی تھی جس نے مجھے رمضان کی دوسری تاریخ کو اپنی منزل پر پہنچایا۔ رات بھر میں جدہ کے ہوائی اڈے پر پاگلوں کی طرح گھوم گھوم کر اپنے بھڑ کتے جذبات کی آگ اپنے دماغ میں بھرتا رہا تھا اور یہ سوچتا رہا تھا کہ کس طرح میرے پر لگ جائیں اور میں یہاں سے اڑ جاؤں۔ پورا شہر بھی میرے جذبات کی عکاسی کر رہا تھا کیونکہ رمضان میں ہر آدمی اور تمام گلی کوچے جاگ رہے تھے۔ میں جتنا سوچتا اتنی ہی میرے اندر کی آگ اور بھی بھڑکتی۔ ہم مسلمان اپنی وراثت کے کھنڈر میں زندہ ہیں۔ ہم اس کی نزاکت اور نفاست کی دھجیاں بکھیرتے ہیں، ان اعلیٰ دماغوں کے کارنامے پس پشت ڈالتے ہیں جنہوں نے ایک وقت میں ہمارے اپنے توانا نظام کے اندر رہتے ہوئے ایجاد و اختراع کی سرگرمیاں جاری رکھیں۔

اب میں ہوائی اڈے واپس گیا تو کسی کو ہمت نہیں ہوئی کہ مجھے سیٹ نہ دیتا۔ لگتا تھا کہ میرا غصہ میرے چہرے پر نقش ہوگیا تھا۔ تمام قواعد وضوابط بالائے طاق رکھتے ہوئے مجھے فوراً پہلی فلائٹ پر سوار کرادیا گیا۔ اب سب ان شاء اللہ، برکہ اور ملیش بھول گئے۔ وہ تو چاہتے تھے کہ مجھے جلد سے جلد وہاں سے نکالیں تاکہ میرے غصہ کا بم کہیں اور جا کر پھٹے۔ چنانچہ میں اپنے آپ کو برا بھلا کہتا ہوا روانہ ہوگیا کہ ہم کیا تھے اور کیا ہوگئے ہیں۔ میں روانہ تو ہوگیا مگر سعودی عرب میرے اندر موجود رہا۔ دراصل معکوس جنت کوئی مقام تو نہیں ہے یہ تو ایک ذہنی کیفیت

ہے۔اس سے چھٹکارا پانے کا طریقہ یہ ہے کہ جنت تک پہنچنے کا کوئی اور راستہ تلاش کیا جائے۔ وجود کی کوئی اور حالت دریافت کی جائے۔

سعودی عرب سے واپسی کے بعد میرا عزم اور بھی پختہ ہوگیا کہ اصل اسلام کے احیا کے لیے اپنی کوششیں تیز کردوں۔اب تک ایک ادیب اور صحافی کی حیثیت سے میری تھوڑی بہت شہرت ہوچکی تھی۔ میری کتابوں کی اشاعت نے مسلم دانشور حلقوں تک میری رسائی ممکن بنا دی تھی۔ میں ان کانفرنسوں، مذاکروں اور مباحثوں میں برابر شرکت کر رہا تھا جو مسلمانوں کے مسائل پر منعقد کیے جاتے تھے۔ہم نے اپنی تمام توقعات ایران سے وابستہ کر رکھی تھیں۔ایران کے علاوہ ہم چاہتے تھے کہ اسلامی تہذیب کے احیاء کے لیے مسلم دانشوروں کی ایک فاؤنڈیشن قائم کی جائے جس کا عملی نمونہ ایران ہو اور ۱۹۷۰ء کی دہائی کے وسط تک برطانیہ، امریکہ، ہندوستان، پاکستان، ملائیشیا، انڈونیشیا اور مصر و ترکی کے مسلم دانشور نہایت سنجیدگی کے ساتھ اسی بنیاد پر سوچنے لگے تھے۔میں برطانیہ کے اس گروپ کا سرگرم رکن تھا جو مستقبل کی مسلم تہذیب کے خدوخال وضع کرنے کی خاطر ''اصول اور منصوبے'' تیار کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔اس کے رہبر کلیم صدیقی تھے جو سیاسی مفکر تھے۔میں اپنے کام کے سلسلے میں ان سے ہی رہنمائی حاصل کرتا تھا۔

میں ان سے ۱۹۷۲ء میں ملا۔ان دنوں وہ اخبار گارڈین کے لیے کام کر رہے تھے۔میں لندن اسلامی سنٹر کا صدر تھا۔اس سنٹر میں بیشتر طلبہ تھے یا پھر وہ نوجوان شامل تھے جو حال ہی میں تعلیم سے فارغ ہوئے تھے۔ہم نے کلیم صدیقی کو ''برطانیہ میں مسلمان نوجوانوں کا مستقبل'' کے موضوع پر تقریر کرنے کی دعوت دی تھی۔دوسرے سال انہیں بین الاقوامی اسلامی یوتھ کانفرنس میں شرکت کے لیے لیبیا بلایا گیا۔اس کانفرنس کا مقصد معمر قذافی کے اس فلسفہ کی ترویج تھا جسے وہ ''تیسری بین الاقوامی تھیوری'' کہتے تھے۔اس تھیوری کی بنیاد تین اصولوں پر تھی۔ مذہب،قوم پرستی اور سوشلزم۔وہ تین اصول جنہوں نئے تاریخ بنائی۔قذافی، جن کا بیان تھا کہ وہ اس تھیوری پر ۱۹۵۰ء سے کام کر رہے ہیں، کہتے تھے کہ اسلام کو قوم پرستی کی سائنسی اساس چاہیے۔اس کانفرنس کا مقصد اس تھیوری کی منظوری تھی۔کانفرنس میں اتفاق رائے پیدا ہوجانے کے بعد اس تھیوری کو دوسرے ملکوں تک بھی پہنچانا تھا۔لیکن کانفرنس نے بھاری اکثریت سے یہ تھیوری مسترد کردی۔اس اتفاق رائے نے صدیقی پر بہت اثر کیا۔وہ ان مسلم نوجوانوں کے

جذبے اور فکری جوش سے بہت متاثر ہوئے۔ نوجوانوں نے قذافی کی قوم پرست اور سوشلسٹ جنت کو رد کر دیا تھا۔ اسے رد کرتے ہوئے انہوں نے یہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کدھر جانا ہے اور یہ راستہ مغرب کا راستہ نہیں تھا۔ کلیم صدیقی نے اعلان کیا "تاریخ کے اس نازک موڑ پر مسلم دانشور مغرب کے خلاف اپنے موقف کا اعادہ کرتے ہیں۔"

اس کے فوراً بعد صدیقی پر دل کا دورہ پڑا۔ ان کا بیان ہے کہ آپریشن ٹیبل پر انہوں نے موت کا مزہ چکھا۔ اس سانحہ نے کلیم صدیقی کو بالکل ہی بدل دیا۔ اب وہ مارکس اور ٹراٹسکی کے خیالات سے منحرف ہو چکے تھے۔ انہوں نے گارڈین کو بھی چھوڑ دیا اور مسلم نوجوانوں کے لیے کام کرنے لگے۔ ان کے نزدیک میں بھی وہ "نوجوان" تھا جو ان کے مشن کے لیے کام آسکتا تھا۔

میں کلیم صدیقی کی تقریر، ان کے انداز بیان اور ان کے جوش و جذبہ سے بہت متاثر تھا۔ بلکہ میں ان سے اتنا مرعوب تھا کہ میں نے اپنے اٹھنے بیٹھنے اور اپنی بات چیت میں ان کی نقل کرنا شروع کر دی تھی۔ وہ اپنی بیوی کو بیگم کہتے تھے۔ میں بھی اپنی بیوی کو بیگم کہنے لگا۔ وہ صرف اپنے منھ سے ہی بات نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے ہاتھ اور بازو بھی باتیں کرتے تھے۔ میں ان کی حرکات وسکنات کی اتنی نقل کرتا تھا کہ مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ اب مجھے بھی دل کا دورہ پڑنے والا ہے۔

میرے علاوہ صدیقی صاحب کے نزدیک جو لوگ تھے ان میں fosis کے زمانے کے ایک تو میرے ساتھی غیاث الدین صدیقی تھے جنہوں نے شیفلڈ یونیورسٹی سے انجینئرنگ میں ڈاکٹریٹ کی تھی دوسرے اجمل احمد تھے جو ذہنی خلجان کی وجہ سے لندن یونیورسٹی سے پولیٹکل سائنس میں ڈاکٹریٹ مکمل نہیں کر سکے تھے۔ میں اور اجمل کلیم صاحب سے ملنے سلو جاتے تھے۔ کبھی کبھی غیاث الدین بھی ہمارے ساتھ ہوتے تھے۔ کلیم صاحب کی بیگم مزیدار بریانی، کوفتے اور دال پکاتی تھیں اور کھانے کے ساتھ مٹھاس بھی ہوتی تھی جس کے بغیر کھانا مکمل نہیں ہوتا تھا۔ مگر مصیبت یہ تھی دل کے دورے کے بعد کلیم صاحب خود چکنائی سے بھرے یہ کھانے نہیں کھا سکتے تھے۔ یہ مٹھاس تھی گاجر کا حلوہ۔ ہم مزے لے لے کر یہ حلوہ کھایا کرتے تھے اور بے چارے کلیم صاحب دال اور سادہ چاول پر ہی گزارا کرتے تھے۔

کھانے کے بعد باتیں شروع ہوتیں۔ کلیم صاحب کا پہلا سوال ہوتا تھا۔ "کیا کیا جائے؟"

یہ میرے لیے اشارہ ہوتا۔ "میرے خیال میں" میں جواب دیتا۔ "مسلمان معاشروں کی اصلاح ممکن نہیں ہے۔ وہ تو ہر قسم کی اصلاح سے باہر ہو چکے ہیں۔ اب ہمیں کوئی متبادل سماجی اور سیاسی نظام تلاش کرنا چاہیے جو موجودہ نظام سے بالکل ہی مختلف ہو۔ ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اسلام کے بارے میں ہمارا علم کوئی قابل عمل متبادل نظام تلاش کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے۔"

"ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے" ایک دن کلیم صاحب نے کہا "ہمارا علم دو قسم کا ہے۔ اسے ہم اطلاقی علم اور غیر اطلاقی علم کہہ سکتے ہیں۔ ہمارا اطلاقی علم مغربی سائنسی علوم سے تعلق رکھتا ہے جیسے سوشل، فزیکل اور ٹیکنالوجیکل علوم۔ یہ علوم ہم مغرب میں یا مغربی طرز پر قائم درس گاہوں میں حاصل کرتے ہیں۔ مغربی علوم ہماری سمجھ میں آتے ہیں کیونکہ جس قسم کے اقتصادی اور سماجی نظام میں ہم رہتے ہیں وہ مغربی تہذیب کی پیداوار ہے۔ مثال کے طور پر معاشیات کے جو اصول ہم پڑھتے ہیں وہ ہمارے روزمرہ کے تجربات کا حصہ ہیں اس لیے وہ ہمارے لیے قابل عمل ہیں۔" وہ تھوڑا ٹھہرے۔ کلیم صاحب باتیں کرتے ہوئے اپنی عینک سے کھیلتے رہتے تھے۔ کبھی ناک کی نوک پر رکھتے اور کبھی اسے اتار لیتے۔ پھر ہاتھ میں لے کر اسے ادھر ادھر کرنے لگتے۔ انہوں نے عینک ہاتھ میں پکڑی اور بولنا شروع کیا "مسلمان ہونے کی وجہ سے ہمیں اسلام کا علم بھی ہے۔ یہ ہمارا غیر اطلاقی علم ہے۔ اب یا تو اسلام کا علم ہماری زندگی میں غیر اطلاقی ہے یا پھر وہ شادی بیاہ، نماز روزہ اور پیدائش اور موت کی رسوم تک محدود ہے۔ اسلام کا اطلاقی اور عملی نظام کہیں بھی رائج نہیں ہے بلکہ حالیہ تاریخ میں کہیں بھی وہ نافذ نہیں رہا ہے۔ اسلام کا مثالی نظام اتنے زمانے پہلے آنحضرت ﷺ کے دور یا پھر عباسی دور میں قائم تھا کہ مغربی تعلیم و تہذیب میں ڈوبے ہوئے ہمارے دماغوں کے لیے یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ آج کے زمانے کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی مسائل اسلام کے اصولوں پر کیسے حل کیے جا سکتے ہیں۔"

"جی" اجمل صاحب بولے "ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی شناخت منوائیں اور اپنی شخصیت کو مغرب کے چنگل سے آزاد کرائیں۔"

"بالکل صحیح" کلیم صاحب نے کہا "یہ کام ہم اسلام کی بالادستی کے ذریعہ کر سکتے ہیں۔ ہم کہتے تو ہیں کہ اسلام اعلیٰ ترین مذہب ہے مگر یہ نہیں جانتے کہ وہ اعلیٰ ترین کیوں ہے۔ ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام ہمارے تمام مسائل حل کر سکتا ہے مگر یہ نہیں جانتے کہ کیسے۔ ہم اپنے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان طریقوں سے کرتے ہیں جو سرمایہ دارانہ اور جمہوری

نظام سے مماثل ہوتے ہیں۔ یا پھر سوشلسٹ اور مارکسٹ طریقوں کے مماثل۔ یا پھر ان دونوں کی ملی جلی شکل۔ پھر ہم اس شکل کو اسلامی بنانے لگتے ہیں اور اسے اسلام کہتے ہیں۔''

''اصل میں ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیے کہ ہم اسلام کے بارے میں اپنے علم کو عملی شکل کیسے دے سکتے ہیں۔'' میں نے نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی۔

''یہ کام ہم کیسے کریں؟ کلیم صاحب نے سوال کیا۔

''مستقبل کی مسلم تہذیب کا ایک جامع نقشہ تیار کر کے'' میں نے جواب دیا حالانکہ مجھے اس جواب کے نتائج پر پورا یقین نہیں تھا۔ ''جی ہاں، ہمیں یہ معلوم کرنے لیے بے شمار نظریاتی آلات کی ضرورت ہوگی کہ اب تک اسلامی احیاء کے جتنے بھی طریقے اختیار کیے گئے ہیں وہ ناکام کیوں ہوئے۔ ہمیں قومی ریاست کے دور سے بھی آگے کے زمانے کا خاکہ تیا کرنا ہوگا تاکہ مستقبل کی نئی حرکی اور توانائی سے بھرپور اسلامی تہذیب کا دور شروع ہوجائے۔''

''اس کا آغاز ہم کہاں سے کریں گے؟'' اجمل صاحب نے پوچھا۔

''ہمیں تعلیم کے متبادل شعبے تیار کرنا ہوں گے جیسے معاشیات، عمرانیات، وغیرہ کے متبادل ماڈل۔ متبادل سیاسی نظام اور سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے ٹھوس ماڈل۔'' میں نے کہا۔

''ہر تہذیب کو اپنی پولیٹکل سائنس کی ضرورت ہوتی ہے۔'' کلیم صاحب بولے ''لیکن ہم ایک ہزار سال سے زیادہ عرصے سے اس کے بغیر ہی گزارا کر رہے ہیں۔'' انہوں نے توقف کیا۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم کسی سیاسی نظام کے ڈھانچے سے باہر اسلام کا یا اپنا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ لیکن اب ہمیں احساس ہوا ہے کہ اسلام میں ریاست کا تصور جدید قومی ریاست کے تصور سے بالکل ہی مختلف ہے۔ ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم اپنی پولیٹکل سائنس پیدا کریں۔''

''لیکن ہم تنہا یہ کام کیسے کر سکتے ہیں؟'' اجمل صاحب پریشان تھے۔

''ہمیں ایسا کرنا بھی نہیں چاہیے'' کلیم صاحب بیچ میں بول پڑے۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور انتظار کیا کہ کلیم صاحب اس کی کیا وضاحت کرتے ہیں۔ ''ہمیں یہ پروجیکٹ شروع کرنے کے لیے ایک انسٹی ٹیوٹ بنانا چاہیے جس میں نوجوان دانشور شامل ہوں۔''

چنانچہ کلیم صاحب کے گھر میں ان کی بیگم کی بریانی اور گاجر کے حلوے کی طاقت کے ساتھ مسلم انسٹی ٹیوٹ برائے ریسرچ اور پلاننگ وجود میں آگیا۔ کلیم صاحب نے ہمارے بحث مباحثے اور بین الاقوامی اسلامی یوتھ کانفرنس کے تجربات کو ایک کتابچے کی شکل دے دی۔ ہم

نے کلیم صاحب کو اس کا ڈائریکٹر بنا دیا اور ان کا گھر ہمارا دفتر بن گیا۔ ہم نے اوپن پریس کے نام سے اپنا پبلشنگ ہاؤس بھی قائم کرلیا۔ اس کی طرف سے ہمارا منشور ''ایک نئے مستقبل کی جانب'' شائع ہوا۔ چند مہینے بعد ہم نے مسلم انسٹی ٹیوٹ کے پراسپکٹس کا خاکہ شائع کیا جس میں اس ادارے کے اغراض و مقاصد بیان کیے گئے تھے۔ یہ میں نے لکھے تھے اور ''تبدیلی کی حکمت عملی''، کلیم صاحب نے لکھی تھی۔

ہمارے خیالات تو بہت بلند تھے مگر ہمارے پاس پیسہ نہیں تھا۔ ہمارا پہلا منصوبہ تھا کہ آنحضرتؐ کی سیرت پر دو جلدوں میں کتاب چھاپی جائے۔ اس کا نام رکھا گیا تھا The Road to Madina اس کتاب میں حیاتِ طیبہ کے ساتھ اس نظام کے بارے میں بھی مفصل معلومات شامل کرنا تھیں جس پر پہلی مسلم برادری کی سیاسی ریاست کی بنیاد پڑی۔ جس طرح مکہ مسلمانوں کا روحانی قبلہ ہے اسی طرح مدینہ مثالی مسلم معاشرہ کا جیتا جاگتا نمونہ بنتا ہے۔ یہ شہر رسول اللہ کا شہر ہے۔ ہمیں حیرت ہوتی تھی کہ مسلمانوں نے یہ تو لکھا کہ اس زمانے میں عبادات کیسے کی جاتی تھیں مگر یہ کسی نے نہیں لکھا کہ ان مسلمانوں نے اپنے وقت کے حالات اور چیلنجوں کا مقابلہ کیسے کیا۔ اس علم کے بغیر ہم اصل سوال کرنے کے قابل بھی نہیں ہو سکتے۔ ہمارا ٹارگٹ کیا ہونا چاہیے؟ آج کے مسلم معاشروں کے مسائل حل کرنے کے لیے ہمیں کیا ذرائع اختیار کرنا چاہئیں؟ اور ان معاشروں کو اسلام کے قریب کیسے لانا چاہیے؟ ہمارا پروجیکٹ یہ تھا کہ مسلم ملکوں کا پورا سیاسی و سماجی ڈھانچہ تبدیل کرنے کے لیے ایک معقول اور قابل عمل پروگرام تیار کیا جائے۔

جب میں جدہ میں حج ریسرچ سنٹر کے لیے کام کرتا تھا تو ان دنوں بھی مسلم انسٹی ٹیوٹ کا کام کرتا رہتا تھا۔ میں فارغ اوقات میں اس کے لیے فنڈ اکٹھے کرتا تھا تا کہ مسلم معاشروں کا مستقبل محفوظ ہو جائے۔ کلیم صدیقی میرے پاس آتے تھے اور ہم دونوں مل کر انسٹی ٹیوٹ کی مدد کرنے والے تلاش کرتے تھے۔ ہم نے شیخ صلاح جم جوم کو اپنا دوست بنا لیا تھا۔ وہ بہت مذہبی اور سادہ سے انسان تھے۔ وہ فرانس سے پیجو کاریں درآمد کرتے تھے۔ ہم مکہ روڈ پر ان کے شوروم اکثر جایا کرتے تھے۔ آخر ہم نے شیخ کو آمادہ کرلیا کہ وہ اعلیٰ تعلیم کی وزارت کو ہماری کتاب کی اشاعت کی رقم دینے پر رضامند کرلیں۔ ہم نے پانچ سال تک تحقیق و تفتیش کرنے کے لیے پانچ لاکھ پاؤنڈ مانگے۔ یہ ریسرچ کلیم صدیقی کو کرنا تھی۔ وزارت تین قسطوں میں تین لاکھ پاؤنڈ دینے پر راضی ہوئی شرط یہ لگائی کہ یہ منصوبہ تین سال میں مکمل ہونا چاہیے۔

میں جب سعودی عرب سے واپس آیا تو اس وقت تک کلیم صدیقی نے اپنا کام شروع نہیں کیا تھا۔ وہ ہر سال کوئی نہ کوئی عذر پیش کر دیتے۔ مگر ہر سال شیخ جم جوم چیک بھجوا دیتے۔ انسٹی ٹیوٹ نے اس رقم سے کافی جائداد خرید لی اور دفتر کے لیے لندن میں یوسٹن اسٹیشن کے قریب ایک عمارت بھی قسطوں پر حاصل کر لی۔ ظاہر ہے میں اس سے پریشان ہوا۔ میں نے کہا کہ میں کام شروع کر دیتا ہوں تاکہ ہم کچھ کام دکھا تو سکیں اور سعودی حکومت کی اعلیٰ تعلیم کی وزارت کو تھوڑی سی تسلی دے سکیں جو اپنی رقم واپس مانگ رہی تھی اور قانونی کاروائی کرنے کی دھمکیاں دے رہی تھی۔ صدیقی نے میری بات نہیں مانی۔ ان کا دماغ اب کسی اور ہی طرف تھا۔ وہ ایران میں ہونے والی تبدیلیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

۱۹۷۰ء کی دہائی کے آخر تک رضا شاہ پہلوی کے خلاف مظاہرے اور جلسے جلوس دور دور تک پھیلتے جا رہے تھے۔ مظاہرین صرف سیاسی جبر کے خلاف ہی نہیں تھے بلکہ وہ بڑھتے ہوئے کرپشن، معاشی عدم مساوات اور امریکی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے اثرات کے خلاف بھی احتجاج کر رہے تھے۔ ان مظاہروں کی قیادت طلبہ کر رہے تھے لیکن انہیں علماء اور نہایت منظم شہری تاجروں کی تنظیموں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ شاہ کی جدت پسندی کی پالیسی، جس کی بنیاد جاپان اور کوریا کے سرمایہ دارانہ نظام پر تھی، ایک محدود طبقے کو فائدہ پہنچا رہی تھی۔ یا پھر اس سے امریکی کمپنیاں فائدہ اٹھا رہی تھیں۔ شاہ کا یہ نظام مغرب کی سامراجی پالیسیوں سے مختلف نہیں تھا۔ ایران کا کاروباری طبقہ مظاہرین کی مالی امداد کر رہا تھا۔

ہر مظاہرہ کے بعد شاہ کی طرف سے مار دھاڑ اور تشدد کی کارروائیاں تیز ہو جاتیں۔ اس کی خفیہ پولیس ساواک ان لوگوں کو سخت سزائیں دینے کے معاملے میں بہت بدنام تھی۔ شاہ کے خلاف مظاہروں کی ابتدا ۹ جنوری ۱۹۷۸ء کو قم سے ہوئی تھی۔ طلبہ امریکی صدر جمی کارٹر کے دورے کے خلاف تھے اور مطالبہ کر رہے تھے کہ آیت اللہ خمینی کو عراق سے ایران واپس آنے کی اجازت دی جائے۔ آیت اللہ عراق میں جلا وطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ پولیس نے گولی چلائی اور ستر طلبہ ہلاک ہو گئے۔ مجھے یاد ہے اس موقع پر کلیم صدیقی نے کہا تھا۔ ''اب ہم ایسے مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں سے واپسی ممکن نہیں۔'' چالیس دن بعد پورے ایران میں ان شہیدوں کا چہلم منایا گیا۔ اور ہر شہر میں مظاہرے ہوئے۔ اس دن پولیس نے تبریز میں ایک سو سے زیادہ آدمی مار دیے۔ دو ہفتے سے بھی کم عرصے میں پولیس نے یزد میں بھی ایک سو سے زیادہ

مظاہرین کو ہلاک کر دیا۔ اب یہ ایک طرح سے معمول بن گیا۔ 8 ستمبر کو تہران میں فوج نے کئی سو مظاہرین کو ہلاک کر دیا اور یہ دن سیاہ جمعہ کہلایا۔ دوسرے دن شاہ نے تمام مخالف رہنماؤں کو گرفتار کر لیا اور مارشل لا لگا دیا۔

اب انقلابیوں نے اپنی حکمت عملی تبدیل کر لی اور ہڑتالیں شروع کر دیں۔ اکتوبر کے مہینے میں تمام بازاروں اور تیل کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی ہڑتال نے ملک کی معیشت کو بری طرح متاثر کیا۔ اس کے جواب میں شاہ نے عراق کو مجبور کیا کہ آیت اللہ کو ملک سے نکال دے۔ آیت اللہ وہاں سے پیرس چلے گئے۔ شاہ کا یہ اقدام اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا۔ اب آیت اللہ ایک بین الاقوامی شخصیت بن گئے تھے اور انہوں نے انقلاب کی کمان خود سنبھال لی تھی۔ اب شاہ نے مصالحت کی کوشش کی اور آیت اللہ کو دعوت دی کہ وہ ایران واپس آجائیں۔ مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ شاہ کی حکومت غیر قانونی ہے اور جب تک شاہ کی حکومت ہے وہ ایران کی سرزمین پر قدم نہیں رکھیں گے۔

۲ دسمبر کو محرم کا مہینہ شروع ہو رہا تھا۔ اس مہینے شیعہ آنحضرتؐ کے نواسے امام حسین اور ان کے خاندان کی شہادت کا سوگ مناتے ہیں۔ سن ۶۷۹ کے یہ وہ دن ہیں جب شیعہ ایک الگ فرقے کے طور پر سامنے آئے۔ اس مہینے شاہ کے خلاف مظاہرے اپنی معراج کو پہنچ گئے۔ لاکھوں افراد سر پر کفن باندھ کر سڑکوں پر نکل آئے، پولیس تھانوں پر حملہ کیا، سرکاری عمارتوں کو آگ لگائی اور فوج کو للکارا کہ وہ ان پر گولی چلائے۔

۱۶ جنوری ۱۹۷۹ء کو شاہ نے ہمیشہ کے لیے ایران چھوڑ دیا۔ یکم فروری کو آیت اللہ خمینی فاتحانہ شان سے تہران واپس آئے۔ لاکھوں کے ہجوم نے ان کا استقبال کیا۔ انقلاب آگیا اور ایران اسلامی جمہوریہ بن گیا۔ ایران کا انقلاب بلاشبہ اپنے زمانے کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ ہم سب پر اس کا بہت اثر ہوا۔ میرے اور میرے دوستوں کے لیے یہ قدرتی بات تھی کہ ہم اس کی حمایت کرتے۔ اس نے ہم سب کو خواب دیکھنا سکھا دئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دنیا میں اسلامی بنیاد پرستی بھی داخل ہوگئی اور پھر ایک بار یہ بنیاد پرستی شروع ہوئی تو پھر وہ عام ہوتی چلی گئی اور زخمی بھڑ کی طرح جو برابر بھن بھن کرتی رہتی ہے یہ لفظ میرے کانوں میں بھی اتنا گونجا کہ میں پاگل سا ہوگیا۔ لیکن انہی دنوں میرے بیٹے اور بیٹی کی پیدائش نے میری ذمہ داریاں بھی بڑھا دیں۔

بہر حال میں نے برطانیہ کے سائنسی رسالہ ''نیچر'' کو آمادہ کر لیا کہ وہ مجھے ایران بھیج دیں۔ میں انقلاب کے چند مہینے بعد ہی وہاں پہنچا۔اور سیاسی انتشار کے باوجود مجھے وہاں امید کی کرن نظر آئی۔ میں نے خمینی کے نظریات کے پیچھے سائنسی فکر کی تلاش میں سائنس دانوں، انجینئروں، پرفیسروں اور فلسفیوں سے بات چیت کی۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ سب عدل ومساوات کی بنیاد پر ایک نیا اسلامی ایران بنانے کے لیے بے تاب ہیں۔ مجھے میرا پرانا دوست رضا بھی ملا جو ابھی تک بے کار تھا مگر اسے یقین تھا کہ یونیورسٹی میں اسے ملازمت مل جائے گی۔ میں نے سوچا کہ رضا جیسے جوشیلے کارکنوں اور انقلابی جذبے کے باعث آیت اللہ ہمیں موعودہ جنت تک لے جائیں گے۔ ان کے نعروں آزادی، استقلال اور جمہوریہ اسلامی میں کوئی ایسی بات تھی جو دلوں میں حرارت پیدا کرتی تھی۔ دنیا بھر کے مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ صدیوں کے زوال کے بعد اب اسلام کے عروج کا زمانہ آیا ہے،اور ایران اس نئی اسلامی دنیا کے لیے ایک مثال اور ایک نمونہ ثابت ہوگا۔ اب مسلمان اپنے لیے ایک نئی جنت بنالیں گے۔لیکن اس انقلاب کے شیعہ رنگ نے مجھے پریشان بھی کیا تھا۔ ہر شخص کہہ رہا تھا کہ یہ صرف اسلامی انقلاب نہیں ہے بلکہ شیعہ اسلامی انقلاب ہے اور ایسے علماء اور مذہبی رہنما شیعہ مسلک میں ہی مل سکتے ہیں جو منظم طور پر اس قسم کے انقلاب کی رہنمائی کر سکیں۔ ان کا خیال تھا کہ سنّی اس قسم کا انقلاب نہیں لا سکتے۔ ایک دن رضا نے طنز کیا ''تمہارا سنّی آیت اللہ خمینی کہاں ہے؟'' اس سے منطقی نتیجہ یہ نکالا جا رہا تھا کہ انقلاب کا یہی ماڈل دوسرے ملکوں کو بھی برآمد کیا جائے گا۔

لیکن کلیم صدیقی بالکل پریشان نہیں تھے۔انقلاب نے انہیں بالکل ہی بدل دیا تھا۔ میں نے ان کے ساتھ جو دن گزارے تھے ان سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ ان کی بظاہر جادوئی شخصیت کے اندر ایک مطلق العنان انسان چھپا ہوا ہے۔جس طرح وہ اپنی عینک کے ساتھ کھیلتے اور اسے کبھی ادھر اور کبھی ادھر کرتے تھے اسی طرح وہ میٹنگ پر بھی چھا جانے اور بحث کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے تھے۔ انقلابی تربیت نے انہیں دوسرا ٹراٹسکی بنا دیا تھا۔انہیں دیکھ کر ٹراٹسکی پر بنائی جانے والی فلم یاد آتی تھی کہ وہ کس طرح مجمع میں تقریریں کیا کرتا تھا۔ ایک بار ان کے گھر میں نے کہا کہ ہمیں مستقبل کے اسلامی معاشرے کے لیے مختلف امکانی صورت حالات پر غور کرنا چاہیے۔میرا مطلب یہ تھا کہ ایک کثیر نظریات والے معاشرہ کے لیے کئی متبادل اور متنوع ڈھانچے سامنے رکھے جائیں اور ان پر پوری طرح

بحث مباحثہ کیا جائے۔میں نے دیکھا کہ میرے دماغ میں جو تصور ہے دوسرے لوگوں کے تصور سے میل نہیں کھاتا۔کلیم صاحب کے دماغ میں متنوع ، رنگا رنگ اور کثیرفکری ڈھانچے کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ان کے ذہن میں تو ایک ایسا خالص مسلم معاشرہ تھا ،ایک ایسا آدرش معاشرہ جس میں باقی سب لوگ مجبور ہوں گے مسلمانوں کی پیروی کرنے پر۔ان کے نزدیک ایرانی انقلاب یہی تھا۔ایران میں اپنے آئیڈیل مل جانے کے بعد اب وہ کوئی ایسا منصوبہ سوچ رہے تھے جس سے یہ جواز مل جائے کہ کیوں اور کیسے دوسرے مسلم ملکوں پر بھی اسے مسلط کیا جاسکے۔ انہوں نے Road to Medina کتاب کا منصوبہ ختم کردیا اور شیخ جم جوم سے رابطہ منقطع کرلیا۔ بلکہ اب مسلم انسٹی ٹیوٹ برائے ریسرچ کا ادارہ ہی نہیں رہا۔اب انہوں نے بار بار ایران جانا شروع کردیا اور وہ اپنے آپ کو آیت اللہ خمینی کا پیروکار ثابت کرنے لگے۔چنانچہ اب ان پر رقم اکٹھی کرنے کا ایک اور دروازہ کھل گیا اور مسلم انسٹی ٹیوٹ لندن میں ایرانی سفارت خانے کی شاخ بن گیا۔کلیم صدیقی نے اپنے آپ کو اسلامی انقلاب کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ بااثر مفکر قرار دے دیا اور وہ واقعی لندن سے اس انقلاب کی راہبری کررہے تھے۔

مجھے ایرانی انقلاب کے بارے میں اسی وقت شبہ ہوگیا تھا جب طلبہ نے تہران میں امریکی سفارت خانے پر قبضہ کیا اور اسے جاسوسی کا اڈہ قرار دے کر اس کے عملے کو یرغمال بنالیا تھا۔میں نے کلیم صدیقی سے کہا کہ یہ انتہائی احمقانہ اور غیر اسلامی حرکت ہے۔ہم ان کے گھر کھانا کھارہے تھے۔وہ حسب معمول ہاتھ سے دال چاول کھارہے تھے۔انہوں نے چاول کی پلیٹ ایک طرف سرکائی اور ناک کی نوک پر عینک رکھ کر مجھے گھورا۔

''ہمیں بزدلی نہیں دکھانا چاہیے۔'' انہوں نے زور سے کہا۔

''مگر اسلامی انقلاب، کے لیے جو طریقے اختیار کیے جائیں گے وہ بھی تو اہم ہیں۔'' میں نے کہا۔

''موجودہ نظام بدلنے کے ہمیں ہر طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔'' انہوں نے سختی سے کہا۔پھر انہوں نے میرے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار دیکھے۔''دیکھو'' انہوں نے اب مصالحانہ رویہ اپنایا اور عینک کے شیشوں کے اوپر سے دیکھتے ہوئے کہا۔''اسلام کے احیا کے لیے انقلاب ہی ایک قابل عمل راستہ ہے۔جمہوری طریقے سے کسی ملک میں اسلام نافذ نہیں کیا جاسکتا۔انقلاب کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔یہ حقیقت تمہیں تسلیم کرنا چاہیے۔''

ابھی میں نے جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ انہوں نے مجھے ٹوک دیا۔
''لیکن۔''
''ایران کا اسلامی انقلاب مسلمانوں کے سیاسی رویّے کے لیے ایک ماڈل ہے۔تمام دنیا کے مسلمانوں کو اسے قبول کرنا چاہیے۔ہمیں صبر سے کام لینا چاہیے اور اس انقلاب کے پایۂ تکمیل کو پہنچنے کا انتظار کرنا چاہیے۔''

ایرانی انقلاب میں جو بھی نشیب و فراز ہوتے تھے کلیم صدیقی اس کے لیے کوئی نہ کوئی جواز تلاش کر لیتے تھے اور ہر تھیوری عمل کے بعد تیار کی جاتی تھی اور چونکہ عمل الٹا سیدھا ہوتا تھا اس لیے تھیوری بھی ایسی ہی الٹی سیدھی ہوتی تھی۔وہ سنّی تھے مگر شیعہ سیاسی فکر کے گرویدہ ہو گئے تھے۔انہوں نے اعلان کیا کہ سیاسی میدان میں شیعہ ایسی تیز نظر رکھتے ہیں جس سے سنّی محروم ہیں۔اس لیے سنّیوں کو بھی انہی کا طرز فکر اختیار کر لینا چاہیے۔جب ایران نے آیت اللہ خمینی کی ولایت فقیہہ کا اعلان کیا تو کہا گیا کہ آیت اللہ صرف ایران کے ہی مسلمہ اور متفقہ رہنما نہیں ہیں بلکہ وہ اب پوری مسلم دنیا کے رہنما ہیں۔انہوں نے اعلان کیا کہ اسلامی حکومت کے بغیر اسلام نامکمل ہے۔اس لیے تمام اسلامی تحریکوں پر فرض ہے وہ ایرانی طرز پر اسلامی حکومتیں قائم کریں اور دوسرے ملکوں میں اسلامی حکومت قائم ہو جائے تو آیت اللہ کی قیادت میں سب ملکوں کو اکٹھا ہو جانا چاہیے۔انہوں نے کہا کہ جو لوگ ایرانی انقلاب کے مخالف ہیں وہ اسلامی انقلاب کے دشمن ہیں اور پھر انہوں نے فیصلہ صادر کیا کہ تمام انقلاب دشمنوں کو نیست و نابود کر دینا چاہیے اور انقلابی ایران کے پہلے منتخب صدر بنی صدر اور حزب اختلاف کے لبرل لیڈر مہدی بازرگان کو ختم کر دینا چاہیے۔اس پر مجھے غصہ آ گیا۔یہ وہ دانشور تھے جن کے خیالات نے صرف مجھے ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو متاثر کیا تھا۔اگر ان جیسے لوگوں کے ساتھ بھی یہ سلوک کیا گیا تو پھر کسی بھی عقلی بحث کی گنجائش ہی کہاں رہ جائے گی۔مجھ جیسے لبرل انسان کے لیے صدیقی کا یہ فتویٰ ناقابل برداشت تھا۔چنانچہ میں اس ''مفکرِ اعظم'' سے دو بدو گفتگو کرنے انسٹی ٹیوٹ پہنچ گیا۔

صدیقی دفتر میں بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔جیسے ہی میں اندر داخل ہوا انہوں نے اپنی عینک ناک پر سرکانا شروع کی حتیٰ کہ وہ بالکل ہی نوک پر پہنچ گئی۔انہوں نے عینک کے اوپر سے دیکھتے ہوئے کہا ''آج تم کچھ بدلے بدلے نظر آ رہے ہو۔''
''یہ بنی صدر کو ختم کرنے کا کیا معاملہ ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''انقلاب کو اپنا عمل مکمل کرنا چاہیے۔''

''یہ عمل ختم کہاں ہوگا؟ یہ قتل کب تک جاری رہیں گے؟ کل آپ مجھے بھی انقلاب دشمن قرار دے دیں گے۔''

''کل؟'' کلیم صدیقی چیخے۔ ''تم تو انقلاب دشمن ہو۔ سوائے اس کے کہ تم اپنے آپ کو بدل لو۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو بھی آپ سے اختلاف کرے گا وہ انقلاب دشمن ہے۔''

''میرے ساتھ نہیں، اسلامی انقلاب کے ساتھ۔'' انہوں نے عینک ناک کے اوپر سرکائی اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ ''تمہیں اسلامی انقلاب کی اہمیت سمجھنا چاہیے۔ یہ تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ ہے۔ اسلامی انقلاب مسلم معاشرہ کی وہ صورت حال ہے جہاں کسی علاقے کے مسلمان اس طرح اکٹھے ہو جاتے ہیں کہ وہ پھر نا قابل شکست بن جاتے ہیں۔ مسلم معاشرہ ایسی قیادت پیدا کر لیتا ہے جس کی وابستگی خالصتاً اسلام کے تہذیبی مقاصد کے ساتھ ہوتی ہے اور وہاں کوئی ذاتی اور طبقاتی مفاد نہیں ہوتے۔ جب تم اس حقیقت کو جان لو گے تو پھر تم دیکھو گے کہ ترقی کا واحد راستہ اسلامی انقلاب ہی ہے۔''

''ایرانی انقلاب میں کچھ بھی اسلامی نہیں ہے۔'' میں نے نہایت سکون کے ساتھ جواب دیا۔ ''اور اگر میں ایرانی انقلاب کو اسلامی انقلاب مان بھی لوں تب بھی وہ دوسرے مسلم ملکوں کے لیے نمونہ نہیں بن سکتا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف ان کا راستہ ہی سچا ہے اور تمام مسلم ملکوں کو غیر مشروط طور پر ان کی پیروی کرنا چاہیے، وہ یا تو اسلام اور مسلم دنیا کو ایک ہی اکائی سمجھنے کی غلطی کر رہے ہیں یا پھر وہ اپنے آپ کو خدائی اختیار کا حامل سمجھتے ہیں۔ آپ جیسے لوگ جو اسلامی احیاء کو ایک ہی نظریاتی خول میں بند کرنا چاہتے ہیں وہ اسٹالن سے بھی بدتر ہیں۔''

''نکل جاؤ یہاں سے۔'' صدیقی غصے میں چیخے۔ ''اب تم یہاں کبھی نہ آنا۔''

''اس انسٹی ٹیوٹ پر میرا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا آپ کا۔ میں نے سعودی عرب سے جو رقم جمع کی ہے اگر وہ نہ ہوتی تو آپ یہاں نہ بیٹھے ہوتے۔''

ہم ایک دوسرے پر چیخ رہے تھے۔ صدیقی غصے میں لال پیلے ہو رہے تھے۔ انہوں نے اپنا سینہ پکڑا ہوا تھا اور مشکل سے سانس لے رہے تھے۔ میں بالکل پُرسکون تھا کیونکہ پہلی بار اپنے اندر بھرا ہوا غصہ باہر نکال رہا تھا۔

''میں اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک اپنی بات پوری نہیں کر لوں گا۔'' میں نے گہری سانس لی اور کوشش کی کہ صدیقی کے دل کی تکلیف کے بارے میں نہ سوچوں۔ میں نے سوچا۔ اپنے دماغ میں جو خاکہ میں نے بنایا ہوا ہے وہ ہر حالت میں مجھے بیان کرنا ہے۔ ان ''مفکرِ اعظم'' کو بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ دوسرے نظریات بھی کوئی وقعت رکھتے ہیں، انہیں بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔'' ایرانی انقلاب اسلامی احیاء کے کئی راستوں میں سے ایک راستہ ہے دوسرے حالات میں اس کے لیے جمہوری طریقہ بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔ جیسے پاکستان، ترکی یا ملائیشیا میں ہوسکتا ہے۔ جمہوریت کے ذریعہ مسلمانوں کی اجتماعی طاقت کو اسلام کے تہذیبی احیاء کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ یہ عمل سست اور مشکل ہوگا۔ اس طرح جو نظام قائم ہوگا اس میں یہ اہلیت ہوگی کہ وہ باہر کی دنیا کے ساتھ پورے اعتماد سے رابطہ قائم کرے۔ اگر اب تک ایسی تحریکیں کامیاب نہیں ہوسکیں تو اس میں ان تحریکوں کا ہی قصور ہے جمہوری عمل کی خرابی کا قصور نہیں ہے۔ آپ کے نظام میں تو اسٹالن والی ہی ریاست بن جائے گی۔''

''جاؤ، تم جاکر ایران کو جمہوریت سکھاؤ۔'' صدیقی نے مشکل سے سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اب اگر تم یہاں آئے تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔''

میں نے صدیقی صاحب کا حکم مان لیا۔ میں کلیم صدیقی اور ان کے فلسفے سے زیادہ ایران کو جانتا تھا۔ میں نے طے کیا کہ ایک بار پھر ایران جاؤں تاکہ اپنے آپ کو یقین دلاسکوں کہ صدیقی کا فلسفہ غلط ہے۔ میں وہاں لوگوں میں گھل مل کر ان کے خیالات اور جذبات جانوں اور اس تجربہ کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کروں۔ میں صرف ایک شخص کے ساتھ اپنے کشیدہ تعلقات کی بنا پر اس ملک کے بارے میں فیصلہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔

میں ۴ مئی ۱۹۸۰ء کو تہران کے مہرآباد ہوائی اڈے پر اترا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ میرے پاس ویزا نہیں تھا۔ ٹرمنل کی عمارت میں داخل ہونے کے بعد میں پاسپورٹ کی چیکنگ کے لیے کھڑے مسافروں کی قطار میں کھڑا ہوگیا۔ بندوقیں لیے باریش پاسداران انقلاب سب کے پاسپورٹ چیک کر رہے تھے۔ ان میں سے بعض کے کاندھوں پر آیت اللہ خمینی تصویر لگی ہوئی تھی۔ اگرچہ میں قطار میں بہت پیچھے کھڑا تھا مگر ایک پاسدار میرے پاس آیا اور میرے ہاتھ سے پاسپورٹ چھین لیا۔ پھر وہ پاسپورٹ کے ورق الٹنے لگا۔

''ویزا کہاں ہے؟'' وہ غصے سے بولا۔

''دیکھیے۔۔۔''میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر میری بات سنے بغیر ہی اس نے مجھے قطار سے باہر کھینچ لیا۔

میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔''ادھر کھڑے ہو جاؤ۔'' اس نے ایک اور پاسدار کو آواز دی۔ وہ بھاگا بھاگا آیا۔ اب دوسرے نے میرا پاسپورٹ لیا اور ورق الٹنے لگا۔

''کیا بات ہے؟ تم ویزے کے بغیر ہی آ گئے؟''

''جی،''میرے حلق میں کچھ اٹک سا گیا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے نگلتے ہوئے کہا۔''بات یہ ہے کہ مجھے کل ویزا ملنا تھا لیکن لندن میں ایرانی سفارت خانہ کا محاصرہ ہو گیا ہے۔''

''تم برطانوی باشندے ہو؟''

''جی۔''

''تم یہاں ویزا کے بغیر آئے ہو۔ تم جاسوس ہو۔''

''ایک منٹ، ایک منٹ''میں اس کی منطق سے بالکل متاثر نہیں ہوا تھا۔''میں برطانیہ کا باشندہ ہوں لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ میں جاسوس ہوں۔ کیا میں جاسوس نظر آتا ہوں؟''

''بالکل''اس نے زور سے کہا۔

''اگر میں جاسوس ہوتا تو کیا ویزے کے بغیر یہاں آ کر خواہ مخواہ اپنی طرف توجہ مبذول کراتا؟''

''میرے ساتھ بحث نہ کرو۔''اس پر میری بات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ میں اپنی پرانی عادت کے مطابق حالات دیکھتے ہوئے اپنا لہجہ بدل رہا تھا۔

''دیکھو۔ میں اس لیے ویزا نہیں لے سکا کہ تمہارا سفارت خانہ محاصرہ میں تھا۔''میں نے خوب زور سے کہا۔

اب اور بھی پاسدار دوڑتے ہوئے آ گئے اور مجھے گھیر لیا۔

''تم جاسوس ہو۔ تمہیں ملکہ نے بھیجا ہے۔''ایک پاسدار بولا''ادھر انگریزوں نے ہمارے سفارت خانے پر قبضہ کر لیا ہے اور ادھر تمہیں جاسوسی کے لیے بھیج دیا ہے۔''

''وہ انگریز نہیں ہیں جنہوں نے تمہارے سفارت خانے پر قبضہ کیا ہے۔''میں بھی جواب میں چیخا۔''یہ خزستان کے باغی ایرانی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو عربستان کا جمہوری انقلابی محاذ کہتے ہیں۔ وہ آیت اللہ خمینی کے خلاف مظاہرہ کر رہے ہیں اور اپنے اکانوے ساتھیوں کی رہائی کا مطا

لہ کررہے ہیں۔''
میں بول ہی رہا تھا کہ ایک پاسدار آگے بڑھا۔ وہ میرے اتنا قریب آگیا کہ مجھے اس کے مُنھ سے ان مسالوں کی خوشبو آنے لگی جو ایرانی کھانوں میں پڑتے ہیں۔ اس کی نظریں میری آنکھوں میں گڑی جارہی تھیں۔ ''ہم مرنے کو تیار ہیں۔''

''مگر میں تیار نہیں ہوں۔'' میں نے یونہی کہہ دیا۔

''تم بھی مرو گے۔'' وہ غرایا اور اپنا سر میرے سر پر مارا۔ میں اپنا سر پکڑ کر پیچھے کو ہٹا۔ اب میرے پیٹ پر بوٹ کی ٹھوکر پڑی۔ میں گر گیا۔ اب دو آدمیوں نے میرے کاندھے دبوچے اور گھسیٹتے ہوئے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئے۔

''یہاں ٹھہرو۔'' انہوں نے کہا۔

یہ چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں کوئی فرنیچر نہیں تھا، اس کی دیوار شیشے کی تھی۔ اس میں سے میں دیکھ سکتا تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ پاسداران لوگوں کے پاسپورٹ چیک کررہے تھے۔ کسی سے کہتے ادھر آؤ اور کسی سے کہتے ادھر جاؤ۔ وہ سب کو شک کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نفرت تھی۔ اندر میں کمرے میں اپنا سر اور پیٹ پکڑے بیٹھا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں قید خانے میں ہوں۔

میرے دماغ میں چند لفظ اٹک گئے تھے اور وہ نکل ہی نہیں رہے تھے۔ میں یہاں روشن مستقبل امید لیے آیا تھا۔ مجھے لندن کے وہ دن یاد آرہے تھے جب ہم مسلم انسٹی ٹیوٹ بنا رہے تھے۔ اس وقت کلیم صدیقی نے کہا تھا ''ہمیں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم قید خانے میں بند ہیں۔'' انہوں نے کہا تھا ''ہمارے اردگرد کی دنیا ہماری امیدوں، ہماری اقدار اور ہماری امنگوں کی عکاس نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دنیا کی تشکیل میں ہم مسلمانوں نے مشکل سے ہی کوئی حصہ لیا ہے۔ ہمیں اس حقیقت کو قبول کرلینا چاہے کہ ہم قید میں ہیں اور ہم اس قید خانے کے اصول وضوابط سمجھنے کی کوشش کررہے ہیں۔ ہمیں قید خانے کی ہر ہر چیز کو بغور دیکھ لینا چاہیے اور پھر اس ''کھلے قید خانے'' سے بھاگ نکلنے کی ایسی تدبیر کرنا چاہیے کہ کسی کو شک تک نہ ہو۔ اس میں کسی وقت ہمیں اس قید خانے کے گارڈ کو بھی اپنے ساتھ ملانا ہوگا۔ وہ ہمارے ساتھ اس وقت تعاون کریں گے جب ان کی اپنی پوزیشن کو کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔ پوری تیاری ہوجائے تو ہمیں فرار ہوجانا چاہیے۔ یہ انقلاب ہوگا۔''

میں شیشے کی دیوار کے پیچھے سے پاسداران کو دیکھ رہا تھا۔ میں دو گھنٹے ان لوگوں کا رویہ دیکھتا رہا تھا جو میرے کمرے سے باہر قید میں تھے۔ پھر پاسدار میرے کمرے میں آئے اور مجھے ٹرمینل کی عمارت سے باہر ایک اور عمارت میں لے گئے۔ مجھے ایک اور کمرے میں دھکیل دیا گیا۔ یہاں کوئی کھڑکی نہیں تھی اور اندھیرا سا تھا۔ میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوئیں تو مجھے وہاں کی چیزیں نظر آنا شروع ہوئیں۔ وہاں ایک چھوٹی سی میز اور دو کرسیاں پڑی تھیں۔ وقت گزرتا گیا۔ کتنا وقت گزرا؟ مجھے اندازہ نہیں تھا۔ جب وقت کا احساس ہی ختم ہوگیا تو ایک چھوٹے سے قد کا ادھیڑ عمر کا آدمی اندر آیا۔ اس کے چہرے پر کئی دن کی بڑھی ہوئی داڑھی تھی۔ اس نے خاکی پتلون اور آدھی آستینوں کی سفید قمیص پہنی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ابھی ابھی گہری نیند سے جاگا ہے۔ وہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔اس نے جیب سے رومال نکالا اور ماتھا پونچھا۔ پھر مجھ سے کہا۔ بیٹھ جاؤ۔

''تمہارے پاسپورٹ میں لکھا ہے کہ تم انفارمیشن سائنٹسٹ ہو۔ یہ انفارمیشن سائنٹسٹ کیا ہوتا ہے؟'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''انفارمیشن سائنٹسٹ وہ ہوتا ہے جو انفارمیشن کو استعمال کرتا ہے، انہیں پروسس کرتا ہے، اسٹور کرتا ہے اور نکالتا ہے۔'' میں نے نرمی سے جواب دیا۔

''تمہارا مطلب ہے کہ انفارمیشن سائنٹسٹ معلومات اکٹھی کرتا ہے۔''

''جی، وہ معلومات اکٹھی بھی کرتا ہے۔''

''بالکل جاسوس کی طرح؟''

''نہیں نہیں۔'' میں نے کہا ''انفارمیشن سائنٹسٹ جاسوس نہیں ہوتے۔ وہ تو لائبریرین کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ لائبریرین کی طرح معلومات جمع کرتے ہیں۔''

''تو، تم یہاں ایران کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنے آئے ہو؟ ٹیکنیکل معلومات؟'' مجھے لگا کہ میں کسی جاسوسی ناول کا کردار بن گیا ہوں۔

''دیکھیے،'' میں بولا۔ ''اگر میں جاسوس ہوتا تو کیا میں اپنے پاسپورٹ پر اس کا اعلان کرتا؟'' میں دیکھ رہا تھا کہ میری دلیلیں بے کار جا رہی ہیں۔ میں پریشان ہوتا جا رہا تھا۔ ''میں بھی آپ کی طرح مسلمان ہوں۔ کیا انگریز کسی مسلمان کو جاسوسی کے لیے بھیجتے؟'' میں نے کہا۔

''بالکل بھیجتے۔ اگر تم جاسوسی کے لیے نہیں آئے ہو تو پھر کیوں آئے ہو؟'' اس نے سکون

سے جواب دیا۔

''میں انقلاب کے بارے میں معلوم کرنے آیا ہوں۔ میں نے آپ کے انقلاب کی حمایت کی ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیسے جا رہا ہے۔ اس نے معاشرے میں کیا کیا سماجی اور سیاسی تبدیلیاں کی ہیں۔''

''یہاں تمہیں کس نے بلایا ہے؟''

''مجھے اعلیٰ تعلیم کے نائب وزیر علی برزگر نے بلایا ہے۔ وہ میرے دوست ہیں۔''

آخر اس کے چہرے پر عقل و ہوش کی کرنسی دکھائی دی۔

برزگر کے نام سے اس کے چہرے کے تاثرات کچھ اور بدلے۔ ''تم انہیں کب سے جانتے ہو؟''

اب مجھے امید کی کچھ جھلک سی نظر آئی اور میں نے کہا ''قریب ایک سال سے جانتا ہوں۔ پچھلے سال ویانا میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہاں ترقی کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کے موضوع پر کانفرنس ہو رہی تھی۔''

''اس کے بعد بھی ان سے ملے؟''

''جی ہاں، پچھلے اکتوبر میں یہاں آیا تھا تو ملا تھا۔''

''تم نے کیا باتیں کی تھیں؟''

''ہم نے ایران میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے بارے میں باتیں کی تھیں۔''

اب تفتیش کرنے والا آگے کو جھکا، اپنی کہنیاں میز پر رکھیں اور دونوں ہاتھوں پر اپنا بڑھی ہوئی داڑھی والا چہرہ رکھ لیا۔ ''مجھے وہ تمام باتیں بتاؤ جو انہوں نے تمہارے ساتھ کی تھیں۔'' اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال رکھی تھیں۔

''ہم نے شاہ کے زمانے کی صنعتی پالیسی کے بارے میں باتیں کی تھیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ یورپ کی ملٹی نیشنل کمپنیوں نے ایران کو لوٹ کھایا ہے۔ شاہ نے جن کمپنیوں کے ساتھ معاہدے کیے ہیں وہ یک طرفہ منافع کما رہی ہیں۔ انہوں نے بال بیرنگ کمپنی کے بارے میں بتایا جو ۱۹۶۹ء میں نوے ملین ڈالر سے سویڈن کی کمپنی ایس کے ایف کے ساتھ مل کر بنائی گئی تھی۔ ایران کے کارخانے نے بال بیرنگ بنانا شروع بھی کر دیے تھے اس کے بعد بھی وہ کمپنی سویڈن سے بال بیرنگ ایران میں درآمد کرتی رہی۔ چونکہ ایرانی مال کا معیار اچھا نہیں تھا اس

لیے اس کمپنی کو بہت نقصان ہوا اور اس کا سرمایہ آدھا رہ گیا۔''

''خوب،'' وہ بولا۔ ''اور انہوں نے کیا بتایا؟''

''انہوں نے شاہ کے ایٹمی پروگرام کے بارے میں بتایا۔ شاہ پورے ایران میں ۲۳ ری ایکٹروں کا ایک سلسلہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ انقلاب سے پہلے چار ایٹمی پلانٹس پر کام شروع ہو گیا تھا اور باقی انیس کے لیے گفت وشنید ہو رہی تھی۔ جن چار ری ایکٹروں پر کام ہو رہا ہے ان میں سے دو جرمن کمپنی سیمنز بنا رہی تھی اور دو فرانسیسی کمپنی فریم ایٹم۔ ان کے ساتھ معاہدے یک طرفہ تھے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ایرانی اٹامک اتھارٹی اس میں دخل نہیں دے سکتی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ ان کی جو قیمت ادا کی گئی ہے وہ بہت ہی زیادہ ہے۔ انہوں نے کہا۔۔۔''

اس شخص نے زور سے میز پر مکا مارا ''سنو، مجھے بال بیرنگ یا ایٹمی پاور پلانٹ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ بتاؤ انہوں نے انقلاب کے متعلق کیا کہا تھا؟ انہوں نے طلبہ کے امام کے نقش قدم پر چلنے کے بارے میں کیا کہا تھا؟''

''ہم نے امام کے متعلق کوئی بات نہیں کی۔'' میں نے جواب دیا ''انہوں نے کہا تھا کہ انقلاب سب کچھ بدل دے گا۔ انہوں نے کہا تھا کہ انقلاب ایرانی سائنس اور ٹیکنالوجی میں اسلام کی روح پھونک دے گا۔ انہوں نے کہا تھا کہ ایران کو بھاری بھر کم منصوبوں کی ضرورت نہیں بلکہ اسے ایسے منصوبے چاہئیں جو مقامی وسائل اور ایرانی ہنرمندوں کی اہلیت سے پورے کیے جا سکیں۔ ایران کو اپنی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کی ضرورت ہے۔ ایران کو صارف معاشرے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ وہ بہت زیادہ منافع چاہتا ہے۔ اسے معیاری چیزوں کی ضرورت ہے۔''

''اور یہ سب تم نے لکھ لیا۔'' اب وہ کچھ نرم پڑ گیا تھا۔

''جی، میں نے ڈاکٹر برزگر اور دوسرے سائنس دانوں سے جو باتیں کی تھیں ان کی بنیاد پر برطانیہ کے سائنسی رسالے ''نیچر'' میں ایک مضمون لکھا تھا۔

تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی۔ ''میں انہیں ٹیلی فون کر سکتا ہوں؟'' میں نے کہا ''میرے پاس ان کے گھر کا نمبر ہے۔''

''چاہو تو ضرور کر لو۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میرے ساتھ آؤ۔''

وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گیا جہاں ٹیلی فون تھا۔ میں نے نمبر گھمایا اور انتظار کیا۔

گھنٹی جاتی رہی اور کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ ''میرا خیال ہے وہ سو رہے ہیں۔ میں ایک گھنٹے بعد فون کرلوں گا۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔'' اس نے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا ''مگر میرا خیال ہے وہ وہاں نہیں ہوں گے۔'' اس کے لہجہ میں ایک اعتماد سا تھا۔ ایک یقین سا۔

''میں اپنے دوسرے دوستوں کو فون کرسکتا ہوں؟'' میں نے کہا۔

''جتنے دوستوں کو چاہو فون کرو'' اس نے پھر ہاتھ لہرائے۔

میں نے رضا کو فون کیا وہاں سے بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر میں نے کئی اور جاننے والوں کو فون کیا۔ مگر لگتا تھا کہ کوئی بھی گھر پر نہیں ہے۔ اب وہ آدمی مجھے پھر اسی کمرے میں واپس لے گیا۔

''تم جانتے ہو تمہارے تمام دوست گھر پر کیوں نہیں ہیں؟'' اس نے کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔''

''اس لیے کہ وہ سب انقلاب دشمن ہیں۔ علی برزگر اب وزیر نہیں ہے۔ اس پر انقلاب دشمنی کا الزام ہے۔ اس نے امام کے نقش قدم چلنے والے طلبہ اور پاسداران کی پالیسی پر اعتراض کیا تھا۔ تمہارے تمام دوست ہمارے انقلاب کو نقصان پہنچانے کی کوشش کررہے تھے۔ ہم انہیں سبق سکھا دیں گے۔'' وہ ٹھہرا۔ میں نے اس سے نظریں چرانے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے میرے چہرے پر خوف دیکھ لیا۔ ''معلوم ہے اس سے میں کیا سمجھا ہوں؟''

میں خاموش رہا۔ میرے پاس اس خوف کے لیے کوئی ایک لفظ بھی نہیں تھا جس نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

''میں سمجھتا ہوں۔ اپنے تمام دوستوں کی طرح تم بھی انقلاب دشمن ہو۔ تم ہمارے انقلاب کو نقصان پہنچانے آئے ہو۔ ہم تمہیں بھی وہی سبق سکھائیں گے۔'' اس نے تیزی کے ساتھ میز میرے سامنے سے ہٹا دی اور میری ٹھوڑی پکڑ لی اور میرا چہرہ اوپر کو اٹھا دیا۔ ''اب تم اپنی صفائی میں کیا کہو گے؟''

اس کے ہاتھ کے کونے میں سے میں نے اپنے ٹیڑھے منہ سے کہا ''میں تو یہاں انقلاب کا مشاہدہ کرنے آیا تھا۔'' میں اب اس کی نظروں سے اپنی نظریں بچا رہا تھا۔ ''میں تو

شروع سے ہی اس انقلاب کی حمایت کر رہا ہوں۔''

اس نے میرا چہرہ چھوڑ دیا اور اپنی کرسی پر چلا گیا۔ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا پھر اٹھ کر چلا گیا۔

کھڑکی کے بغیر اس کمرے میں جہاں وقت کا احساس بھی ختم ہو گیا تھا میں نے اسلامی انقلاب کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ یہ انقلاب مدینہ کی طرف تو نہیں جا رہا تھا۔ حضرت محمد ﷺ کئی سال مدینہ میں جلاوطنی کے بعد جب مکہ لوٹے تھے تو انہوں نے ان تمام لوگوں کو معاف کر دیا تھا جنہوں نے ان کے ''انقلاب'' کی مخالفت کی تھی۔ اس کے برعکس آیت اللہ خمینی کے پیروکار انتقام لینے پر تل گئے تھے۔ اسلام سے پہلے جن لوگوں نے مسلمانوں پر ظلم کیے تھے انہیں معاف کر کے اسلام کے حلقے میں شامل کر لیا گیا تھا۔ لیکن ایرانی انقلاب نے وہ تمام کام شروع کر دئے تھے جو اس قسم کے انقلابوں میں کیے جاتے ہیں۔ اس نے خوف و دہشت کی فضا پیدا کر دی تھی اور مخالفوں کو ایک ایک کر کے پکڑا جا رہا تھا۔

وہ شخص واپس آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا جس نے سیاہ عبا اور سفید عمامہ پہنا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر خوبصورت ترشی ہوئی داڑھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ پہلے آدمی نے نہایت احترام کے ساتھ کرسی کی طرف اشارہ کیا اور کہا ''حجتہ الاسلام'' میں سمجھ گیا کہ یہ صاحب علما اور افسروں کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ حجتہ الاسلام کرسی پر بیٹھ گئے اور فائل پہلے آدمی کو دے دی۔

''ہم تمہارے بارے میں سب جانتے ہیں۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ ''تم وہ شخص ہو جو برطانیہ کے اخباروں میں ایرانی انقلاب کے بارے میں لکھتے ہو۔ چند رسالے ہمارے پاس بھی ہیں۔'' اس نے فائل کھولی اور ایک مضمون کی فوٹو کاپی نکالی۔ ''اس مضمون میں'' اس نے کہا ''تم نے امام کے متعلق بری باتیں لکھی ہیں۔''

میں سمجھ گیا وہ کس مضمون کی بات کر رہا ہے۔ ''میں نے امام کے متعلق بری باتیں نہیں لکھی ہیں۔'' میں نے جواب دیا ''میں نے تو صرف یہ بتایا ہے کہ وہ پیرس سے مغربی طیارہ میں تہران آئے۔ اس لیے ایرانی انقلاب میں کچھ مغربی ٹیکنالوجی کا بھی ہاتھ ہے۔ بس یہی تو لکھا ہے۔''

''تم نے لکھا ہے امام مغرب کی سیاہ تصویر پیش کر رہے ہیں۔''

''میرا خیال ہے کسی کو بھی برا نہیں کہنا چاہیے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم امام سے زیادہ جانتے ہو۔''

میں خاموش رہا۔ پہلے آدمی نے چند صفحے الٹے اور بولا ''تم نے جاسوسوں کے اڈے پر طلبہ کے قبضے کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔

''جی نہیں۔''

''پچھلی بار جب تم یہاں آئے تھے تو کہاں ٹھہرے تھے؟''

''میں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ میں جس دن وہاں آیا تھا اس دن وہ ہوٹل تخت جمشید روڈ پر تھا اور دوسری صبح جب میں وہاں سے نکلا تو اس سڑک کا نام شاہراہ طالقانی ہوگیا تھا۔''

''تو تم امریکی سفارت خانے سے صرف پانچ سو میٹر دور تھے پھر بھی تم نے اس کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ تم کیسے لکھنے والے ہو۔''

''سنیے،'' میری آواز میں التجا سی تھی ''ہر اخبار والا امریکی سفارت خانے پر قبضے کے متعلق لکھ رہا تھا۔ میں نے دوسرے امور پر لکھا۔''

''تم نے کس بارے میں لکھا؟''

''میں تہران سے باہر دیہی علاقوں میں گیا۔ میں ان رضا کاروں میں شامل ہوگیا ''جہاد سازندگی'' (جہاد برائے تعمیر نو) میں مصروف تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ کس طرح وہاں کے حالات کا معائنہ کر رہے ہیں، وہاں کی ضرورتوں کا جائزہ لے رہے ہیں اور کس طرح ہر گاؤں کی ضرورت کے مطابق انجینئروں اور کاریگروں کو وہاں بھیج رہے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ ماہرین کی ٹیم کس طرح گاؤں کے لوگوں کو ہنر سکھا رہی ہے، کس طرح وہ گھر اور اسکول تعمیر کر رہے ہیں اور کس طرح ان کے وسائل کے مطابق ان کے مسائل حل کر رہے ہیں اور کس طرح انہیں اپنے پیروں پر کھڑا کر رہے ہیں۔ میرے نزدیک انقلاب کا یہی مطلب ہے اور میں نے اسی کے متعلق لکھا۔''

حجتہ الاسلام نے جھک کر پہلے شخص کے کان میں فارسی میں کچھ کہا۔

''تم نے بنی صدر کے بارے میں بہت لکھا ہے۔ کیا تم ان کے حامی ہو؟''

''میرے خیال میں وہ ایران کا صدر بننے کے حق دار ہیں۔ یہ ایران اور مسلمانوں کے لیے بہتر ہے۔''

''تم نے ان کے بارے میں کیا لکھا؟''

''میں نے لکھا کہ وہ ایران میں ایک فلاحی معاشرہ قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ ہر چیز اللہ کی ہے اور کسی فرد یا طبقے کو اس پر قبضہ کرنے کا حق نہیں ہے۔ تمام قدرتی وسائل، زمین اور سرمایہ پورے معاشرے کی ملکیت ہیں اور ان پر ہر ایک کو برابر کا حق ملنا چاہیے۔ میں نے اپنے مضامین میں ایرانی دولت کی منصفانہ تقسیم کا منصوبہ پیش کیا تھا۔''

''تم انہیں پسند کرتے ہو؟''

''مجھے ان کے خیالات پسند ہیں۔''

''تم انہیں پسند کرتے ہو یا نہیں؟'' پہلا آدمی غصے میں چیخا۔ حجتہ الاسلام کھڑے ہوئے اس آدمی کے کاندھے پر تھپکی دی اور پھر کرسی پر بیٹھ گئے۔

''ہم تو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تم بنی صدر کے خیالات سے اتفاق کرتے ہو یا امام کے خیالات سے؟'' پہلے آدمی نے لمبی سانس لیتے ہوئے سوال کیا۔

''ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔'' میں نے آرام سے جواب دیا۔ ''بنی صدر امام خمینی کے شاگرد ہیں۔ وہ اپنے استاد کی پیروی کر رہے ہیں۔''

''انقلاب کسی کے ساتھ محض اس لیے نرمی نہیں کر سکتا کہ وہ امام کا شاگرد ہے۔'' پہلا آدمی بولا ''بنی صدر اب کچھ دن کا ہی مہمان ہے۔ میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم انقلاب کے حامی ہو یا نہیں؟''

''یہ بات نہیں ہے کہ میں انقلاب کو پسند نہیں کرتا'' میں نے حجتہ الاسلام کی طرف مُنھ کر کے کہا کہ شاید وہ میری بات سمجھ جائیں۔ ''میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ احیائے اسلام کے لیے خونی انقلاب کا راستہ بہتر نہیں ہے۔''

''یہ شبہ تمھیں کیسے ہوا؟'' پہلے آدمی نے طنز کے ساتھ پوچھا۔

پہلی بار میں نے حجتہ الاسلام کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی۔ شاید وہ تھوڑی بہت انگریزی جانتے تھے۔ وہ مسکراہٹ مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ میں نے سوچا انہیں سوچنے دینا چاہیے کہ میں کیا سوچتا ہوں۔

''تاریخ میں ہر انقلاب نے ریاست کو ہی مضبوط کیا ہے۔ انقلاب لانے کے لیے ایک چھوٹے سے گروہ کی ضرورت ہوتی ہے اور جب انقلاب آجاتا ہے تو اردگرد کے ماحول کی وجہ سے وہ گروہ عدم تحفظ کا شکار ہو جاتا ہے اور انقلاب کا تصور زندہ رکھنے کے لیے وہ اقتدار پر اپنی

گرفت مضبوط سے مضبوط کرتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح آمریت وجود میں آتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ہر انقلاب کا نتیجہ آمریت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔''

''تو تم سمجھتے ہو کہ ایران میں بھی یہی ہو رہا ہے؟ اسلامی جمہوریہ آمریت ہے؟''

''جی میں یہی سمجھتا ہوں۔'' میں نے رسان سے کہا۔ اب میرا ڈر دور ہو گیا تھا۔ ''نئے آئین نے تمام اختیارات رہبر یا ان کی کونسل کو دے دیے ہیں۔ انتظامی امور روحانی رہبر کے ماتحت ہیں۔'' میں نے حجتہ الاسلام کی طرف سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''ملاؤں نے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھ لیے ہیں۔ ایران ایک مذہبی ملک بن گیا ہے اور مذہبی ملک آمریت ہوتے ہیں۔ پاسداران انقلاب اور بائیں بازو کے مجاہدین کے درمیان اختلافات باقاعدہ جنگ کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ جو بھی پاسداران سے اتفاق نہیں کرتا وہ انقلاب دشمن بنا دیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران کا انقلاب بھی تاریخ کے دوسرے انقلابوں کے رخ پر ہی چل رہا ہے۔ انقلاب کی نیچر ہی یہ ہے۔'' اب مجھے سکون سا محسوس ہوا۔ میں یہی کہنا چاہتا تھا۔ میں نے ان کے چہروں پر نظر ڈالی۔ حجتہ الاسلام مسکرا رہے تھے۔ مجھ سے جرح کرنے والا غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔

''اگر تم نے ہمارا آئین پڑھا ہے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ہمارے یہاں الیکشن ہوتے ہیں۔ جس صدر کو تم بہت پسند کرتے ہو اسے منتخب کیا گیا ہے۔ ہماری مجلس ہے، یعنی پارلیمنٹ۔ آزاد عدلیہ ہے۔ لیکن مسلمان ہونے کی وجہ سے ہمارا امام بھی ہے۔ جو ہماری رہنمائی کرتا ہے۔'' وہ سانس لینے کو رکا۔ ''تم ہمارے امام کو پسند نہیں کرتے۔ ایں؟''

یہ بہت ہی خطرناک سوال تھا۔ یہ انقلابی کسی کو انقلاب دشمن قرار دینے کے لیے یہ دیکھتے تھے کہ وہ امام کو پسند کرتا ہے یا نہیں۔

''جی ہاں، میں نے جرح کرنے والے سے وہی کہہ دیا جو وہ سننا چاہتا تھا۔ ''میں امام کو پسند نہیں کرتا۔ میرے خیال میں وہ ہمارے پیغمبرؐ کے راستے پر نہیں چل رہے ہیں۔ میرے خیال میں تمام روحانی اور دنیاوی اختیارات ایک ہی آدمی کے پاس نہیں ہونا چاہئیں۔ میں امام کے خیالات کا حامی نہیں ہوں۔''

اب میں نے سوچا کہ میں یہاں سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جرح کرنے والا اور حجتہ الاسلام دونوں ہی پرسکون نظر آ رہے تھے۔ جرح کرنے والے نے

میرے سامنے سے میز کھینچی اور بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں پاؤں نیچے لٹک رہے تھے۔

''بس، آخری بات۔'' اس نے لہجہ بدلتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا خیال ہے کہ اگر امام کی قیادت میں عوام شاہ کے خلاف اٹھ کھڑے نہ ہوتے تو وہ اپنا تخت چھوڑ دیتا؟''

''شاید نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا تم واقعی سمجھتے ہو کہ مسلمانوں کے مسائل کا حل مغربی طرز کی جمہوریت میں ہے؟''

''ہوں'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''جمہوریت کی بھی اپنی الجھنیں ہیں۔ الیکشن سے تبدیلی آتی ہے۔ لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس سے ایسے لوگ اقتدار میں آجائیں گے جو واقعی دیانت دار، سمجھدار اور اتنے قابل ہوں گے کہ عوام کی امنگیں پوری کرسکیں۔'' میں سوچنے کے لیے رکا۔

''تو پھر اس کا حل کیا ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔'' مجھے سچی بات ہی کرنا چاہیے تھی۔ واقعی میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں بھی سوچتا ہی رہتا تھا۔ ایک سال پہلے تک میں سمجھتا تھا کہ ایران کا انقلاب اس کا جواب ہوگا۔ مگر اب مجھے اس پر بھی شک تھا۔

''تم الجھن میں گرفتار ہو۔'' اس نے کہا ''اور ایسے لوگ خطرناک ہوتے ہیں جنہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ وہ اکثر غلط کام ہی کر جاتے ہیں۔ تمہارے اندر انقلاب دشمنی کا زبردست رجحان پایا جاتا ہے۔ اسی لیے انہوں نے تمہیں یہاں آنے کی اجازت نہیں دی۔ تم آخرکار انقلاب دشمن طاقتوں کی ہی مدد کرو گے۔ تمہیں واپس چلے جانا چاہیے۔''

اس نے فائل بند کی اور حجتہ الاسلام کو دے دی۔ پھر اس نے اپنی جیب سے میرا پاسپورٹ اور ٹکٹ نکالا اور مجھے دے دیا۔

''تمہارے ٹکٹ کے مطابق تمہاری اگلی منزل کراچی ہے۔ ساڑھے چھ بجے پی آئی اے کی فلائٹ ہے۔ تمہیں اس پر سوار کرا دیا جائے گا۔'' یہ کہہ کر وہ مڑا اور باہر جانے لگا۔ حجتہ الاسلام نے اسے روکا اور اس کے کان میں کچھ کہا۔ وہ میری طرف مڑا۔ ''حجتہ لاسلام کہہ رہے ہیں کہ لندن میں ہمارے سفارت خانہ کا محاصرہ ختم ہوگیا ہے۔ آیت اللہ نے تمہاری حکومت اور پولیس کا شکریہ ادا کیا ہے۔ تمہاری پولیس نے سفارت خانے پر حملہ کرکے بندوق بردار لوگوں کو مار ڈالا ہے۔ آیت اللہ نے اغوا کیے جانے والوں کو شہید قرار دیا ہے۔''

اس نے دروازہ کھولا اور احترام کے ساتھ کھڑا ہوگیا کہ حجتہ الاسلام پہلے جائیں۔ لیکن حجتہ الاسلام میری طرف آئے اور میری پیٹھ تھپکی۔ پھر ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا ''خدا تمہیں ہدایت دے۔'' گویا انہیں یقین ہوگیا تھا کہ میں واقعی حق کی تلاش میں ہوں اور میں ایسا شخص ہوں جسے آج یا کل اپنی غلطی کا احساس ہوجائے گا۔

وہ دونوں وہاں سے چلے گئے اور میں کھڑا رہ گیا۔

میں ایک بار ایران آیا تھا تو اس گھاٹی میں جانے سے انکار کر دیا تھا جہاں ایک بد طینت انسان نے جنت بنائی تھی اور میرے دوست نے مجھے ڈرپوک کا خطاب دیا تھا۔ کاش مجھے علم ہوتا کہ اس وقت میرا وہ دوست کہاں ہے تو میں اسے آج کا واقعہ سناتا۔ یہ اتنی جرات کی بات تو نہیں تھی لیکن جرح کرنے والے نے مجھ سے سچ اگلوا لیا تھا۔ میں نے سر جھکا کر ان تمام لوگوں کے لیے دعا کی جنہوں نے جنت تلاش کی اور انہیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی۔ میرے پاس ان لوگوں کے لئے کوئی دعا نہیں تھی جو اس جنت کے لیے دوسروں کو قتل کر رہے ہیں۔ سال دو سال بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرے بہت سے دوست انقلاب دشمنی کے الزام میں تہران کی مشہور جیل میں بند ہیں۔ ان کا حشر کیا ہوگا؟ اس کا کسی کو علم نہیں۔

تھوڑی دیر بعد دو پاسداران آئے اور مجھے ٹرمینل کی عمارت میں لے گئے۔ اصل دنیا میں واپس آکر مجھے محسوس ہوا کہ میں بری طرح تھک گیا ہوں۔ نیند سے میری آنکھیں بند ہوئی جارہی تھیں۔ ''تم لاؤنج میں سو سکتے ہو۔'' ایک پاسدار نے کہا۔ لاؤنج میں چند پاسداران ہی تھے باقی سب جگہ خالی پڑی تھی۔ میں نے لیٹنے کے لیے ادھر ادھر دیکھا۔ دنیا بھر کے ہوائی اڈوں کے لاؤنجوں میں پڑی کرسیاں ایسے ڈیزائن کی جاتی ہیں کہ کوئی آرام سے ان پر بیٹھ نہ سکے اور نہ ان پر لیٹ کر سو سکے۔ میں نے ایک کونے میں الگ تھلگ سی ایک جگہ دیکھی، اسے خوب صاف کیا اور فرش پر ہی لیٹ گیا۔ میں نے اپنے اوپر کوٹ ڈال لیا۔ چند منٹ کے اندر ہی مجھے نیند آگئی۔ میرے اندر کچھ سوچنے اور محسوس کرنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ مجھے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ میری کیا حالت ہے اور آگے کیا ہوگا۔ مجھے تو بس نیند آرہی تھی۔

ابھی میں چند گھنٹے ہی سویا تھا کہ مجھے اپنے پیٹ میں کچھ چبھتا ہوا محسوس ہوا۔ مشکل سے آنکھیں کھولیں تو میرے اوپر ایک داڑھی والا پاسدار کھڑا تھا جس کی بغلیں پسینے میں بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے ہاتھ میں ہینڈ گن اس طرح پکڑے ہوئے تھا جیسے میرا نشانہ لے رہا ہو۔ میں

نے یونہی اپنے ہاتھ کی پشت سے اس گن کو دوسری طرف کر دیا۔ جیسے ہی اس نے میری آنکھیں کھلی دیکھیں اس کی ٹھوکر سخت بن گئی۔ میں اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا تو اس نے میرا کندھا پکڑ کر زور سے مجھے اٹھایا اور اپنی گن میرے بائیں کان پر رکھ دی۔

''جاسوس کے بچے، اٹھ جہاز پر بیٹھ جا۔'' ڈر کے مارے میرے مُنھ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ جہاز کہاں تھا؟ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس نے جیسے میرا خیال پڑھ لیا ہو۔ ایک دم اس نے میرا مُنھ دوسری طرف کر دیا۔ اس نے میرے کاندھے پر اپنی گرفت مضبوط رکھی اور جب اسے یقین ہوگیا کہ میں اس کے قبضے میں ہوں تو اس نے اپنی گن پر گرفت ڈھیلی کر دی۔ اس نے مجھے دھکا دیا اور میں اس کے آگے چلنے لگا۔ میرے پاؤں خود بخود حرکت کر رہے تھے۔ میں دعا کر رہا تھا کہ خدا کرے پی آئی کی فلائٹ آ گئی ہو اور میں اس ملک سے جلد نکل جاؤں۔ ہم رن وے پر پہنچ گئے تھے لیکن اندھیرا اتنا تھا کہ کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ دور سے ایک جہاز کا ہیولا سا دکھائی دے رہا تھا۔ آدمی کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ یا تو تمام مسافر جہاز میں سوار ہو چکے ہیں یا میں ہی اکیلا مسافر ہوں۔ پاسدار مجھے جہاز کے پاس لے گیا اور حکم دیا کہ سوار ہو جاؤ۔ جب میں جہاز پر سوار ہو گیا تو اس وقت بھی اس کے چہرے پر غصہ جما ہوا تھا۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو ''اس جنت میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔''

مجھے دروازے کے قریب ہی بٹھا دیا گیا۔ میں گم سم بیٹھا تھا۔ میں نے آج تک اتنا سکون کبھی محسوس نہیں کیا جیسا اس وقت محسوس کر رہا تھا۔ میری ہر پریشانی دور ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے برابر بیٹھے مسافر کو سلام کیا اور جوں جوں میری آنکھیں بند ہونے لگیں میں نے اس سے کہا ''مہربانی کر کے ائر ہوسٹس سے کہہ دینا کراچی تک مجھے نہ اٹھائے۔''

اس نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ ''واقعی سائنس نے کمال کر دیا ہے۔'' پھر میری سیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا ''تو جہاز کا یہ حصہ کراچی جا رہا ہے۔'' اور پھر اپنی طرف اشارہ کیا ''اور یہ حصہ زیورخ جا رہا ہے۔''

باب۔۱۰

تلاش وجستجو کے ماہ وسال

جہاز مختلف سمتوں میں اڑ رہا تھا یا نہیں، مگر میری کیفیت کچھ ایسی ہی تھی۔ میں ایران سے نکالا گیا تھا لیکن ایران اور سعودی عرب میرے اندر بسے ہوئے تھے۔ ہم مسلمان بیک وقت کئی شناختوں کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔ اسلام کی مختلف تعبیریں اور تشریحیں ہیں، مختلف تاریخیں ہیں، مختلف علاقے، مختلف لسانی گروہ اور اب مختلف قومیں ہیں۔ یہ سب ہماری شخصیت کی تعمیر کرتے ہیں۔ ایران اور سعودی عرب میرا حصہ اس لیے ہیں کہ وہ میرے ہیں۔ رسول اللہؐ نے کہا تھا کہ امہ انسانی جسم کی طرح ہے۔ اس جسم کے کسی ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو پورا بدن درد محسوس کرتا ہے۔ میں تھکن سے چور چور ہو رہا تھا۔ میرا سر چکرا رہا تھا اور میرا پیٹ خراب تھا۔ میرا ایک ایک عضو دکھ رہا تھا۔ امہ کا حصہ بننا ایک دینی تجربہ ہے۔ ایمان کا حصہ۔ میں اپنی ذات میں منفرد ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی میں مسلم امہ کا حصہ بھی ہوں۔ امہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو باہر سے تھوپی گئی ہو یہ میرے اندروں میں موجود ہے۔ جنت کی ایسی تلاش کا کیا فائدہ جس میں صرف اپنی ذات ہی مطمح نظر ہو۔

عجیب راستوں سے ہوتا ہوا میں لندن پہنچا تو مجھے اپنے زخم مندمل کرنے میں کافی وقت لگا۔ میں سوچتا تھا کہ یہی وقت ہے جب کسی داڑھی والے کو میرے پاس آنا چاہیے۔ لیکن معلوم ہوا کہ بسوں کی طرح مولوی بھی کبھی اس وقت نہیں آتے جب آپ کو ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ مسعود صاحب نے کہا تھا کہ بس کی طرح جنت بھی آپ کا انتظار نہیں کرتی۔ میں پریشان تھا کہ

میں نے مکان تبدیل کر کے کہیں معاملات کو الجھا تو نہیں دیا ہے۔ میں اپنے خاندان کو لے کر شمالی لندن کے ایک ایسے علاقے میں چلا گیا تھا جہاں ایشیائی باشندے آباد ہونا شروع ہوئے تھے۔

بہر حال، ایک دن جب بہت سردی پڑ رہی تھی داڑھی والے میرے گھر پہنچ گئے۔ یہ جنوری ۱۹۸۴ء تھا۔ میں نے غور سے ان کا جائزہ لیا۔ ان میں ایک صاحب میرے پرانے دوست محمد اقبال اساریہ تھے۔ ان کے ساتھ گول چہرے والے جو صاحب تھے وہ ڈاکٹر اکبر محمد علی تھے۔

''فرمائیے، آپ کیسے تشریف لائے؟'' وہ آرام سے بیٹھ گئے تو میں نے پوچھا۔ ''آپ جانتے ہیں کہ میں مولوی صاحبان سے زیادہ نہیں ملتا۔''

ڈاکٹر اکبر نے ایسا قہقہہ لگایا کہ سب ہنس پڑے۔ انہوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، ''آپ نے پھر مولویوں کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ تمام داڑھی والوں کو آپ نے شیطان سمجھ لیا ہے۔''

میں اقبال کو دس بارہ سال سے جانتا تھا۔ میں نے انہیں جب بھی دیکھا وہ ایک ہی قسم کے سادہ اور ڈھیلے ڈھالے لباس میں نظر آئے۔ وہ مشرقی افریقہ سے برطانیہ آئے تھے مگر ان کا حلیہ پرانے مولویوں والا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ ہر وقت اپنی داڑھی کھجاتے رہتے ہیں۔

''ہم آپ کے پاس ایک تجویز لے کر آئے ہیں۔'' اقبال نے کہنا شروع کیا۔ ''تمہاری طرح ہم نے بھی بہت غور و خوض کیا ہے۔''

''جی جی، میں نے جلدی سے کہا ''مسلم امہ کی زبوں حالی اور اس کے لیے کیا کیا جائے۔ اپنی تہذیب کو کس طرح بچایا جائے۔''

اقبال کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر بات توجہ سے سنتے ہیں۔ انہوں نے داڑھی کھجائی اور بولے ''ایرانی انقلاب ایک ڈراؤنا خواب بنتا جا رہا ہے اور اسلامی تحریکیں ایک بند گلی میں پہنچ گئی ہیں۔ ہمیں اس مصیبت سے نکلنا ہے۔ ہم ایک رسالہ نکالنا چاہتے ہیں جو ان مسائل پر مقالے چھاپے گا۔''

''اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس کے ایڈیٹر بن جائیں۔'' ڈاکٹر اکبر نے کہا۔

''اور پیسہ کہاں سے آئے گا؟'' میں نے سوال کیا۔

انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اس کے بعد انہوں نے جو کہا اسے سن کر میں اچھل پڑا۔ ''ایران۔'' اقبال نے میری پریشانی بھانپ لی۔

''صبر، صبر'' وہ بولے ''پہلے ہماری بات تو سن لو۔''

''مولوی صاحب، کوئی احمق ہی دوسری بار سانپ کے بل میں ہاتھ ڈال سکتا ہے۔'' میں چیخا۔

''ہمارے خیال میں وہ آپ ہی ہیں۔'' ڈاکٹر اکبر بولے۔

''ہماری امداد ایرانی انقلاب کے وہ لبرل رہنما کریں گے جو صحیح اصلاح چاہتے ہیں اور پھر ہم یہ امداد اس وقت تک لیں گے جب تک رسالہ اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو جاتا۔ اس کے بعد ہمیں کسی کی ضرورت نہیں رہے گی۔'' اقبال نے کہا۔

''اور اس وقت تک گویا رسالہ اپنا مُنھ بند رکھے گا؟'' میں بولا۔

''ہمیں یقین دلایا گیا ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنی بات ہی کریں گے۔''

''میں معافی چاہتا ہوں۔'' میں نے سختی سے کہا ''میں ایران کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔''

''سوچ لو'' اقبال بولے ''ہم مسلم تاریخ کے نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ ہمیں اپنی ذاتی مصلحتوں سے بلند ہو کر کام کرنا چاہیے۔ ہم کسی ایسے ویسے رسالے کی بات نہیں کر رہے ہیں ہم اپنے رسالے کی بات کر رہے ہیں۔ ہمیں مسلم امۃ تک نئے نئے افکار پہنچانا ہیں۔ ہمارا رسالہ ایسا ہوگا جو ہمارے دماغوں سے کٹھ ملائیت کو نکال پھینکے گا۔ ذرا سوچو۔ تم اس کے ذریعہ کیا کچھ کر سکتے ہو۔''

''امہ کو آپ کی ضرورت ہے۔'' یہ بات ڈاکٹر اکبر نے کہی۔

جو انسان ایک مشن پر ہو اس کے لیے اس سے زیادہ اور کیا بات خوش گوار ہو سکتی ہے اور اقبال کی باتوں میں وزن تھا۔ افکار ہی تہذیبوں کی بنیاد ہوتے ہیں۔ نئے خیالات کی ترویج بھی جنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ مسلمانوں کی تہذیب کے آغاز میں بھی یہی ہوا تھا اور اب بھی ایسا ہی ہو سکتا ہے اور اس کے لیے رسالے سے اچھا اور کونسا وسیلہ ہو سکتا ہے۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے یہ سب باتیں سوچ کر کہا۔ ''مگر میری دو شرطیں ہیں۔ میں لکھنے والوں کا انتخاب خود کروں گا اور ایرانیوں کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔''

''ظاہر ہے جس قسم کے لکھنے والے ہم چاہتے ہیں وہ آسانی سے نہیں ملیں گے۔'' ڈاکٹر اکبر بولے ''وہ تو آپ کو ہی تلاش کرنا پڑیں گے۔ جہاں تک ایرانیوں یا پیسے کا تعلق ہے اس

کے لیے آپ کو ہم کوئی تکلیف نہیں دیں گے۔ یہ ہمارا کام ہے۔''

''ایک بات اور ہے۔'' ڈاکٹر اکبر ڈرتے ڈرتے بولے۔

''وہ کیا ہے؟''

''آپ ایڈیٹر نہیں ہوں گے۔''

''کیا؟ آپ مجھے آئینہ بنانا چاہتے ہیں دوسروں کے عکس کے لیے؟ یعنی میں رسالہ کی ادارت کروں گا مگر اس کا ایڈیٹر نہیں ہوں گا؟''

''پریشان نہ ہوں'' اقبال نے فوراً کہا ''رسالہ آپ کا ہی ہوگا۔ بس ہمیں آپ کے مزاج سے ڈر لگتا ہے۔''

''ہم یہ چاہتے ہیں کہ پہلے چند سال آپ اپنے گرم مزاج کو قابو میں رکھیں۔'' ڈاکٹر بولے۔ ''سب سے پہلے تو رسالہ کی اشاعت اور اس کے اشتہارات ہونا چاہئیں تاکہ ہم خود کفیل ہوجائیں۔ اس کے بعد ہم ایرانیوں سے تعلق ختم کر سکتے ہیں۔ دوسرے ہمارے پاس ایسے لکھنے والے ہونا چاہئیں جو ہماری بات سمجھ سکتے ہوں اور ہمارے خیالات دور دور تک پہنچا سکتے ہوں۔ اس کے بعد اگر رسالہ بند بھی ہوجاتا ہے تو ہمارے خیالات زندہ رہیں گے۔''

''ٹھیک ہے،'' میں نے کہا۔ ''مگر اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں کتنا وقت لگے گا؟''

''یہی کوئی پانچ سال'' اقبال بولے۔ ''کیا آپ اتنے عرصے اپنے آپ پر قابو رکھ لیں گے؟''

''میں اپنی شخصیت سے باہر کیسے جا سکتا ہوں۔''

''بس تم کسی کی ذات یا ایران کے انقلاب کو اپنا نشانہ نہ بنانا۔'' انہوں نے کہا'' جو ہاتھ ہمیں کھلا رہا ہے اسے نہ کاٹ دینا اور یہ بھی یاد رکھو۔ کلیم صاحب کی نظریں ہمارے اوپر ہیں۔ اگر ہم ناکام ہوئے تو سب سے زیادہ وہی خوش ہوں گے۔''

''اچھا، یہ بات ہے تو میں راضی ہوں۔ میں کوشش کروں گا۔''

ہم نے ایک دوسرے کا جائزہ لیا اور میں نے سوچا کہ مجھے بھی اسی کام کی تلاش تھی۔ اس کے بعد ہم بہت دیر یونہی گپیں مارتے رہے اور ننھے ننھے بچوں کی طرح خوش ہوتے رہے۔

ابھی وہ دونوں میرے گھر سے نکلے ہی تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ یہ میرے پرانے دوست عبداللہ نصیف تھے ''تم اگلی فلائٹ سے جدہ آسکتے ہو؟'' وہ پوچھ رہے تھے۔

نصیف نے شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی چھوڑ دی تھی اور وہ رابطہ عالم اسلامی کے سیکریٹری جنرل بنادئے گئے تھے۔ رابطہ یوں تووزارت خارجہ کا ہی ایک شعبہ تھا لیکن نصیف اسے زیادہ وسیع کرنا چاہتے تھے۔ ان کا ارادہ زیادہ سے زیادہ دانشوروں کو اس میں جمع کرنے کا تھا۔ ''کیا تم آئندہ دس سال کے لیے رابطہ کے کام کی منصوبہ بندی کرسکتے ہو؟'' انہوں نے کہا اور مجھے احساس ہوا کہ اللہ کو واقعی میری ضرورت ہے۔

میں نصیف کے کمرے میں پہنچا تو وہ حسب معمول لوگوں میں گھرے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ایک صاحب کھڑے تھے جن کے سر پر خوب گھنے بال تھے اور ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں۔ شکل صورت سے وہ کوئی سیلزمین معلوم ہوتے تھے۔ نصیف نے ان کا تعارف کرایا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے شکاگو میں ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی قائم کی ہے اور ان کا نام ڈاکٹر وصی اللہ خاں ہے۔

میں نے ان کا جائزہ لیا اور محسوس کیا کہ ان کے ساتھ مختصر بات نہیں کی جاسکتی۔ وہ بھی مجھ سے ایسے ملے جیسے برسوں سے جانتے ہوں۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ بتارہے تھے ''الحمدللہ بھائی صاحب۔ ہم نے شکاگو میں ایک مسلم یونیورسٹی قائم کی ہے۔ اس علاقے میں مسلمانوں کی یہ پہلی یونیورسٹی ہے۔ ٦ مئی ١٩٨٠ء کو اعلیٰ تعلیم کے بورڈ نے اس کی منظوری بھی دے دی ہے۔''

دوسرے دن نصیف نے ہمیں مکہ بلایا۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں رابطہ کے صدر دفتر جاؤں اور اس کی گورننگ کونسل کا کام دیکھوں۔ اس کونسل میں مسلم دنیا کے بڑے بڑے دماغ شامل تھے۔ وصی اللہ خاں نے ایک کار کرائے پر لے رکھی تھی۔ اس لیے طے ہوا کہ ہم دونوں اکٹھے ہی جائیں گے۔

''یونیورسٹی میرے باورچی خانہ کی میز پر شروع ہوئی تھی۔'' وصی اللہ خاں نے کار میں بیٹھتے ہی باتیں شروع کردیں۔ میں نے اپنے دوستوں کو راضی کیا کہ وہ اپنی جیبیں خالی کردیں اور اس کی عمارت کے لیے جہاں سے بھی ملے قرضہ لیں۔''

خاں صاحب کی عجیب عادت تھی۔ وہ ہر وقت اپنی مونچھوں کے بال نوچتے رہتے تھے۔ وہ بال توڑتے پھر چٹکی میں پکڑ کر غور سے اس کا جائزہ لیتے اور پھر اسے پھینک دیتے۔

''الحمدللہ بھائی صاحب، صرف عمارت ہی دس لاکھ ڈالر سے زیادہ کی ہے۔''

وہ جتنا بولتے ان کی انگلیاں اتنی ہی زیادہ تیزی سے چلتیں اور مونچھوں کے بال

اکھڑتے رہتے۔ وہ بال توڑتے اور مجھے جھرجھری آجاتی۔ آخر مجھ سے نہیں رہا گیا اور میں زور سے چیخا۔ ''گاڑی روکو۔''

ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر مجھے کیا ہوگیا ہے۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگے۔

''اگر اپنے آپ کو اذیت پہنچانے کا آپ کو اتنا ہی شوق ہے تو آپ وہ شوق ضرور پورا کیجے۔ مگر میرے سامنے نہیں۔ میں اسے برداشت نہیں کرسکتا۔'' میں نے کہا'' آپ اسی طرح مونچھیں نوچتے رہے تو چند مہینے میں ایک بال بھی نہیں بچے گا۔''

''آپ اپنے لیے ایسا کررہے ہیں یا میرے لیے؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''دونوں کے لیے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اچھا اب میں نہیں کروں گا۔''

اور پھر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

خان صاحب اکثر رابطہ کے دفتر جاتے رہتے تھے اس لیے مجھے یقین تھا کہ وہ صحیح راستے پر ہی جائیں گے۔ لیکن نئی بنی ہوئی سڑکوں اور پیچیدہ چوراہوں کے چکر لگا کر ہم نے دیکھا کہ ہم گول دائرے میں ہی گھوم رہے ہیں۔

''آپ نے محسوس کیا کہ نئی دنیا ہم سیدھے سادے مسلمانوں کے خلاف سازش کررہی ہے۔'' ڈاکٹر خاں پریشان ہوگئے تھے۔

دراصل یہ سازش نہیں تھی بلکہ یہ استعارہ تھا کہ مسلم امہ گول چکر میں گھوم رہی ہے اور کہیں بھی نہیں پہنچ پاتی۔ وہ اپنے ورثے اور روایت کی بازیافت کے نام پر ایک ہی جگہ چکر لگارہی ہے۔ وہ مغرب کی نقالی میں کامیاب ہوسکی ہے اور نہ اپنے اصولوں کی تلاش میں۔

خیر، جب تک ہمیں رابطے کے دفتر کا صحیح راستہ ملا اس وقت تک دو گھنٹے کی تاخیر ہوچکی تھی۔ ہم وہاں پہنچے تو اجلاس جاری تھا۔

ہم ہانپتے کانپتے ہال میں پہنچے۔ وہاں چالیس کے قریب بہت ہی بوڑھے بوڑھے ایسے لوگ بیٹھے تھے جن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ سب کی نظریں اجلاس کے صدر کی طرف تھیں۔ صدارت کررہے تھے سعودی عرب کے مفتی عبدالعزیز بن باز اور بن باز نابینا تھے۔ بہت ہی گرما گرم بحث چل رہی تھی۔

''ہم فلسطین کے لیے کیا کررہے ہیں؟'' ایک صاحب بہت ہی آہستہ آہستہ بولے۔

''لیکن افغانستان کی صورت حال زیادہ خطرناک ہے۔'' دوسرے صاحب ان سے بھی آہستہ بولے۔

''ہمیں کشمیر کے مسئلے پر بھی غور کرنا چاہیے۔'' ایک تیسرے صاحب نے بڑی مشکل سے اپنا ہاتھ کھڑا کیا۔

''ایک ایک بولو۔'' شیخ بن باز نے اپنا ہاتھ اٹھا کر اس طرف اشارہ کیا جدھر کوئی بھی نہیں بیٹھا تھا۔ نصیف شیخ بن باز کے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ انہوں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اسے سیدھے رخ پر کر دیا۔

میں اور خان ایک طرف کھڑے تھے۔ نصیف ہمیں دیکھ کر اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر ہم سے نہیں رہا گیا اور ہمارا قہقہہ نکل گیا۔ سب کی نظریں ہماری طرف ہو گئیں حتی کہ شیخ بن باز کی بھی جو دیکھ نہیں سکتے تھے۔

دوسرے دن نصیف نے غصے میں ہمیں اپنے دفتر بلایا ''تم جانتے ہو میں کتنی مشکل سے اپنی ہنسی دبائے بیٹھا تھا۔ تم نے آکر سارا کام ہی خراب کر دیا۔'' یہ کہا اور وہ ہنسنے لگے۔

اس کے دوسرے دن خان نے اپنے منصوبے کا علان کیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اپنی یونیورسٹی میں مسلمانوں کی پرانی اور خستہ روایات اور اس جدیدیت پر تحقیق کا آغاز کرنا چاہتے ہیں جو جدیدیت ہمارے لیے موزوں نہیں ہے۔''

مجھے یہ خیال پسند آیا۔ میں نے کہا کہ اس کا نام پالیسی اور مستقبل کے مطالعہ کا مرکز رکھنا چاہیے۔ خان نے اسے منظور کر لیا اور مجھے اس کا ڈائریکٹر بنانے کی پیش کش کی۔

''لیکن ایک بات ہے'' وہ بولے ''ہم آپ کو تنخواہ نہیں دے سکتے۔ آپ کو اس کام کے لیے اور اپنی تنخواہ کے لیے خود ہی رقم اکٹھی کرنا پڑے گی۔''

چند گھنٹے بعد ہم عبداللہ نصیف کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ نصیف اپنے مہمانوں کے لیے سفارشیں کر رہے تھے۔ کسی کے کام کے لیے وہ ٹیلی فون کرتے اور کسی کو کاغذ پر کچھ لکھ کر دیتے۔ کوئی بھی وہاں سے خالی ہاتھ نہیں جا رہا تھا۔ لوگ ان کے پاس سے ہٹتے جاتے اور ہم ان کے قریب سرکتے جاتے۔ آخر ہم ان کے قریب پہنچے تو میں نے کہا ''ڈاکٹر صاحب، ہمیں امہ کو بچانے کے لیے پیسے چاہئیں۔'' وہ ہنسے ''کتنے چاہئیں؟''

میں نے اپنا پروگرام تفصیل کے ساتھ ان کے سامنے رکھا۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے

چند سوال بھی کیے پھر انہوں نے کہا۔ ''ہمارے مرکز کا پہلا کام یہ ہے کہ رابطہ عالم اسلامی کے لیے مستقبل کا منصوبہ تیار کرے۔''

''جی بالکل درست ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ تھوڑی دیر پانی پیتے رہے پھر ہم سے مخاطب ہوئے ''آپ کے لیے ڈیڑھ لاکھ ڈالر کافی ہوں گے؟''

''جی بہت کافی ہوں گے۔'' خاں صاحب نے جواب دیا۔

۱۹۸۰ء کی دہائی کانفرنسوں اور سیمیناروں کی دہائی تھی۔ ہر موضوع پر کانفرنسیں ہو رہی تھیں۔ کبھی جدہ میں کانفرنس ہوتی تو کبھی اسلام آباد، ڈھاکہ، قاہرہ اور کوالالمپور میں۔ یہ تمام کانفرنسیں مسلم امہ کے لیے کسی بھی قسم کا عملی منصوبہ بنانے میں ناکام رہیں۔ کسی بھی موضوع پر کانفرنس ہوتی اس میں ایک ہی قسم کے لوگ شرکت کرتے۔ میں نے ان کا نام پیشہ ور دانشور رکھ دیا تھا۔ میں خود بھی انہی میں شامل تھا۔

یہ کانفرنسیں انتہائی مہنگے ہوٹلوں میں ہوتیں جہاں ہر طرح کی جدید سہولتیں موجود ہوتیں۔ ایرانی انقلاب کی طرح یہ کانفرنسیں بھی مغربی دنیا کی نظروں سے اوجھل ہی رہیں اور یہ اچھی بات بھی تھی کیونکہ ان کانفرنسوں میں جتنی بدنظمی دیکھنے میں آتی اس کا مغربی دنیا کی نظروں سے اوجھل رہنا ہی اچھا تھا۔

ان دنوں ہر چیز کو اسلامی بنانے کا کام جس شخص نے سب سے زیادہ کیا وہ تھے فلسطینی اسکالر اسمٰعیل رجیع الفاروقی۔ وہ امریکہ میں رہتے تھے۔ داڑھی مونچھیں صاف تھیں۔ یہ صاحب اکثر لندن آتے رہتے تھے۔ وہ بڑے جذباتی انداز میں تقریر کرتے۔ اور جو بھی موضوع ہوتا گھوم پھر کر امہ کی زبوں حالی کی طرف ضرور آجاتے۔ ایک تقریر میں انہوں نے کہا کہ امہ ایک عالمی سوسائٹی ہے جس میں ہر رنگ ہر نسل اور ہر قوم کے لوگ شامل ہیں۔ انہیں جو چیز اکٹھا کرتی ہے وہ ہے اسلام۔ ان کا کہنا تھا کہ امہ کا ترجمہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ اسے اسی طرح استعمال کرنا چاہیے۔ امہ قوم اور رنگ و نسل سے ماورا ہے۔ اسے کسی ایک نسل یا قوم تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ وہ کسی ایک مسلم ریاست تک بھی محدود نہیں رہ سکتی۔

ایک اور تقریر میں انہوں نے کہا کہ مسلمانوں میں عرب اور غیر عرب کی تقسیم مغرب نے کی ہے۔ عرب اور غیر عرب مسلمان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ان سب کو امہ

کی زبوں حالی دور کرنے کے لیے متحد ہو جانا چاہیے۔عرب قوم پرستی کا نعرہ امّہ کو تقسیم کرنے کے لیے لگایا گیا ہے تاکہ عرب، بربر، ترک، ایرانی، کرد، ہندوستانی، چینی اور مالے مسلمانوں کو الگ الگ کیا جائے اور انہیں آپس میں لڑا دیا جائے۔ سب سے پہلے ترک نوجوانوں کو گمراہ کرنے کے لیے قوم پرستی کا نعرہ استعمال کیا گیا۔اور اس کے بعد عربوں کو عثمانی خلافت کے خلاف کھڑا کر دیا گیا۔انہوں نے بعث پارٹی کے مائیکل عفلق پر الزام لگایا کہ وہ عرب قوم پرستی کی بیماری پھیلا رہا ہے۔ ایک اور لیکچر میں انہوں نے ابراہیمی مذاہب یہودی، عیسائی اور اسلام کے درمیان مکالمہ کرنے کا مشورہ دیا۔

۱۹۷۰ء و ۱۹۸۰ء کی دہائیوں میں فاروقی کا شمار نہایت اہم مسلم اسکالروں میں ہوتا تھا۔ وہ گلیلی کے سابق گورنر تھے اور ان دنوں وہ ٹیمپل یونیورسٹی فلاڈیلفیا میں اسلامی شریعت پڑھا رہے تھے۔انہوں نے ایک پوری نسل کو متاثر کیا تھا۔ان کی تحریروں اور تقریروں میں جس چیز نے مجھے متاثر کیا تھا وہ یہ تھی کہ وہ ماضی کے سنہری زمانے کو یاد نہیں کرتے تھے۔وہ مانتے تھے کہ ماضی میں مسلمانوں نے بڑے بڑے کارنامے سر انجام دئے تھے لیکن اب ان کا مسئلہ موجودہ زمانہ اور مسلمانوں کا مستقبل ہے۔

فاروقی سے میری ملاقات ۱۹۷۷ء میں مکّہ میں ہوئی تھی۔اس وقت میں حج ریسرچ سنٹر میں کام کرتا تھا۔اس وقت مسلمانوں کی تعلیم کے موضوع پر عبدالعزیز یونیورسٹی میں ایک کانفرنس ہوئی تھی۔لندن ٹائمز کے تعلیمی سپلیمنٹ میں اس کانفرنس کے بارے میں مقالہ لکھنا میری ذمہ داری تھی۔

بہت سے مقرروں نے کہا کہ اسلام اور مغرب کے درمیان جھگڑا صرف تاریخی اور سیاسی ہی نہیں ہے بلکہ مابعدالطبیعیاتی اور روحانی بھی ہے۔مغرب کی استعماری طاقتوں نے سیکولر نظام تعلیم رائج کر کے اور نو آزاد مسلم ملکوں نے مغرب کی تقلید کر کے مسلمانوں کا نظام تعلیم تباہ کر دیا ہے۔لبرل مغرب میں علم کا ہر شعبہ ان خیالات اور تصورات کے ماتحت ہے جو اسلام کی روح کے خلاف ہیں۔نیچرل سائنسی علوم فطرت کے مخالف ہیں جنہیں اپنی مرضی سے توڑا مروڑا جا سکتا ہے۔اس کے برعکس اسلام انسان اور فطرت کے درمیان تصادم کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔وہ انسان کو فطرت کے ساتھ دوستی کرنے کی تلقین کرتا ہے۔مغرب کہتا ہے کہ ہر چیز تبدیل ہوتی رہتی ہے۔اسلام کہتا ہے کہ اخلاقی اقدار کبھی تبدیل نہیں ہوتیں۔چنانچہ حق و صداقت، نیکی اور

صلۂ رحمی کبھی نہیں بدلتے۔ کوئی معاشرہ جدید دنیا کے مقابلے میں قدیم، غیر ترقی یافتہ اور روایتی ہوسکتا ہے مگر اس میں اخلاقی اقدار نہایت ترقی یافتہ ہوسکتی ہیں۔ اس لیے ہر میدان میں سیکولر علوم اسلامی تصوّرات کے خلاف ہیں۔

فاروقی نے اس کانفرنس میں مسلمانوں کی نجات کی تھیوری بھی پیش کی۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کا اختلاف بذاتِ خود مغربی تہذیب سے نہیں ہے بلکہ اس ذہن اور اس شخصیت سے ہے جو اس نے پیدا کی ہے۔ سیکولر ذہن صرف مغرب میں ہی نہیں پائے جاتے وہ امہ میں بھی موجود ہیں۔ جب تک نظام تعلیم تبدیل نہیں کیا جائے گا اس وقت تک امہ کا احیاء نہیں ہوسکتا۔ موجودہ تعلیم کا دوغلا پن اور تعلیم کی سیکولر اور اسلامی خانوں میں تقسیم ہمیشہ کے لیے ختم ہونا چاہیے۔ ایک نظریاتی پروگرام کے ساتھ اسلامی روح کو تعلیم کا لازمی جزو بنانا چاہیے۔ ہمیں تعلیم کے ہر مضمون کو اسلامی بنانا ہوگا اور یونیورسٹی کی سطح تک نیا نصاب تعلیم تیار کرنا ہوگا۔ ان کی باتوں کی گونج ہر طرف سنی جارہی تھی اور وہ انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل کی لابی میں کسی دیو کی طرح کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ ہر وقت ان کے پیروکاروں کا ہجوم ایسے ہوتا تھا جیسے نئے تخت نشیں بادشاہ کا دربار۔

ایک دن میں ہوٹل کے ریستوراں میں بیٹھا مزیدار کھانا کھا رہا تھا کہ سامنے سے فاروقی آتے نظر آئے۔ وہ ادھر ہی آرہے تھے۔ میں ڈرا کیونکہ اس کانفرنس میں ایک میں ہی تھا جو اس نئے مسیحا اور اس کی اسلامائزیشن کی تھیوری پر فقرے اچھالتا رہتا تھا۔ انہیں اپنی طرف آتا دیکھ کر مجھے ہالی وڈ کی فلم High Noon کا وہ منظر یاد آگیا جہاں ہیرو بدمعاشوں سے مقابلہ کرنے کے لیے آہستہ آہستہ چلتا ہوا آرہا ہے۔

''آپ کا بچّہ ابھی ماں کے پیٹ میں ہی ہے'' میں نے چھوٹتے ہی کہا۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گئے تھے۔

''وہ کیسے؟'' انہوں نے جواب دیا۔

''آپ کہتے ہیں علم سیکولر اور اسلامی علوم دو حصوں میں تقسیم ہے۔ علم کی اس دوغلی تقسیم سے گویا ہم یہ تسلیم کررہے ہیں کہ سیکولر علم اس قابل ہے کہ اسے ختم کردینا چاہیے۔'' میں نے کہا۔

''یہ ایسا تضاد ہے جس کے ساتھ ہم گزارا کررہے ہیں۔''

''لیکن آپ کو یہ تو ماننا پڑے گا کہ حق اور علم ایک ہی چیز نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

فاروقی کا اصرار تھا کہ اسلام میں علم اور حق میں کوئی فرق نہیں ہے۔اگر خدا حق ہے تو کئی حق نہیں ہو سکتے۔ میرا کہنا تھا کہ حق اور علم کو ایک کرنے سے معاملہ خراب ہو جاتا ہے کیونکہ جن لوگوں نے علم کی تعریف و تشریح کی وہ حق کی تشریح میں پھنس گئے اور خدا بن بیٹھے۔اس کے علاوہ ہمارے درمیان ایسے لوگ بھی ہوں گے جو ان صداقتوں کو دبائیں گے جو ان کے خیال میں امہ کے فائدے میں نہیں ہوں گی۔اس طرح علم کو چھپایا جائے گا اور سنسر شپ پیدا ہوگی۔''

فاروقی جھنجلا گئے۔ ''یہ فلسفیانہ بحث چھوڑو۔'' وہ چیخے۔ ''اصل کام یہ ہے کہ ہم علوم کو اسلامی بنائیں۔ معاشیات، سوشیالوجی، نفسیات، بشریات اور پولیٹکل سائنس سب کو اسلامی فریم ورک میں لایا جائے۔اس کا مقصد یہ ہوگا کہ اسلام کو جدید علوم کے ہر شعبے کے ساتھ مربوط کیا جائے۔

میں نے کہا ''اسلام کو جدید علوم کے لیے ساتھ مربوط کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ جدید علوم کو اسلام کے ساتھ مربوط کرنا ضروری ہے۔'' اس سے وہ اور بھی جھنجلائے۔اس لیے میں نے انہیں خوش کرنے کی کوشش کی۔

''چلیے تھوڑی دیر کے ہم آپ کی بات مان لیتے ہیں۔مگر آپ علوم کو اسلامی کیسے بنائیں گے؟''

''ہمیں جدید علوم پر دسترس حاصل کرنا چاہیے، اس کے ساتھ اسلامی ورثے پر بھی ہماری دسترس ہونا چاہیے۔ پھر علم کے ہر شعبے کے ساتھ اسلام کو مربوط کرنا چاہیے۔اس کے بعد اس کا تخلیقی امتزاج پیدا کرنا چاہیے۔اسطرح ہم ہم اسلامی فکر کو ایک نئی سطح پر لا کر امہ کے لیے نیا راستہ پیدا کر سکتے ہیں۔ پرانے زمانے کے علماء مغرب اور مشرق کی آویزش سے بے نیاز ہو کر مغربی علوم حاصل کرتے تھے۔ ہماری نسل نے اس آویزش کا احساس کیا ہے کیونکہ وہ اس آویزش کے زمانے میں زندہ ہے۔''

فاروقی نے میز پر سے چھری اور کانٹا اٹھایا اور میری طرف ہلاتے ہوئے بولے ''انہیں دیکھو۔انہیں علم کے شعبے سمجھ لو جیسے سوشیالوجی اور انتھراپالوجی۔مغرب میں کانٹا بائیں ہاتھ میں پکڑا جاتا ہے اور چھری دائیں ہاتھ میں۔اس طرح وہ بائیں ہاتھ سے کھانا کھاتے ہیں۔لیکن ہم مسلمان دائیں ہاتھ سے کھاتے ہیں۔ہمیں صرف اتنا کرنا ہے کہ اس ہاتھ سے اس ہاتھ میں کانٹا پکڑ لیں۔جدید علوم کو اسلامی بنانے کے لیے ہمیں یہی طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔دوسرے

کاموں کے لیے کچھ زیادہ محنت کرنا پڑے گی۔''

میں حیران ہوگیا۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ میں مسلم دنیا کے ایک بہت ہی بڑے عالم کے سامنے بیٹھا ہوں۔ فاروقی کی سادگی کے سحر سے نکلنے میں مجھے کچھ وقت لگا۔

''لیکن مسلمان عام طور پر چھری کانٹے سے نہیں کھاتے۔ وہ ہاتھ سے کھاتے ہیں۔ چھری کانٹا تو خاص ماحول اور خاص معاشرے کی ایجاد ہیں۔ ہم عام طور پر فرش پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ اور فرش پر چھری کانٹے استعمال نہیں کیے جاسکتے۔ اصل مسئلہ علم کے کسی بھی شعبے کے تصور کا ہے۔ علوم کے شعبے آسمانوں سے نہیں اترتے۔ فطرت یا انسانی سرگرمیوں کو سربمہر ڈبوں میں بند نہیں کیا جاسکتا کہ یہ سوشیالوجی ہے اور یہ نفسیات۔ یہ شعبے انسانوں کے فلسفۂ زندگی سے پھوٹتے ہیں کہ انسان زندگی کو کیسے دیکھتے ہیں اور یہ زندگی کے اس خاص فلسفے کے تابع ہوتے ہیں۔''

میں نے واضح کیا کہ مغرب نے علم کو جس طرح مختلف شعبوں میں تقسیم کیا ہے اس سے ان کے زندگی کے فلسفے کی عکاسی ہوتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا فلسفۂ زندگی حقیقت کا ادراک کیسے کرتا ہے اور مغربی تہذیب اپنے مسائل کو کیسے دیکھتی ہے۔ مثال کے طور پر بشریات یا انتھراپالوجی کا شعبہ اس لیے پیدا ہوا کہ مغرب کے حکم راں اپنے غلام ملکوں اور ان کے باشندوں کو سمجھنا چاہتے تھے تاکہ ان پر آرام سے حکومت کرسکیں۔ غیر مغربی کلچر کے لیے اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ مسلمانوں کے لیے ان شعبوں کو اسلامی بنانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اپنے ثقافتی پس منظر کے حساب سے اپنے شعبے اور علم کے نئے مضامین تیار کرنا چاہئیں اور ان کے ذریعہ اپنے مسائل کا حل تلاش کرنا چاہیے۔''

فاروقی کے پیروکار ہمیشہ ان کے ساتھ لگے رہتے تھے۔ ملائیشیا کا ایک طالب بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ بولا ''علوم کو مختلف اقسام میں تقسیم کرنا اسلامی روایت ہے۔ مسلم علما نے نئے علوم پیدا کیے۔ جیسے علم حدیث، تہذیبوں کا مطالعہ اور خوابوں کا مطالعہ۔ ہم نئے اسلامی علوم پیدا کرسکتے ہیں۔ خود ضیا صاحب نے ایسی ہی کتاب لکھی ہے۔'' وہ میری کتاب Islam: Outline of A Classification Scheme کا حوالہ دے رہا تھا۔

فاروقی نے اس طالب علم کو گھورا۔ وہ کچھ شرمندہ سا ہوا اور اس نے کھانے کی طرف توجہ کرلی۔ فاروقی نے اپنی نظریں میری طرف کرلیں۔ ''آپ دوبارہ پہیہ ایجاد کرنا چاہتے ہیں''

انہوں نے طنز کے ساتھ کہا۔
''بالکل نہیں'' میں نے جواب دیا۔''میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ بیل گاڑی میں ٹرک کے ٹائر نہیں لگائے جاسکتے۔ آپ سائیکل کے پہیوں پر جہاز نہیں اتار سکتے۔ تہذیبیں گاڑیوں کی طرح ہوتی ہیں۔ انہیں خاص پہیوں، یعنی ان کے اپنے علوم کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہی پہیوں پر وہ چلتی ہیں۔''
فاروقی نے چھری کانٹا میز پر رکھ دیا۔ رومال سے اپنے ہونٹ صاف کیے اور کھڑے ہوگئے''تم اپنے راستے پر چلو اور ہمیں اپنے راستے پر چلنے دو۔''
ہم باتیں کر رہے تھے تو مجھے احساس تھا کہ دوسری میزوں پر بیٹھے لوگوں کی نظریں ہمارے اوپر ہی لگی ہوئی ہیں۔ فاروقی کے جاتے ہی سب لوگ کھانے پینے میں لگ گئے۔ مجھے یقین ہوگیا کہ میں جھگڑالو انسان مشہور ہو چکا ہوں۔
دو سال بعد فاروقی بہت سے عرب اسکالروں اور بڑے بڑے تاجروں کے ساتھ سوئٹزرلینڈ کے شہر لوگانو کی ایک کانفرنس میں ملے۔ وہاں دو ہفتے کے بحث مباحثے کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ ساری خرابی مسلم ملکوں کی ان یونیورسٹیوں کی ہے جنہوں نے مغربی علوم اختیار کر لیے ہیں۔ اس کا ازالہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ علم کے تمام شعبوں کو اسلامی بنا لیا جائے۔ اس مقصد کے لیے ایک انسٹی ٹیوٹ بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کے لیے عرب تاجروں نے ڈھائی کروڑ ڈالر دینے کا اعلان کیا۔ طے ہوا کہ یہ انسٹی ٹیوٹ واشنگٹن میں قائم کیا جائے گا اور اس کا نام ہوگا بین الاقوامی انسٹی ٹیوٹ برائے اسلامی فکر۔ اگلے سال فاروقی نے اس کا منشور شائع کیا۔ اب اچانک مسلم دنیا کا ہر شخص اسلامائیزیشن کی باتیں کر رہا تھا۔
میرا خیال ہے کہ وہ منشور بہت ہی معمولی تحریر تھی۔ اسے انتہائی جذباتی انداز میں شروع کیا گیا تھا۔ اس میں لکھا تھا:
مسلم دنیا اس وقت قوموں کی سیڑھی کے سب سے نچلے ڈنڈے پر کھڑی ہے۔
اس صدی میں کوئی اور قوم اس طرح شکست خوردگی کا شکار نہیں ہوئی۔
مسلمانوں کو شکست دی گئی، ان کا قتل عام کیا گیا، ان کی زمین، ان کی دولت، ان کی زندگی اور ان کی امیدیں تک لوٹ لی گئیں۔
ان کے ساتھ دھوکہ کیا گیا، ان کا استحصال کیا گیا،

انہیں زبردستی یا دولت کا لالچ دے کر عیسائی بنایا گیا۔ اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے گماشتوں نے انہیں مغربی تہذیب میں رنگا اور اسلام سے دور کیا۔

یہ کام ہر مسلم ملک اور دنیا کے ہر کونے میں کیا گیا۔

ناانصافی اور تشدد کے شکار مسلمان ہر جگہ بے عزت کیے گئے۔ آج دنیا بھر میں ان کی انتہائی بری شہرت ہے۔ دنیا کے اخباروں اور دوسرے ذرائع ابلاغ میں مسلمان جارح، تخریب کار، امن وامان کے دشمن دہشت گرد، بنیاد پرست، غیر مہذب اور دقیانوسی کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔

وہ دنیا کے ہر ملک میں، چاہے وہ سرمایہ دار ملک ہو یا مارکسسٹ ملک توہین اور ہتک کا نشانہ بن رہے ہیں۔

مسلم دنیا اپنے اندرونی خلفشار، باہمی جھگڑوں، اپنی بے شمار دولت، بے تحاشہ غربت، قحط اور بیماریوں کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے۔

ساری دنیا میں عالم اسلام کو ''دنیا کا مرد بیمار'' کہا جاتا ہے اور اس سب کا ذمہ دار مذہب اسلام کو قرار دیا جاتا ہے۔

اس حقیقت نے اس اہانت اور بے عزتی کو اور بھی ناقابل برداشت بنا دیا ہے کہ مسلم امہ کی تعداد ایک ارب سے زیادہ ہے، اس کے پاس بے شمار دولت اور وسائل ہیں، اس کے لوگوں میں بے پناہ صلاحیتیں ہیں اور پھر اس کا مذہب اسلام انتہائی حقیقت پسند اور بنی نوع انسان کے لیے نہایت فائدہ مند مذہب ہے۔

فاروقی نے مسلم امہ کی زبوں حالی کی تصویر بڑی خوبی سے پیش کی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے ریاضی کی اس مساوات کا دوسرا زاویہ یعنی اس کا حل پیش کیا۔ وہ تھا اسلامائزیشن انہوں نے اسلام کے احیا کے لیے بارہ مرحلے تجویز کیے۔ پہلے مرحلے میں مسلم اسکالر جدید علوم پر دسترس حاصل کریں گے، دوسرے مرحلے میں وہ اپنے علوم کا جائزہ لیں گے، تیسرے مرحلے میں اسلامی ورثے پر دسترس حاصل کی جائے گی۔ اس طرح دسویں مرحلے میں تخلیقی امتزاج پیدا کیا جائے گا اور گیارھویں مرحلے میں ان علوم کو اسلامی سانچے میں ڈھالا جائے گا اور آخر میں اسلامی بنائے جانے والے علوم کی عام لوگوں میں ترویج کی جائے گی اور ان علوم کی تعلیم دی جائے گی۔ مگر معلوم یہ ہوتا تھا کہ فاروقی اپنے پہلے ہی مرحلے پر اٹک گئے تھے۔ میرے نزدیک

یہ سارا پروجیکٹ ہی کسی سلاٹ مشین کی طرح معلوم ہوتا تھا کہ ایک طرف سکہ ڈالو اور دوسری طرف سے اپنا انعام حاصل کرلو۔ لیکن اس پروجیکٹ نے ساری اسلامی دنیا میں ہلچل مچادی۔ پاکستان کے فوجی آمر ضیاء الحق کو یہ پروگرام بہت ہی پسند آیا۔ اور اسلام آباد میں قائم ہونے والی پہلی اسلامی یونیورسٹی فاروقی کے حوالے کردی گئی۔ فاروقی کے انسٹی ٹیوٹ کی شاخیں تمام دنیا میں کھول دی گئیں اور بہت سے مسلم دانشوروں کو اس پروجیکٹ پر لگا دیا گیا۔ اب مسلم دنیا کا ہر اسکالر اسلامائزیشن کے لیے کام کررہا تھا۔

مکے کے ہوٹل میں فاروقی کے ساتھ میری جو بحث ہوئی تھی اس کے بعد مجھے کانفرنسوں کے دعوت نامے ملنا کم ہوگئے۔ میں اور میرے گرد چند اور دوست ہی تھے جو اس پروجیکٹ پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ اس مقصد کے لیے جب کانفرنسیں ہوئیں تو ہم لوگ ان میں بالکل نہیں بلائے گئے۔ میرے بہت سے پرانے ساتھی بھی مجھ سے کھنچے کھنچے رہنے لگے تھے۔

اگلے تین سال میں نے لندن، شکاگو اور جدہ کے درمیان سفر کرتے گزارے۔ نیا رسالہ انکوائری نکالنے میں چھ مہینے لگ گئے اس کا ہر شمارہ کسی خاص موضوع پر ہوتا تھا۔ جیسے اسلامائزیشن، اسلام کا مستقبل، تاریخ، یوٹوپیا، میڈیا، متبادل معاشیات، پاکستان اور ترکی۔ ان موضوعات پر گہری نظر ڈالی جاتی اور ان کا تنقیدی جائزہ لیا جاتا۔ میں نے بہت سے اور یجنل لکھنے والے اکٹھے کرلیے تھے۔ اس رسالے کو ایک ایسے آدمی کی ضرورت بھی تھی جو بظاہر ایڈیٹر ہو۔ یعنی وہی سامنے رہے۔ وہ تھے پرویز منظور۔ میں ان سے ۱۹۸۱ء میں اسٹاک ہام میں ملا تھا جہاں ایک سیمینار میں مسلم اور عیسائی اسکالر سائنس اور اقدار کے موضوع پر گفتگو کررہے تھے تاکہ ان کے درمیان کوئی تخلیقی امتزج پیدا کیا جاسکے۔ وہاں مجھے پرویز ہی ایک ایسے انسان نظر آئے تھے جسے کپڑے پہننے کا بالکل ہی ڈھنگ نہیں آتا تھا۔ انہوں نے عجیب بے ڈھنگے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور مونچھیں ہالی وڈ کے پرانے مزاحیہ اداکار گروچو مارکس کی سی رکھی ہوئی تھیں۔ باتیں کر۔" ہوئے وہ بچوں کی طرح ہنستے تھے۔

کچھ دیر غور سے ان کا جائزہ لینے کے بعد میں ان کے پاس گیا اور پوچھا، ''آپ نے ہی ''حسن اور ذہانت'' پر مقالہ لکھا ہے۔''

''نہیں'' انہوں نے جواب دیا ''میں نے ''حسن اور ادراک'' پر مقالہ لکھا ہے۔''

''کوئی بھی ہو۔'' میں نے کہا ''آپ بہت ہی بدصورت انسان ہیں۔''

اس کے بعد ہم دوست بن گئے۔ میں نے ان سے زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں دیکھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ جس تیزی سے وہ پڑھتے تھے اس تیزی سے سوچتے نہیں تھے۔ اس کے علاوہ انہیں زبانوں کی اصل معلوم کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ لفظوں کے ساتھ کھیلتے رہتے تھے کہ فلاں لفظ کیسے بنا۔ اس لیے ان کے ساتھ بات کرنا ایک آزمائش ہوتا تھا۔ سیمینار میں ان کی بات سمجھ میں نہیں آئی تو کسی نے ان سے کہہ دیا کہ ذرا وضاحت سے بات کیجیے۔ اس پر انہوں نے جواب دیا۔ ''بولنے کا عمل ایک برجستہ اور غیر اختیاری فعل ہے اور بولا ہوا لفظ واپس بھی نہیں آسکتا۔ یونانیوں کا المیہ یہ تھا کہ انہوں نے اپنی تمام بصیرت کے باوجود پیغمبروں کے خدا سے باتیں کرنے کی زبان دریافت نہیں کی تھی۔ مسلمان مفکر ابن رشد جیسا بولتے تھے ویسا ہی لکھتے بھی تھے۔ اس لیے کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیا کہتے تھے، یا کیا لکھتے تھے۔ لیکن اس ڈر سے کوئی اس کا اقرار نہیں کرتا تھا کہ لوگ اسے جاہل کہہ دیں گے۔ چنانچہ پرویز ہمارے لیے بالکل مناسب فرنٹ مین تھے۔ ہم نے ان کا نام ''مولوی لفظیات'' رکھا ہوا تھا۔

ان کے برعکس گلزار حیدر بہت سلیقے کا لباس پہنتے۔ وہ کارلٹن یونیورسٹی اوٹوا میں فن تعمیر کے پروفیسر تھے۔ ان سے میری ملاقات ۱۹۸۰ء میں ہوئی تھی۔ انہوں نے امریکہ کے کئی شہروں میں نہایت خوبصورت مسجدیں تعمیر کی تھیں۔ لیکن وہ بہت ہی یاسیت پسند انسان تھے۔ اگر آپ ان سے سوال کرتے ''کیا حال ہے؟'' تو بلا جھجک جواب دیتے ''رات خواب میں میں نے برف کے ایسے سفید سفید گالے دیکھے کہ وہ مجھے ساری عمر ہریشان کرتے رہیں گے'' ایک بار میں نے یونہی پوچھ لیا۔ آپ کے لیے یہ ہفتہ اچھا رہا ہوگا؟''

''اچھا!'' انہوں نے جواب دیا ''اتنا برا تو میری ساری زندگی میں کوئی ہفتہ نہیں گزرا۔''

گلزار امہ کی حالت زار سے پریشان رہتے تھے۔ حتی کہ انقلاب کے بعد ایران کی صورت حال نے بھی ان کی نیندیں اڑا رکھی تھیں۔ پاکستان میں ضیاء الحق کی حرکتوں سے بھی وہ بہت تنگ تھے۔ ان کی صحبت میں ہمیشہ مایوسی ہی چھائی رہتی۔ وہ مولوی لفظیات کی خوش مزاجی سے بھی نالاں رہتے تھے۔ وہ کہتے اگر آپ کو واقعی اصل صورت حال کا احساس ہو تو آپ اس طرح نہ ہنسیں۔ کسی نے کہہ دیا۔ ''ناراض ہونے کی بات نہیں ہے۔ ہم سب آپ کے دوست ہیں۔ اس پر وہ بولے ''دوست؟ میرا کوئی دوست نہیں ہے۔ میرا جسم مختلف الخیال روحوں کا ڈیرا ہے۔ اسی لیے مجھے اچھی نیند بھی نہیں آتی۔'' ہم نے ان کا نام مولوی ڈیپریشن رکھ دیا تھا۔

حیدر اور منظور کا جواب میرل وین ڈیویز تھی۔ وہ بہت ہی خوش مزاج عورت تھی۔ اسے اپنے ویلش ہونے پر بہت ناز تھا۔ وہ ہر وقت سگریٹ پیتی رہتی اور ایسے سوال کرنے میں مزہ لیتی جن کا مشکل سے ہی کوئی جواب ملتا۔ وہ منظور کے برابر ہی کتابیں پڑھتی لیکن باتیں صاف اور واضح کرتی تھی۔ اس نے علم بشریات کی تربیت حاصل کی تھی مگر صحافت میں آ گئی تھی۔ اس نے بی بی سی میں کام کیا تھا۔ جن دنوں میں ایران کا ویزا حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور ایرانی سفارت خانے کا محاصرہ کرلیا گیا تھا ان دنوں میں ریجنٹ پارک کی مسجد میں گیا تھا تا کہ اصل خبریں معلوم کروں۔ وہاں میرل ایک فلم بنا رہی تھی۔ مذاکرہ میں مجھے بھی شامل کرلیا گیا تھا۔

چند مہینے بعد میرل نے مسلمان ہونے کا فیصلہ کیا تو مشورے کے لیے اس نے میرا انتخاب کیا۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے میرا فرض تو یہ تھا کہ اسلام قبول کرنے کے لیے لوگوں کی حوصلہ افزائی کروں۔ لیکن میرا تجربہ یہ تھا کہ انگریز اور امریکی جو اسلام قبول کرتے ہیں وہ مسلمانوں سے بھی زیادہ مسلمان ہوجاتے ہیں اور کٹھ ملا بن جاتے ہیں۔ اسلام ان کے لیے ایک رومانی تصور سا ہوتا ہے۔ اس لیے میں نے میرل سے کہا کہ پہلے اچھی طرح سوچ لو۔ لیکن وہ کہاں ماننے والی تھی۔ چند ہفتے بعد اس نے کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کرلیا۔ پھر ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا۔ میں سنتا تھا کہ وہ فلاں جگہ تقریر کر رہی ہے اور فلاں محفل میں شرکت کر رہی ہے۔ ایک آدھ محفل میں ہم ملے تو میں نے اندازہ لگایا کہ وہ دوسرے نومسلموں سے مختلف ہے۔ کسی نے اس سے سوال کیا کہ تم نے اپنا مسلمان نام کیوں نہیں رکھا؟ اس نے جواب دیا کہ ابتدا میں جو لوگ مسلمان ہوئے وہ سب پہلے کافر تھے۔ ان میں سے کسی کا نام بھی نہیں بدلا گیا۔ صرف ایک شخص کا نام بدلا گیا تھا۔ اس کا نام تھا عبد اللہ اور اس عبد اللہ سے مراد کافروں کے خدا کا بندہ تھی۔ اس نے کہا میرا نام ویلش زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا مطلب ہے سمندر کی کوئی سفید چیز۔ اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ میں نے ویلش شناخت، ویلش کلچر اور ویلش تاریخ میں رہتے ہوئے یہ معلوم کرنے کے لیے اسلام قبول کیا ہے کہ میں کون ہوں۔''

میرل ہمارے رسالہ میں مستقل کالم لکھتی تھی۔

میں نے اس سے سوال کیا کہ وہ کیوں مسلمان ہوئی ہے؟ تو اس نے کہا ''اسلام ایک ایسا مربوط اور عقلی طور پر ایسا تسلی بخش فریم ورک فراہم کرتا ہے جس میں رہ کر زندگی کے مقصد کے بارے میں ہر قسم کے سوال کیے جاسکتے ہیں۔ مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ ایمان کیا ہوتا ہے۔''

مجھے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ میں تو خود معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرے لیے ایمان کے کیا معنی ہیں۔ مسلمان نومسلموں سے بہت پیار کرتے ہیں کیونکہ اس سے ان کی اپنی ایمان کی کمزوری دور ہوتی ہے۔ اس لیے بہت ہی جلد میرل بھی تمام حلقوں میں بہت مقبول ہو گئی۔

مجھے رسالہ کے لیے کام کرنے میں بہت مزہ آتا تھا۔ رسالے کے لیے مختلف قسم کے مضامین جمع کرنا۔ لکھنے والوں کو لکھنے کے لیے آمادہ کرنا اور طرح طرح کے لوگوں کے ساتھ کام کرنا بہت ہی دلچسپ تجربہ تھا۔ جون ۱۹۸۴ء میں رسالے کا پہلا شمارہ نکلا۔ اس میں اعلان کیا گیا کہ عرب سرمائے اور ایرانی انقلاب کی بنیاد پر اسلامی احیا کا کوئی بھی تصور محض دھوکہ ہی ثابت ہوگا۔ چند مہینے کے اندر ہی رسالہ کی سرکولیشن تیس ہزار تک پہنچ گئی اور ابھی بچاس ہزار تک پہنچنے والی تھی۔ میں دس دن رسالہ کا کام کرتا، دس دن مسلم ملکوں میں کانفرنسوں میں شرکت کرتا اور دس دن شگاگو کی یونیورسٹی میں گزارتا۔ وہاں کا سنٹر میرے ساتھ ہی چلتا تھا۔ میں جہاں بھی ہوتا وہیں سنٹر کا کام بھی ہوتا۔ ہمارا حلقہ بڑھتا جا رہا تھا۔ پاکستان کے منوّر احمد انیس جو بیالوجسٹ اور کتابوں کا کیڑا تھے، نائیجیریا کے اسکالر ابراہیم سلیمان جو مغربی افریقہ کی تاریخ اور اسلامی شریعہ کے ماہر تھے اور ایک اور پاکستانی انور نسیم جو کینیڈا میں رہتے تھے اور سائنس داں تھے، سب ہمارے لیے کام کر رہے تھے۔

ہم جب بھی لندن میں اکٹھے ہوتے تو رات رات بھر ہماری محفلیں چلتیں۔ یہ محفلیں کبھی میرے گھر ہوتیں تو کبھی گلزار حیدر کے گھر۔ ہم خوب بحث کرتے، خوب شور مچاتے اور ایک دوسرے کو اپنی بات کا قائل کرنے کی کوشش کرتے۔ یہ بحث کانفرنسوں میں شرکت کے لیے جاتے ہوئے جہازوں میں بھی ہوتی۔ آخر کسی نے کہا کہ ہمیں اپنے گروپ کا کوئی نام بھی رکھ لینا چاہیے۔ منظور نے اس کا نام ''اجمال'' رکھا۔ گلزار نے بھی اس کی تائید کی۔ اس سے ایک طرف تو خوبصورتی کا احساس ہوتا تھا اور دوسری طرف اختصار کا۔

آخر ہم نے ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی کے قریب ایک ریستوراں میں ''اجمال'' کا افتتاحی اجلاس منعقد کیا۔ وہاں ایئر کنڈیشننگ سے اتنی ٹھنڈ ہو گئی تھی کہ ہم سچ مچ کانپ رہے تھے۔ گلزار اس ماحول میں اور بھی مایوسی کا شکار ہو گئے تھے۔ ہماری جماعت میں سب داڑھی منڈھے تھے۔ دو اصحاب ایسے تھے جن کے نام کا آخری حصہ ایک ہی تھا۔ یہ تھے ایوب ملک اور ظفر ملک۔ ایوب داڑھی مونچھوں سے آزاد تھے۔ وہ فن تعمیر کے ماہر تھے اور انہوں نے کئی انعام یافتہ

عمارتیں بنائی تھیں۔ وہ غریبی کے خاتمے کے لیے منصوبے بناتے رہتے تھے۔ ظفر میرے ساتھ حج ریسرچ سنٹر جدہ میں کام کرتے رہے تھے۔ وہ گرافک ڈیزائنر تھے۔ وہ واحد آدمی تھے جن کی اتنی لمبی داڑھی تھی کہ وہ کارل مارکس معلوم ہوتے تھے۔

ہم اسلام کو دقیانوسی روایات سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ ہم خوب بحث کرتے۔ نئے نئے خیالات پر غور کرتے اور پرانے خیالات پر تنقید کرتے۔ رسالہ کا ہر شمارہ قدیم تصورات کے بخئے ادھیڑتا تھا۔ لیکن جلد ہی ان نئے خیالات کی کمی واقع ہونا شروع ہوگئی اور ادھر لوگوں کی طرف سے شکایات بھی آنے لگیں کہ آپ لوگ تخریب کی باتیں تو بہت کرتے ہیں تعمیری بات کوئی نہیں کرتے۔ اب ہم نے نئے اور پرانے کا امتزاج تلاش کرنا شروع کیا اور اسے اسلام کی اصل روح کے ساتھ منسلک کرنے کی کوشش شروع کی۔

ہم نے اسلام کے اخلاقی پہلو پر زور دیا اور اصرار کیا کہ نئے مسائل سلجھانے کے لیے اسلامی اصولوں سے کام لیا جائے۔ ہم اگرچہ علوم کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے تھے لیکن مسائل کے تجزیہ اور اس کے طریقہ کار پر سب متفق تھے۔ علم کے موجودہ مضامین کو اسلامی بنانے کے بجائے ہم اسلامی نظریہ کے مطابق نئے مضامین تخلیق کرنے کے حامی تھے۔ جن کے ذریعہ سائنس اور ٹیکنالوجی، انٹرنیشنل ریلیشنز، سیاسیات، سماجی ڈھانچے اور دیہی اور شہری ترقی کے موضوعات کا مطالعہ کیا جاسکتا ہو۔

ہمارا خیال تھا کہ اسلام چیزوں کی حقیقت سمجھنے کے لیے مختلف راستوں پر چلنے کی تلقین کرتا ہے۔ تمام علوم ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں اور ان کا تعلق قرآن کی تعلیمات سے ہے۔ اسلام حصول علم کو لازمی ہی قرار نہیں دیتا بلکہ وہ علم کو عبادت کا درجہ دیتا ہے۔ چنانچہ سائنسی اور سماجی علوم حاصل کرنا عبادت کا ہی حصہ ہے۔ یہ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا پانچ وقت کی نماز پڑھنا یا رمضان میں روزے رکھنا۔ اس کے علاوہ اس کا تعلق خلافت سے بھی ہے۔ کیونکہ خدا نے انسان کو دنیا میں اپنا خلیفہ قرار دیا ہے۔ علم کا رشتہ عدل اور استصلاح یعنی عوامی مفاد سے بھی ہے۔ اللہ کے خلیفہ کی حیثیت سے انسان جو علم حاصل کرتا ہے وہ اسے فطرت سے محبت کرنا سکھاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ فطرت میں خدا کی نشانیاں تلاش کرتا ہے۔ علم اور عدل کو باہم مربوط کرنے سے یہ بات یقینی ہوجاتی ہے کہ علم سے معاشرے اور انسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام لیا جارہا ہے۔

اجمال نے جو پہلا مضمون تیار کیا وہ تھا اسلامی سائنس ۔ اسلامی سائنس کی بنیاد توحید پر تھی کہ اللہ ایک ہے اور انسان اس کا خلیفہ ہے۔ مثال کے طور پر ہماری دلیل یہ تھی کہ مسلم معاشروں کے لیے یہ غیر اخلاقی حرکت ہوگی کہ وہ دور دور تباہی پھیلانے والے ہتھیار بنائیں ۔ یا بیالوجی کے مسلمان ماہرین معاشرے کی ضرورتوں کا خیال رکھے بغیر ایسے فیشن ایبل شعبوں میں ریسرچ کریں جیسے تھیوریٹکل فزکس۔ مسلم ماہرین کو ہیضے، آنکھوں کے امراض اور غذائیت کی کمی جیسی بیماریوں کی دواؤں پر ریسرچ کرنا چاہیے ۔ جن سے ہمارے معاشرے دو چار ہیں ۔ میرل نے بشریات کے بارے میں نیا تصور پیش کیا۔ اس نے لکھا کہ ہمیں صرف مسلم معاشروں اور ان میں بسنے والے انسانوں کا مطالعہ ہی نہیں کرنا چاہیے بلکہ تمام ثقافتوں اور تمام معاشروں کے انسانوں اور ان کے باہمی تعلق کے ساتھ ان کا تقابلی کا مطالعہ بھی کرنا چاہیے۔ منور انیس نے صنفی امتیاز اور ٹیکنالوجی کا مطالعہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کیا۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے آخر تک ہم نے ایک درجن کے قریب کتابیں شائع کردی تھیں اور ہمارا خیال تھا کہ ان سے اسلامی تہذیب کے مستقبل کی بنیاد پڑ جائے گی۔

لیکن اسلامی بریگیڈ نے جو اس وقت تک ساری مسلم دنیا میں پھیل چکا تھا اور جس کے پاس بہت زیادہ وسائل تھے ہمارے خیالات کو پسند نہیں کیا۔ ہم جو متبادل راستہ پیش کر رہے تھے وہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ہمارا رسالہ ''انکوائری'' ہمارے خیالات کا ترجمان تھا۔ مولوی اقبال جنہیں ہم نے نام کا ایڈیٹر بنایا ہوا تھا ہمیں خبریں دیتے رہتے تھے کہ کس طرح کلیم صدیقی ہماری راہ میں روڑے اٹکا رہے ہیں اور کس طرح ایران میں یہ مہم چلائی جا رہی ہے کہ ہماری امداد بند کرادی جائے ۔ لیکن شیعہ عقیدے اور ان کی تاریخ پر پرویز کی تنقید اور ایرانی انقلاب کی زیادتیوں پر ہمارے مضامین کے باوجود ہمارا رسالہ چل رہا تھا۔

لیکن مجھے بار بار یہ احساس ہو رہا تھا کہ میں ایک ہی وقت میں دو مختلف مزاج والی محبوباؤں کو خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ایران اور سعودی عرب کے تعلقات دشمنی کی حد تک پہنچ چکے تھے۔ ایرانیوں نے حج کے موقع پر سعودی حکومت کے خلاف نعرے بازی کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ آیت اللہ خمینی نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ سعودی بادشاہت مکے اور مدینے کا نظم ونسق سنبھالنے کا اختیار نہیں رکھتی ۔ ادھر سعودی عرب نے ایران کو خبردار کیا تھا کہ ہمارے اثر ونفوذ والے علاقوں میں اپنا انقلاب برآمد کرنے سے باز آجائے ۔ اب ہمیں ڈر تھا کہ اگر

ایرانی ناراض ہوگئے تو وہ رسالہ کی امداد بند کردیں گے اور اگر سعودی عرب کو خیال آگیا کہ ہم کیا کررہے ہیں تو وہ ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی اور اس کے انسٹی ٹیوٹ کی مالی امداد ختم کردے گا اور ہم اس رقم سے دنیا بھر کی کانفرنسوں اور مذاکروں میں جو شرکت کرتے پھرتے ہیں وہ سلسلہ بند ہوجائے گا۔

مئی ۱۹۸۶ء کے آخر میں مسلم دنیا کو ایک اور صدمہ سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ ۲۷ مئی کو رات کے ڈھائی بجے کے قریب پنسلوینیا کے شہر ونکوٹ میں ایک آدمی فاروقی کے گھر میں داخل ہوا۔ اس نے پیچ کس سے باورچی خانے کا دروازہ کھولا۔ وہاں فاروقی کی بیوی لامیہ سحری کی تیاری کررہی تھیں۔ وہ آرٹ کی نقاد تھیں اور ان دنوں اسلامی آرٹ کے متعلق ایک نئی تھیوری تخلیق کررہی تھیں۔ اس آدمی نے ان کے سینے پر چھری کے دو وار کیے۔ زیادہ خون بہہ جانے سے ان کا انتقال ہوگیا۔ لامیہ کی چیخوں سے ان کی شادی شدہ بیٹی زین جاگ گئی۔ وہ امید سے تھی۔ وہ موقع پر پہنچ گئی۔ اس نے پولیس کو فون کرنے کی کوشش کی تو حملہ آور نے اس پر بھی چھری کے وار کیے۔ لیکن وہ فون کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ حملہ آور گھر کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس لیے وہ فاروقی کے کمرے میں گھس گیا۔ فاروقی نے اس کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی مگر حملہ آور نے انہیں بھی بری طرح زخمی کردیا۔ اس کے بعد وہ پھر زین کی طرف گیا اور اس پر اور وار کیے۔ اس کے بعد وہ بھاگ گیا۔ پولیس پہنچی تو زین خون میں لت پت بیٹھی تھی۔ اس کے ماں باپ مرچکے تھے۔ اس کی چھوٹی بہن ناعمہ کلوزٹ میں چھپ گئی تھی اس لیے وہ بچ گئی۔ چھری باورچی خانے میں پڑی تھی اور چھری کا چمڑہ کا خول اور پیچ کش دو گھر پرے ایک کوڑے دان میں پڑے ملے۔

اتنی گھناؤنی حرکت کون کرسکتا ہے؟ مسلم حلقوں میں طرح طرح کی افواہیں گرم تھیں۔ کیا فاروقی کو اس لیے نشانہ بنایا گیا کہ وہ اسلام کے احیاء کی کوشش کررہے تھے اور ان کے افکار مغربی تہذیب کے لیے خطرہ بن گئے تھے؟ فاروقی پر حملے سے تین مہینے پہلے ان کا ایک بیٹا نہایت پر اسرار حالت میں مرگیا تھا۔ وہ امریکی فوج میں بھرتی ہوگیا تھا اور نیو میکسکو کی ملٹری اکیڈمی میں تربیت حاصل کررہا تھا۔ اس کے والدین کو اس کی موت کی خبر ایک ہفتے بعد ملی جب اسے دفن بھی کردیا گیا تھا۔ بتایا گیا کہ اسے فوڈ پوائزننگ ہوگئی تھی۔ فاروقی نے یہ وجہ تسلیم کرنے سے انکار کردیا تھا۔ کیا ان کے بیٹے کی موت میں امریکی حکومت کا ہاتھ تھا؟ کیا اس میں سی آئی

اے یا ایف بی آئی ملوث تھی ؟ یا فلسطین کے لیے فاروقی کی مہم کی وجہ سے جیوش ڈیفنس لیگ کے انتہا پسند یہودیوں نے اسے مروایا تھا ؟ یا پھر مسلمانوں کے کسی انتہا پسند گروپ نے جو فاروقی کے خیالات پسند نہیں کرتا تھا یہ حرکت کی تھی ؟ اور کیا علوم کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا منصوبہ فاروقی کے ساتھ ہی ختم ہوگیا؟ یہ سوالات گردش کر رہے تھے۔

ہم نے انکوائیری کا جولائی کا شمارہ خاص طور پر فاروقی کے لیے مخصوص کر دیا۔ معلوم ہوا کہ ان کا قاتل ایک سیاہ فام امریکی تھا جو مسلمان ہوگیا تھا۔ اس سے میرے اس خیال کو اور بھی تقویت ملی کہ نومسلم بہت ہی زیادہ شدّت پسند ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے قتل سے ان کا اثر کم ہونے کے بجائے اور بھی بڑھ گیا۔ میں جس مسلم ملک میں بھی جاتا وہاں ان کا ہی ذکر ہوتا۔ ہمارے خیالات نظر انداز کر دئے گئے تھے۔

اس کے ایک سال بعد میں نے انکوائری کا نیا شمارہ تیار ہی کیا تھا کہ مولوی اقبال مجھے اپنے دفتر میں لے گئے۔

''ہم دوڑ میں پیچھے رہ گئے۔'' انہوں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''کیا ہماری امداد بند کر دی گئی؟'' میں نے گھبرا کر سوال کیا۔

''وہ تو میری ناکامی ہوتی۔ ہماری ناکامی تو یہ ہے کہ ہم تمہیں قابو میں نہیں رکھ سکے اور تم بھی اپنے آپ کو قابو میں نہیں رکھ سکے۔ انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ تمہیں نکال دوں۔''

''کیا کوئی اداریہ خطرناک تھا؟''

''نہیں یہ اداریہ کا معاملہ نہیں ہے۔ تم نے مسلم ورلڈ بک ریویو میں The Holy Quran and the Science of Nature پر جو تبصرہ کیا تھا یہ اس کا نتیجہ ہے۔''

مجھے یاد آیا کہ میں نے سائنس کے ایک ایرانی فلسفی مہدی گلشنی کی اس کتاب پر تبصرہ کیا تھا۔ یہ تبصرہ مجموعی طور پر اس کی تعریف میں ہی تھا۔ البتہ میں نے اس بات کی نشان دہی کی تھی کہ مہدی نے تاریخ اور سائنسی فلسفے میں ہونے والی نئی تبدیلیوں کو پیش نظر نہیں رکھا اور ایران سے باہر اسلامی سائنس کے بارے میں جو مباحث چل رہے ہیں ان سے وہ واقف نہیں ہیں۔

''مگر میں نے تو اس تبصرے میں مہدی کی تعریف کی ہے۔''

''تم نے مہدی کے بارے میں جو لکھا ہے اس سے ملاّ ناراض نہیں ہیں بلکہ تم نے امام جعفر صادق کے بارے میں جو لکھا ہے اس نے ہنگامہ برپا کر دیا ہے۔''

شیعہ فرقہ کے بارہ اماموں میں سے چھٹے امام جعفر صادق کو سنی عباسی خلیفہ المنصور نے ۷۵۶ء میں ایک سازش کے تحت شہید کرا دیا تھا۔ ان کے بارے میں عقیدہ ہے کہ انہوں نے تمام اماموں سے زیادہ رسول اللہؐ کی احادیث جمع کیں۔ میں نے اقبال کی میز پر پڑا ہوا رسالہ مسلم ورلڈ بک ریویو اٹھایا اور اپنا مضمون زور زور سے پڑھنا شروع کیا۔ ''تمام اقتباسات اور دلائل صرف شیعہ ذرائع سے حاصل کیے گئے ہیں جیسے سنی علما کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ کوئی بھی ذہین قاری سوال کرسکتا ہے کہ آخر امام جعفر کے کتنے اقتباسات ہضم کیے جا سکتے ہیں۔''

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ تہران کے ملاؤں میں کوئی بھی ذہین قاری نہیں ہے۔'' اقبال نے کہا۔

معلوم ہوا کہ یہ کارنامہ کلیم صدیقی کا تھا۔ اس نے میرے مضمون پر نشان لگا کر وہ رسالہ ایران کے محکمہ پاسداران انقلاب کو بھیج دیا اور لکھا کہ امام کی شان میں اس سے بڑی گستاخی اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ اس پر فوراً کارروائی ہونا چاہیے۔''

''تم چھوڑنے سے پہلے اپنے معاوضے کی رقم کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہو گے؟'' اقبال نے سوال کیا۔

میں نے معاوضہ لیا اور اسی دن دفتر چھوڑ دیا۔

مجھے یاد ہے کہ میں انکوائری کے دفتر سے نکلا تو مجھے جو آدمی بھی نظر آیا وہ اقبال کی طرح کے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ ان دنوں پاکستان اور ہندوستان میں اسی لباس کا فیشن ہوگیا تھا۔ میرے بعد کئی اور لوگ بھی انکوائری چھوڑ گئے۔ لیکن حیرت انگیز طور پر پرویز وہیں ڈٹے رہے۔ ایک سال سے کم عرصے میں ہی کچھ اور تبدیلیاں ہوگئیں۔

انکوائری بند ہوگیا۔ البتہ اجمالی گروپ زندہ رہا۔ ہم نے سوچا کہ مسلمانوں کو بدلنے کے لیے طویل جدوجہد کی ضرورت ہے اور کوئی بھی ایسی مہم جس میں کسی اسلامی ملک کی مالی مدد شامل ہو کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ہم نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ مصلح اور مفکر ہمیشہ زمانے کے خلاف رہے ہیں۔ اس لیے ہمارے ساتھ جو ہوا وہ ہمارے لیے اچھا ہی ہے۔

باب۔۱۱

الوہی قوانین

انکوائری کے بند ہونے کا ہمیں بہت صدمہ تھا۔اس کی موجودگی میں ہمیں یقین تھا کہ اس کے ذریعہ ہمارا مسلم اور غیر مسلم دنیا سے رابطہ ہے۔ہم صرف اپنے آپ سے ہی باتیں نہیں کررہے ہیں ۔مگر اب ہم تنہا رہ گئے تھے۔اور دنیا تھی کہ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ ریگن اور تھیچر کا زمانہ تھا اور دنیا بھر میں صارفین کا کلچر چھایا جارہا تھا اور اسلامی دنیا میں ایک ہی لفظ کی بازگشت سنائی دے رہی تھی اور وہ لفظ تھا شریعہ۔لغوی اعتبار سے شریعہ کا مطلب ہے پانی کی طرف لے جانے والا راستہ اور مذہبی لحاظ سے اسکے معنی ہیں خدا کی طرف جانے والا راستہ۔ یعنی جنت کا راستہ۔اللہ نے قرآن اور رسول اللہؐ کی سنت کے ذریعہ یہ راستہ دکھایا ہے۔ مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس راستے پر چلیں اور اپنے خاندانی رشتوں، جرم و سزا، وراثت، تجارت وکاروبار اور دوسری برادریوں اور قوموں کے درمیان تعلقات میں شریعت سے رہنمائی حاصل کریں۔اب عام طور پر شریعت سے مراد اسلامی قوانین لیے جاتے ہیں، وہ قوانین جو مسلم ملکوں میں رائج ہیں۔

۱۹۸۰ء کی دہائی میں شریعت کی مانگ بہت بڑھ گئی۔ ملائیشیا، پاکستان، مصر، نائجیریا اور سوڈان میں طلبہ اور اسلامی جماعتوں کی طرف سے اپنے حکم رانوں پر نکتہ چینی کی جارہی تھی کہ وہ شریعت نافذ نہیں کرتے۔حتیٰ کہ ان ملکوں میں بھی جہاں مسلمان اقلیت میں تھے جیسے ہندوستان وہاں بھی یہ مطالبہ کیا جارہا تھا کہ ان کے خاندانی اور ذاتی معاملات شریعت کے

مطابق طے کیے جائیں۔ اس لیے کسی بھی با عزت مسلم اسکالر کے لیے مشکل تھا کہ وہ اس موضوع پر بات نہ کرے۔ ہم بھی یہی سمجھتے تھے ک کہ شریعت نافذ ہونا چاہیے۔ لیکن جس مقصد کے لیے یہ اصطلاح استعمال کی جارہی تھی اس نے ہمیں پریشان بھی کیا تھا اور الجھن میں بھی ڈال دیا تھا۔ کیونکہ اس میں بہت سی ایسی چیزیں تھیں جنھیں ہم قبول نہیں کرسکتے تھے، جیسے عورتوں اور اقلیتوں کے ساتھ امتیازی سلوک، انتہائی سخت سزائیں اور دقیانوسی قوانین کے ساتھ لگاؤ۔ اس کے علاوہ شریعت کو ہی فی نفسہٖ اسلام بنادیا گیا تھا۔ اگر اسلام کا مطلب اللہ کی اطاعت ہے تو شریعت اطاعت کا راستہ ہے۔ یعنی مذہب کی طرف جانے والے راستے کا نقشہ۔ لیکن اکثر مسلمانوں کے نزدیک اسلام شریعت اور شریعت ہی اسلام بن گئے تھے۔

اس منطق نے اسلام کے بنیادی تصوّر کو ہی نقصان پہنچایا۔ اسی لیے اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ عام مسلمانوں نے یہ سمجھنا شروع کردیا کہ مسلم معاشروں کو نئے سامراجی نظام سے نجات دلانے اور بہشت میں جانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے شریعت۔ ہمارے خیال میں آج جو شریعت رائج ہے وہ اور اسلام کی روح دو مختلف چیزیں ہیں۔ شریعت کے ایک ہی معنی لینے سے اسلامی فکر کے تنوع کی بھی نفی ہوتی ہے اور یہ تنوع ہمیں بہت ہی عزیز ہے۔ اگرچہ کسی مسلمان سے یہ کہنا کہ وہ شریعت کی مخالفت کرے ایسا ہی ہے جیسے کسی سے گناہ کے حق میں ووٹ دلانا۔ لیکن ہم نے گناہ کا انتخاب کیا۔ ہم نے اس پر غور کرنا شروع کیا کہ آخر شریعت کا موجودہ تصور کیسے پیدا ہوا؟ اور اس پر خالص قرونِ وسطی کا رنگ کیسے چڑھا اور اصل میں ہم خود شریعت سے کیا مراد لیتے ہیں۔

۱۹۸۵ء کی ایک سرد رات کو عبداللہ نصیف کا فون آیا۔ انہوں نے جو پیش کش کی میں اسے رد نہیں کرسکا۔ وہ مجھے پاکستان اور چین میں رابطہ عالم اسلامی کے مشن کے لیے مشیر بنانا چاہتے تھے۔ میں چین کبھی نہیں گیا تھا اور رسول اللہؐ نے فرمایا تھا علم حاصل کرو خواہ اس کے لیے چین ہی جانا پڑے۔ علم کا متلاشی بھلا یہ پیش کش کیسے منظور نہ کرتا۔ پھر اس سفر سے یہ معلوم کرنے میں بھی آسانی رہے گی کہ عام مسلمان اور ان کے رہنما شریعت کا کیا مطلب لیتے ہیں۔ میں جدہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی کے خالق وصی اللہ خاں بھی میرے ساتھ ہوں گے۔

ہم دنیا کے پہلے اسلامی بینک البرکہ کے بانی شیخ صلاح کامل کے ہمراہ لندن اور دنیا کے

دوسرے خطوں میں بینک کی شاخیں قائم کرنے کے لیے جانے والے تھے۔ ہمارے ساتھ سعودی عرب کے سابق وزیر اطلاعات شیخ عبدہ یمانی بھی تھے۔ وہ ان دنوں شیخ کامل کے ساتھ کام کررہے تھے اور بینک کے فلاحی ادارے اقرا ٹرسٹ کے سربراہ تھے۔ ہم شیخ کامل کے پرائیویٹ جیٹ میں اسلام آباد روانہ ہوئے۔

اسلام آباد میں پورے سفارتی تکلفات کے ساتھ ہمارا استقبال کیا گیا۔ ہمیں سرکاری مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا۔ اسے دیکھ کر مجھے انگریزوں کا زمانہ یاد آگیا۔ یہ عالی شان عمارتیں اور یہ تکلفات انہی کے دور کی یادگار ہیں۔ مجھے خیال آیا کہ انگریزوں کے زمانے میں میرے بزرگ تو ان مہمان خانوں کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتے تھے۔ بہرحال ہمارا پہلا پروگرام پاکستان کے فوجی حکمراں جنرل ضیاء الحق سے ملاقات کا تھا۔ صدر نے ہمیں کئی دن انتظار کرایا۔ شیخ نصیف اور میں وصی اللہ خاں کے کارنامے سنتے رہے کہ انہوں نے اپنی یونیورسٹی میں کیا کمالات کیے ہیں۔ شیخ کامل خاں صاحب کی باتوں میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ بلکہ وہ یہ دیکھ کر بھی بہت محظوظ ہوتے تھے کہ خان کی باتوں پر میرا ردعمل کیا ہوتا ہے۔ طویل قامت اور بھاری جثہ کے شیخ کامل اپنا سارا وقت نئے نئے سوٹ سلوانے کے لیے درزیوں کو اپنا ناپ دینے میں گزارتے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ کسی مصری ایکٹریس پر فریفتہ ہوگئے تھے اور اسے متاثر کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ آخر صدر کی طرف سے بلاوا آگیا اور ہم ان کے دربار میں حاضر ہوگئے۔

ضیاء الحق بہت خوش گوار موڈ میں تھے۔ انہوں نے نہایت گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ وہ سب سے گلے ملے۔ میرے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے انہوں نے کہا ''مجھے یاد آرہا ہے کہ حال ہی میں میں نے آپ کی کوئی تحریر پڑھی ہے۔'' انہیں یہ یاد نہیں تھا کہ کیا پڑھا ہے۔ ہم بیٹھ گئے تو انہوں نے کہنا شروع کیا ''آپ کا اور ہمارے دوستوں یعنی امریکہ اور برطانیہ کی امداد کا بہت بہت شکریہ۔ افغانستان میں روس کو قریب قریب شکست ہوچکی ہے اور وہ پسپا ہورہا ہے۔ سعودی عرب کے ایک نوجوان اسامہ بن لادن کی وجہ سے افغان جہاد کو بہت تقویت ملی ہے۔ انہوں نے کل ہی کابل پر حملہ کیا ہے۔'' وہ سعودی عرب کے شاہ کا شکریہ ادا کرنا چاہتے تھے جنہوں نے زبردست مالی مدد کی ہے۔ لیکن انہوں نے کہا کہ ہمیں تمام مسلم ملکوں کی امداد بھی نہیں بھولنی چاہیے۔ اس وقت ۴۳ کے قریب مسلم ملکوں کے تیس ہزار سے زیادہ مجاہدین افغانستان میں لڑرہے ہیں۔ ہزاروں نوجوان شمالی پاکستان کے مدرسوں میں پڑھ رہے ہیں۔

انہیں جہاد کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ ان کی بھرتی کے لیے انہوں نے پھر امریکہ اور سعودی عرب کا شکریہ ادا کیا۔ ہم سب خاموشی سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ بولے ''ہماری اصل پریشانی یہ ہے کہ روس کے افغانستان سے نکل جانے کے بعد کیا ہوگا۔ وہاں خانہ جنگی کا خطرہ ہے جسے ہمیں روکنا چاہیے۔'' ہم سر ہلا ہلا کر ان سے اتفاق کر رہے تھے۔

اس کے بعد صدر نے گیئر بدلا اور بتانا شروع کیا کہ وہ پاکستان میں کیسے شریعت نافذ کر رہے ہیں۔ یہ عوام کا مطالبہ ہے اور ہمیں اسے قبول کرنا چاہیے۔ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور ہمیں ہر حال میں معاشرہ پر اسے نافذ کرنا ہے۔ پھر انہوں نے تفصیل کے ساتھ بتایا کہ قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو کوڑے مارے جائیں گے، چوروں کے ہاتھ کاٹے جائیں گے اور زنا کرنے والوں کو سنگ سار کیا جائے گا۔ ان کی باتیں سن کر میرے چہرے پر جو دہشت طاری ہو رہی تھی بڑی مشکل سے میں اسے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان کا خطبہ ختم ہوا تو ہمیں وہاں سے روانہ کر دیا گیا تاکہ وہ سعودی مہمانوں کے ساتھ تنہائی میں پرائیویٹ باتیں کر سکیں۔ مہمان خانے پہنچ کر میں نے سکھ کا سانس لیا۔

رات کو صدر نے ہمارے اعزاز میں عشائیہ دیا۔ مجھے انہوں نے اپنی میز پر بٹھایا۔ کھانے کے دوران میں انہوں نے پھر زور شور سے شریعت کے ساتھ اپنی محبت پر لیکچر دینا شروع کر دیا۔ جب کھانا آیا تو وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔

''میں آپ کو پاگل ڈکٹیٹر نظر آتا ہوں؟'' انہوں نے اچانک سوال کیا۔ میز پر بیٹھے تمام لوگوں نے ششدر ہو کر انہیں دیکھا۔ پھر سب نے کھانے پر نظریں جھکا لیں۔ میرا خون کھولنے لگا۔ کسی کا لحاظ کرنا میری سرشت میں نہیں ہے۔ میں کبھی لگی لپٹی نہیں رکھتا۔ میرا فوری ردعمل یہ تھا کہ میں چیخ کر کہوں ''جی ہاں۔'' مگر میں اپنا غصہ پی گیا اور چپ بیٹھا رہا کہ خاموشی کو نیم رضا سمجھا جاتا ہے۔

ضیاء الحق ناراض نہیں تھے۔ انہوں نے کہا، ''آپ نے اپنی کتاب Islamic Future میں مجھے فاتر العقل ڈکٹیٹر لکھا ہے۔'' انہوں نے اپنے ایک اردلی کو اشارہ کیا۔ وہ بھاگا بھاگا کتاب لے آیا۔ اب انہوں نے پڑھنا شروع کیا۔

''اگر عام مسلمان اسلامی حکمرانی کے نام سے خوف زدہ ہوتا ہے تو اس میں حیرت زدہ نہیں ہونا چاہیے۔ جب بھی کسی ملک جیسے پاکستان، لیبیا، یا سوڈان میں اسلامی حکومت قائم

کرنے کی کوشش کی گئی تو یہ شبہات صحیح ثابت ہوئے۔ ایک ہی تصویر بنی۔ کوئی فاتر العقل ڈکٹیٹر تخت پر بیٹھ گیا اور اعلان کر دیا کہ اسے خدا کی طرف سے عوام پر اسلام مسلط کرنے کا فریضہ سونپا گیا ہے۔ وہ پہلا کام یہ کرتا ہے کہ اسلامی سزائیں نافذ کرتا ہے۔ گویا اسلام سزاؤں سے شروع ہوتا ہے اور سزاؤں پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔ وہ برسرِ عام کوڑے مار کر یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ واقعی اسلام نافذ کر رہا ہے۔ بہت سے علما اور دینی جماعتیں اس کے اقدام کی حمایت کرتی ہیں۔ وہ عورتوں کو دوسرے درجہ کا انسان بنا دیتا ہے۔ وہ اسلامی نظریاتی کونسل قائم کرتا ہے اور شرعی عدالتیں بناتا ہے جہاں سرسری سماعت کے بعد فیصلے سنائے جاتے ہیں۔ کیا اس سے اچھی اسلام کی دعوت اور کوئی ہو سکتی ہے؟"

انہوں نے کتاب بند کی اور ہنسے۔ ان کے گرد بیٹھے تمام لوگ بھی ان کی ہنسی میں شامل ہو گئے۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ وہ میرے اوپر ہنس رہے ہیں یا اپنے آپ پر۔ پھر دوسری باتیں شروع ہو گئیں۔

کھانے کے بعد ضیاء الحق ایوان صدر کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ وہ روانہ ہونے والے ہر مہمان سے ہاتھ ملاتے۔ میری باری آئی تو انہوں نے میرے ہاتھ پر اپنا بایاں ہاتھ بھی رکھ دیا اور بولے "امید ہے ہم پھر ملیں گے۔ اگر ہم اس زندگی میں نہ مل سکے تو دوسری دنیا میں ضرور ملیں گے۔" اب ایک اردلی آیا اور میرے ہاتھ میں ایک تحفہ رکھ دیا۔ وہ سبز سنگ مرمر کا ٹیبل لیمپ تھا جو لکڑی کے باکس میں رکھا ہوا تھا اور وہ باکس سرخ مخمل میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ بہت ہی بھاری تھا۔ وصی اللہ خاں کو بھی ایسا ہی تحفہ ملا۔ میں نے اپنا تحفہ بھی انہی کو دے دیا کہ یہ میری طرف سے ہے۔ خاں نے وہ مجھے واپس کرتے ہوئے کہا "یہ تم ہی رکھو۔ اسے شریعت کا بوجھ سمجھ لو۔"

دوسرے دن ہمیں پاکستانی ائرفورس کے ہیلی کاپٹر میں پشاور لے جایا گیا۔ وہاں افغانستان میں لڑنے والے مجاہدین کے مختلف گروہوں کا اجلاس ہو رہا تھا۔ تاجک افغان لیڈر برہان الدین ربانی اس کی صدارت کر رہے تھے۔ کہا جا رہا تھا کہ افغانستان کی آزادی کے بعد وہی اس کے صدر ہوں گے۔ میں نے وہاں احمد شاہ مسعود کو دیکھا جو ربانی کے خاص آدمی تھے۔ اس کے علاوہ وہ حکمت یار اور پاکستان کی دینی جماعتوں کے چند لیڈر بھی وہاں موجود تھے۔ ایک لمبی داڑھی والا لمبا اور دبلا پتلا سعودی شخص ان میں سب سے نمایاں نظر آ رہا تھا۔ وہ تھا اسامہ بن لادن۔ وہ ایک شاہانہ انداز کے ساتھ بیٹھا تھا۔ سب سے زیادہ اسی کی عزت کی جا رہی تھی

افغانستان کی آزادی کے بعد وہاں اسلامی حکومت بنانے کے بارے میں بحث ہو رہی تھی۔ سب شریعت نافذ کرنے کی بات کر رہے تھے لیکن ربانی کے شیعہ گروپ اور حکمت یار اور سعودی عرب کے وہابی گروپ کے درمیان اختلافات تھے۔ معلوم ہوا کہ اصل اختلاف مذہبی نہیں سیاسی ہے۔ کیونکہ ربانی تنہا ہی حکومت پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ اس ساری بحث میں سب سے زیادہ جو لفظ بولا جا رہا تھا وہ تھا ''ناممکن''۔

ایک دو دن بعد ہی میں اس سے بور ہو گیا اور میں نے سوچا کہ سرکاری گاڑی کا فائدہ اٹھایا جائے۔ میں نے سوچا کہ اکوڑہ خٹک چلا جائے جہاں وہ مدرسہ ہے جس میں جہادی تیار کیے جاتے ہیں اور ضیاء الحق جس کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ میں دارالعلوم حقانیہ دیکھنا چاہتا تھا جو 1947 میں قائم کیا گیا تھا اور پاکستان میں سب سے قدیم دیوبندی درس گاہ ہے۔ اس کے مہتمم مولانا سمیع الحق ہیں جو پاکستان میں شریعت کے نفاذ کے لیے بہت سرگرم ہیں۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ ضیاء الحق کے نفاذ اسلام پروگرام کے معمار یہی سمیع الحق ہیں۔

دسمبر کے ایک ٹھنڈے دن میں دارالعلوم کی وسیع و عریض عمارت میں پہنچا۔ یہ دور دور تک پھیلی عمارت ہے جس میں کلاس روم ہیں، ہوسٹل ہیں اور بڑے بڑے ہال ہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم قرون وسطی میں پہنچ گئے ہیں۔ ہر طرف داڑھیاں ہی داڑھیاں تھیں۔ استاد اور طالب علم سب باریش تھے حتی کہ چودہ پندرہ سال کے لڑکے بھی بغیر داڑھی کے نہیں تھے۔ مولانا وہاں نہیں تھے۔ لیکن استادوں نے خوشی خوشی مجھے سب کچھ دکھایا۔ انہوں نے بتایا کہ اکثر طلبہ مفت تعلیم پاتے ہیں۔ بلکہ پندرہ سو طلبہ میں سے کئی کو تو وظیفہ بھی ملتا ہے۔ اسی لیے بہت سے پاکستانی طلبہ کے لیے مدرسہ تعلیم حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ انہوں نے بتایا کہ یہاں آٹھ سال کا کورس ہے۔ یہاں کے بہت سے فارغ التحصیل کئی سرکاری عہدوں پر کام کر رہے ہیں۔ جیسے عدلیہ، سول سروس اور فوج۔ بیرونی ملکوں سے بھی طالب علم یہاں آتے ہیں اور ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ یہاں اسلام کے خالص تصوّر کا ادراک کرتے ہیں۔'' انہوں نے کہا۔

''یہ خالص کتنا خالص ہوتا ہے؟'' میں نے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے سوال کیا۔

''ہمارے نصاب میں قرآن اور شریعت کو اہمیت دی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں ہر قسم کی آلائش سے پاک اور صحیح شریعت کی تعلیم دی جاتی ہے۔''

معلوم ہوا کہ قرآن، اس کی تفسیر، احادیث اور فقہ کے اصول رٹائے جاتے ہیں تا کہ طلبہ کو وہ حفظ ہو جائیں اور یہ اصول آٹھویں صدی کے مرتب کردہ ہیں۔

میں نے سوال کیا کہ ''کیا وہ نصاب پڑھایا جاتا ہے جو مجھے شیخ جعفر ادریس نے پڑھایا تھا۔ جس میں فلسفہ، منطق، علم کلام اور قرآن کی مختلف تفسیریں شامل ہیں؟'' فلسفہ کا سن کر اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور بولا ہم خالص شریعت پڑھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ریاضی اور فلکیات پڑھاتے ہیں۔''

میں نے ہمت کر کے پوچھ لیا کہ یہاں تصوّف بھی پڑھایا جاتا ہے؟ اس پر وہ پریشان ہو گئے۔ ''ہم آپ سے کہہ رہے ہیں کہ یہاں خالص شریعت پڑھائی جاتی ہے۔''

اور باتیں کرنے سے معلوم ہوا کہ یہاں شیعہ فکر کو بدعت خیال کیا جاتا ہے اور شیعوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ بلکہ وہ کہنے لگے کہ شیعوں کو تلقین کرنا چاہیے کہ سنّی عقیدہ اختیار کرلیں۔ آخر میں وہ معذرت کر کے کلاس روم میں چلے گئے۔

ایک طالب علم بڑے غور سے ہماری باتیں سن رہا تھا۔ جب استاد چلے گئے تو وہ میرے پاس آیا۔ وہ بیس پچیس سال کا ہوگا۔

''آپ شیعہ ہیں؟'' سلام کرنے کے بعد اس نے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''شیعہ مسلمان نہیں ہیں۔'' اس نے کسی جھجک کے بغیر کہا۔ ''وہ اسلامی ملک کے سچے شہری بھی نہیں ہیں۔ ہمیں ایسے امیر کی ضرورت ہے جو پاکستان میں سختی کے ساتھ شریعت نافذ کرے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''آپ پکے مسلمان ہیں؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''میں مسلمان ہوں۔'' میں نے کہا ''اب کچے پکے کا مجھے علم نہیں۔''

''اگر آپ مسلمان ہیں تو آپ کے داڑھی کیوں نہیں ہے؟''

''اس لیے کہ مسلمان ہونے کے لیے داڑھی ضروری نہیں ہے۔''

''مگر یہ تو سنّت ہے اور جو رسول اللہ ﷺ کی سنّت پر عمل نہیں کرتا وہ مسلمان نہیں ہے۔''

''تو تم اونٹ پر سواری کیوں نہیں کرتے؟''

میرے سوال پر وہ حیران رہ گیا۔ ''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''اونٹ کی سواری سنّت ہے۔ رسول اللہؐ نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ اونٹ کی سواری پر گزارا۔''

''مگر اب تو ہمارے پاس کاریں اور بسیں ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ اگر اس زمانے میں آج کی چیزیں موجود ہوتیں تو رسول اللہؐ وہ ضرور استعمال کرتے۔''

میں نے اسے دیکھا کہ شاید اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجائے۔ مگر وہ نظریں نیچی کیئے کھڑا تھا۔

''شاید تم نے سرمہ لگایا ہوا ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''یہ سنّت ہے۔''

''مگر تم جانتے ہو اس میں لیڈ (سیسہ) ہوتا ہے۔ اس سے تمہاری آنکھیں خراب ہو سکتی ہیں اور تمہارے جسم میں زہر پھیل سکتا ہے۔''

وہ چپ کھڑا رہا۔

''رسول اللہؐ نے بہت سے ایسے کام کیے جو ان کے زمانے کی پیداوار تھے۔ میرا خیال ہے کہ سنّت اصل میں وہ روح یا جذبہ ہے جس کی انہوں نے تلقین کی۔ مثلاً سخاوت، محبت و اخوت اور رواداری، ان لوگوں کو معاف کر دینا جنہوں نے انہیں اذیتیں پہنچائیں، بزرگوں کی عزت اور بچوں اور معاشرہ کے غریب و بے سہارا لوگوں سے شفقت اور ان کی عزت۔ انصاف مساوات اور احسان کے لیے ان کی تلقین۔ علم کے حصول کے لیے ہر ممکن کوشش۔ یہ ہے ان کی سنّت جس کی پیروی ہمیں کرنا چاہیے۔''

''تم کون ہو یہ بتانے والے کہ کیا سنّت ہے اور کیا سنّت نہیں ہے۔'' وہ طالب علم غصے میں چیخا۔ ''تمہارے تو داڑھی تک نہیں ہے۔''

پشاور واپس جاتے ہوئے میں خوف سے کانپ رہا تھا۔ کیا اسلامی فکر اور علم کی عظیم وراثت یہاں پہنچ چکی ہے؟ یہاں تو قرون وسطیٰ کی فکر راج کر رہی ہے۔ مدرسہ حقانیہ علم و فکر کا مرکز نہیں ہے یہ تو نفرت کی پنیری لگا رہا ہے۔ یہ پڑھے لکھے لوگ پیدا نہیں کر رہا ہے بلکہ ایسے تنگ نظر ملا پیدا کر رہا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ صرف ان کی فکر اور ان کا راستہ ہی صحیح راستہ ہے۔ وہ تو جلد ہی

اپنے مخالفوں کے خلاف جنگ شروع کر دیں گے اور یہ لوگ شیعوں کو ضرور کافر قرار دے دیں گے اور جلد ہی پاکستان کو جہنم بنا دیں گے۔ اس مدرسہ کے لوگوں میں مجھے جس طرح حس مزاح کا فقدان نظر آیا اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ لوگ تو بہت بڑا خطرہ بن سکتے ہیں۔

اسلام آباد سے ہمیں بیجنگ کے لیے پی آئی اے کی فلائٹ لینا تھی۔ مگر کسی وجہ سے اس فلائٹ میں تاخیر ہوگئی۔ اس لیے ہمیں چند دن اور وہاں ٹھہرنا پڑا۔ میں نے سرکاری مہمان خانہ اور سرکاری گاڑی چھوڑ دی اور یوں ہی گھومنا پھرنا شروع کر دیا۔ اسلام آباد نیا شہر ہے جو راولپنڈی کے ساتھ بنایا گیا ہے۔ وہاں آمد و رفت کا ذریعہ ویگن ہیں، یعنی فورڈ کی بڑی گاڑیاں جن میں بارہ آدمیوں کی گنجائش ہوتی ہے۔ مگر اسلام آباد اور راولپنڈی کے درمیان چلنے والی ویگنوں میں دوگنی سواریاں ٹھونس لی جاتی ہیں۔

میں نے ایک ویگن کو اشارہ کیا۔ وہ آہستہ ہوگئی اور اس میں سے ایک ہاتھ نکلا اور اس نے مجھے اندر گھسیٹ لیا۔ ''تم لوگ کسی کو اندر گھسیٹنے سے پہلے دیکھ کیوں نہیں لیتے؟'' کسی نے غصے میں کہا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی مگر میرا چہرہ تو دوسرے چہروں میں پھنسا ہوا تھا۔ اس علاقے کے ڈرائیور اور کنڈکٹر بہت سے انسانوں کو کم سے کم جگہ میں ٹھونسنے کا فن خوب جانتے ہیں۔ میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ جیسے بٹھا دیا گیا تھا ویسے ہی چپ چاپ بیٹھا رہا۔

راولپنڈی میں داخل ہونے سے پہلے ہی میں بڑی مشکل سے نیچے اُترا۔ اسلام آباد اور راولپنڈی میں بڑا فرق ہے۔ اسلام آباد چوڑی چوڑی سڑکوں، کھلے کھلے میدانوں اور صاف ستھری عمارتوں کا شہر ہے۔ جہاں سڑکوں پر ہجوم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے مقابلے میں راولپنڈی تنگ سڑکوں، تنگ گلیوں اور انسانوں کے ہجوم سے بھرا ہوا پرانا شہر ہے۔ یہ کسی منصوبے کے بغیر ہی بڑھتا چلا گیا ہے۔ شہر میں پٹھان زیادہ نظر آتے ہیں جو بہت ہی جفاکش اور جنگ جو لوگ ہیں۔ کھانے پینے کی چیزوں کی خوشبو سے مجھے بھوک لگنے لگی تھی اور گرد و غبار نے میری پیاس بڑھا دی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو ان لوگوں میں شامل کرنے کے لیے گنّے کے رس کا ایک گلاس خریدا۔ وہ رس صرف انتہائی میٹھا ہی نہیں تھا بلکہ اس میں سڑک کی پوری زندگی یعنی دھول، پسینہ اور گاڑیوں کا دھواں سب کچھ ہی شامل تھا۔ وہاں سے تر و تازہ ہو کر میں کباب کی دکان پر گیا۔ کباب بنانے والا ایک ساتھ تین کام کر رہا تھا۔ وہ قیمہ کے کباب بنا رہا تھا، انہیں

سیخ پر لگا رہا تھا، پھر کوئلوں پر رکھ رہا تھا اور سکے ہوئے کباب سیخ سے اتار رہا تھا اور یہ سب کام نہایت تیزی کے ساتھ ایک خاص لے میں کر رہا تھا۔ میں نے ایک پلیٹ کباب کھائے۔ کھا چکا تو برابر والے اسٹال کے مالک نے مجھے گاجر کا حلوہ پیش کیا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اس شرط پر حلوہ کھاؤں گا کہ اس پر تیرتا گھی اتار دے۔ خیر میں نے حلوہ بھی کھایا اور اس کے بعد انار کا جوس پیا۔

میں کھا رہا تھا تو میں نے محسوس کیا کہ سڑک پار بیٹھا ایک حجام مجھے دیکھ رہا ہے۔ وہ سڑک پر ہی اپنی دکان لگائے بیٹھا تھا۔ میں یونہی اس کے پاس چلا گیا۔

''یہاں بیٹھ جاؤ صاحب۔'' حجام نے لکڑی کی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کھانے کے بعد جیسے مجھے شیو کی بھی ضرورت تھی۔ میں بیٹھ گیا۔ اس نے ایک تولیہ میری گردن پر باندھا۔ وہ تولیہ پہلے بھی کئی اور لوگوں کی گردن پر لپیٹا جا چکا تھا۔

''لوگ مجھے رستم کہتے ہیں۔'' حجام بولا۔ پھر اس نے صابن کی پیالی میں گرم پانی ڈالا۔ اس کے بعد اس میں چند بالوں والا برش گھما کر میرے چہرے پر صابن لگایا۔ پھر اپنے ریزر میں بلیڈ لگایا۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھ لیا تھا کہ وہ آدھا بلیڈ لگا رہا ہے۔ باقی آدھا بلیڈ اس نے پھر کام میں لانے کے لیے رکھ لیا تھا۔ یہ سب کام وہ اسی تیزی سے کر رہا تھا جس تیزی سے کباب لگانے والے نے کباب لگائے تھے۔ وہ سب کام کر چکا تو اس نے بائیں ہاتھ سے میرا سر پکڑا اور میرے چہرے کے بالوں پر حملہ کر دیا۔

رستم ایک ایک بال پر خاص توجہ دے رہا تھا۔ اگر اس کا استرا پہلی بار بال نہ کاٹتا تو وہ اس پر دوبارہ استرا چلاتا۔ وہ اتنی محنت سے اپنا کام کر رہا تھا کہ میں گھبرا گیا۔ اور میں نے چیخ ماری ''اُف، کیا تم ہر ایک کا شیو ایسے ہی بناتے ہو؟''

''میں تو اس لیے اتنی محنت کر رہا ہوں کہ آپ پھر بھی میرے پاس ہی آئیں۔'' رستم نے کہا۔ ''کئی گاہک تو ایسے ہیں کہ میں بالکل نہیں چاہتا کہ وہ یہاں آئیں۔''

''وہ گاہک کون ہیں؟''

''وہ زیادہ تر فوجی ہیں۔ ہم ان سے کہہ بھی نہیں سکتے کہ ہم ان کی حکومت کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں انھوں نے تیسری مرتبہ حکومت پر قبضہ کیا ہے۔ اب اللہ ہی جانتا ہے کہ ان کی حکومت کیسے ختم ہوگی۔ آپ سوچ نہیں سکتے کہ میں جب ان کا شیو بناتا

ہوں تو میرے دل میں کیا کیا آتا ہے۔"

"تم ضیاء الحق کو پسند نہیں کرتے؟ میں نے سوال کیا۔

جیسے ہی ضیاء الحق میرے مُنھ سے نکلا رستم کے استرے نے میرا گال زخمی کر دیا۔

"معاف کرنا صاحب، مگر گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میرے پاس پھٹکری ہے۔ اس سے خون بھی رک جائے گا اور زخم بھی ٹھیک ہو جائے گا۔"

ابھی میں کچھ کہہ بھی نہیں پایا تھا کہ اس نے میرے گالوں پر پھٹکری لگانا شروع کر دی۔ مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے میرے چہرے پر آگ لگا دی ہو۔ میں تکلیف سے چیخا۔ اب میں جتنا چیختا تھا اتنا ہی وہ اور پھٹکری لگاتا۔ لیکن خون بند نہیں ہوا۔

"اوہو،" اب رستم بولا "میں تو بھول ہی گیا تھا آپ یہاں کے رہنے والے نہیں ہیں۔ جو لوگ یہاں سے دوسرے ملکوں میں چلے گئے ہیں ان پر اس کا اثر نہیں ہوتا۔ اس لیے اب میں اس کا دوسرا علاج کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے جانسن بے بی پاؤڈر کا ڈبہ نکالا اور میرے چہرے پر پاؤڈر چھڑکنے لگا۔

"یہ دیکھو صاحب، خون بند ہو گیا۔" یہ کہہ کر اس نے ایک ٹوٹا ہوا آئینہ میرے سامنے کر دیا۔ میں نے آئینے میں ایک اجنبی چہرہ دیکھا۔ یوں لگا جیسے لوگ پلاسٹک سرجری کے بعد پٹیاں کھلنے پر نظر آتے ہیں۔ سفید پاؤڈر کے غبار میں میرے گالوں پر کئی لال لال زخم نظر آ رہے تھے۔ میں نے دہشت زدہ ہو کر اپنا چہرہ پھر دیکھا۔

"شیو پورا ہو جائے گا تو آپ بالکل ننھے بچّے معلوم ہوں گے۔"

اس نے میری کرسی گھسیٹی اور گیلے تولیہ سے میرا چہرہ صاف کرنے لگا۔ وہ ایسے کر رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

"صاحب، آپ امریکہ میں رہتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

نہیں، میں لندن میں رہتا ہوں۔"

"آہا،" اس نے آہا کو خوب کھینچا۔ جیسے وہ برطانیہ، اس کی ملکہ، پارلیمنٹ اور مسز تھیچر سب کو خوب جانتا ہو۔

میں نے محض موضوع بدلنے کے لیے اس سے پوچھا کہ وہ پاکستان میں شریعت نافذ کرنے کے حق میں ہے؟

شریعت کے لفظ نے بھی رستم پر وہی اثر کیا جو ضیاء الحق کے نام نے کیا تھا۔ وہ تھرا سا گیا اور جیسے میرے چہرے پر ایک اور زخم لگ گیا۔ ''کیا بات ہے؟'' میں اچھل پڑا۔

''معاف کرنا صاحب، آپ ایسی باتیں کر رہے ہیں جن پر بہت سوچنے کی ضرورت ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''آپ خود ہی سوچ لیجے۔ اگر داڑھی والے ہمارے بادشاہ بن گئے تو ہمارا کیا ہوگا؟ میں تو عزت کے ساتھ زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ ہمارے بچوں کو اچھی تعلیم ملے اور ہمارے سر پر چھت ہو۔ ان کی شریعت میں تو کوڑے، سر کاٹنا، زبردستی داڑھی رکھوانا اور میری غریب بیوی کو پردے میں بند کرنا ہی لکھا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے تم شریعت کے خلاف ہو؟''

''نہیں صاحب، میں شریعت کے خلاف نہیں ہوں۔ میں تو ان داڑھی والوں کی شریعت کے خلاف ہوں۔ ان کی شریعت میں معافی، رحم اور سخاوت ہی نہیں ہے۔ وہ تو ہر چیز پر پابندی لگانا چاہتے ہیں سینما، میوزک اور ٹیلی وژن سب بند۔ ہم تو فوج اور ملا سب کے خلاف ہیں جو زبردستی ہمارے اوپر یہ سب تھوپنا چاہتے ہیں۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں بھی فوج اور داڑھی والوں اور ان کی شریعت کے خلاف ہوں۔''

''آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔'' رستم خوش ہوگیا۔ ''اب تو ہم بھائی بھائی ہیں۔ میں سمجھا تھا آپ ان لندن ریٹرن لوگوں میں سے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ شریعت صابن کی ٹکیہ ہے کہ بدن پر رگڑتے رہو، سب کچھ خود بخود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔''

اب وہ بالکل ہی بدل گیا اور بڑی نرمی کے ساتھ اپنا کام کرنے لگا۔ پھر اس نے اولڈ اسپائس آفٹر شیو اپنے ہاتھوں پر ڈالا اور میرے چہرے پر ملنے لگا۔ یہ کام بھی ختم ہوگیا تو میں بڑی مشکل سے اس کی کرسی سے اترا۔ ''کیا دے دوں؟''

''ایک روپیہ صاحب، آپ ہمارے بھائی ہیں۔ آپ کل بھی آئیں گے نا؟''

میں دوبارہ وہاں جانے کے خیال سے ہی گھبرا گیا۔ ''یہ لو، سو روپے لے لو۔ اس طرح تم آئندہ ننانوے دن میرا شیو بنانے سے بچ جاؤ گے۔''

رستم نے سو روپے کا نوٹ لیتے ہوئے افسوس کے ساتھ کہا، ''معاف کر دینا صاحب،

میں نے آپ کا اسپیشل شیو بنا دیا۔"

"کوئی بات نہیں۔ آئندہ میں بھی خیال رکھوں گا۔"

میں چلنے لگا تو وہ بولا۔"اگر آپ اسلام آباد جا رہے ہیں تو ٹیکسی نہ لینا ویگن پکڑنا۔"

سامنے ویگن جا رہی تھی۔ میں اس کی طرف بھاگا اور چلتی ویگن میں چڑھ گیا۔ میرے پیچھے ایک اور آدمی بھی چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر رستم کو ہاتھ ہلانے کی کوشش کی مگر وہاں وہ آدمی دروازے کے ساتھ لٹکا ہوا تھا، کنڈکٹر نے اسے اوپر کھینچا تو اس کا تہبند اس کے ہاتھ میں آ گیا اور وہ آدمی چیخا، "اوئے دیکھتا نہیں" اس پر کنڈکٹر نے کہا دھوتی باندھ کر ویگن میں کیوں چڑھتے ہو۔ صاحب کی طرح پتلون کیوں نہیں پہنتے۔ میں نے گھوم کر دیکھا تو وہ آدمی ایک ہاتھ سے اپنا تہبند پکڑے ہوئے تھا اور دوسرے ہاتھ سے سیٹ پکڑے کھڑا تھا۔ وہ آدھا ننگا ہو چکا تھا۔

دوسرے دن ہم چین روانہ ہو گئے۔ چاؤ یانگ کے خوش حال علاقے میں دریائے لیانگما کے کنارے کھن لن ہوٹل میں چین کے مسلمانوں کی کانفرنس ہو رہی تھی۔ پورے چین سے مسلم نمائندے آئے ہوئے تھے۔ وہ چین میں مسلمانوں کے حالات پر غور کر رہے تھے۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا تھا جیسے چین کے مسلمانوں کو کوئی بھی پریشانی نہیں ہے۔ کم سے کم چینی اسلامی ایسوسی ایشن کے نمائندوں کی باتوں سے یہی لگا۔ ثقافتی انقلاب کا زمانہ ختم ہو چکا تھا اور مذہبی مقامات پر حملے بند ہو گئے تھے۔ اب رواداری کا دور دورہ تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ چینی مسلمان ان اپنی مسجدوں کی دیکھ بھال خود کر سکیں گے بلکہ نئی مسجدیں بھی بنا سکیں گے۔ وہ اپنی مذہبی تقریبات کر سکیں گے اور حج پر بھی جا سکیں گے۔ سرکاری پالیسی یہ تھی اگر مسلمان حکومت کے معاملات میں دخل نہ دیں تو حکومت بھی ان کے مفادات کا تحفظ کرے گی۔

لیکن سب اچھا نہیں تھا۔ مسلمانوں کے اپنے اندر اور حکومت کے ساتھ ان کی چپقلش موجود تھی اور اس کی وجہ شریعت تھی۔ جب بھی کوئی کانفرنس سے باہر بات کرتا تو سرگوشیوں میں شریعت نافذ کرنے کی بات کرتا۔ پہلے دن تو میں کانفرنس کی کارروائی سنتا رہا۔ دوسرے دن میں نے ان لوگوں سے باتیں شروع کیں جو دوسری باتیں کرتے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت اپنے آپ کو "گیدیمو" کہتی ہے۔ گیدیمو عربی کے لفظ قدیم کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ چینی مسلمانوں کی اکثریت حنفی سنی ہے۔ وہ راسخ العقیدہ سنی ہیں جو شریعت کے نفاذ پر

بہت اصرار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شریعت کے بغیر ہم ادھورے مسلمان ہیں۔ لیکن کانفرنس میں صوفیاء کے سلسلوں سے تعلق رکھنے والے بھی تھے۔ یہ شمال مغربی چین سے آئے تھے۔ یہ اپنے آپ کو ''مین ہوان'' کہتے تھے جس کا مطلب ہے صوفیاء کا سلسلہ۔ ان کا دعویٰ تھا اور میرا خیال ہے صحیح دعویٰ تھا کہ ثقافتی انقلاب کے زمانے میں انہوں نے ہی اسلام کی حفاظت کی۔ وہ کہتے تھے کہ چینی مسلمانوں کی شناخت شریعت سے نہیں طریقت سے مکمل ہوتی ہے، جو صوفیاء کا طریقہ ہے۔ مجھے حیرت اس بات پر ہوئی کہ میں بوڑھے اور جوان جن چینی مسلمانوں سے بھی ملا وہ سب روانی کے ساتھ عربی بولتے تھے۔

تمام کانفرنسوں کی طرح اس میں بھی کلچرل شو، کھانے، دیوار چین، اور مساجد کے دورے شامل تھے۔ جمعہ کی نماز ہم نے چینی اسلامی ایسوسی ایشن کے نائب سیکریٹری جنرل امام سلیمان گونگ چجی کے پیچھے پڑھی۔ ترجمان کے ذریعہ امام صاحب نے ہمیں چین میں مسلمانوں کی تاریخ بتائی۔ یہ بہت ہی مشکل مرحلہ تھا۔ مگر جہاں تک ہم سمجھ سکے وہ یہ تھا کہ اسلام کی آمد کے ایک سو سال بعد مسلمان چین آگئے تھے۔ اس کا ثبوت چوان زوشہر کے ان مقبروں سے ملا جو تینگ بادشاہوں کے دور میں ساتویں صدی میں بنائے گئے تھے۔ اس کے بعد سونگ بادشاہوں کے دور (۹۶۰۔۱۲۷۹) میں تین سو سال تک مسلمان تاجروں سیاحوں اور علما کے قافلے چین آتے رہے اور بہت سے یہاں آباد ہوگئے۔ مسلمانوں نے چین میں کاغذ بنانا سیکھا اور پھر یہ فن وہ سمرقند، بغداد، مراکش، فیض اور قرطبہ لے گئے۔ وہاں کاغذ بنانے کے کارخانے لگائے گئے۔ سب سے نمایاں سیاح ابن بطوطہ تھا جو تیرھویں صدی میں چین آیا۔ چین میں اکثر مسلمان ''ہوئی'' قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں اکثر ان تاجروں اور سیاحوں کی اولاد ہیں جو نویں اور دسویں صدی میں عرب اور ایران سے یہاں آئے تھے۔ مرد لمبے اور خوبصورت ہیں اور عورتیں دبلی پتلی نازک سی ہیں۔ سب سے پرانی مسجد ہوائے شنگ ہے جو گوانگزو میں ہے۔ یہ مسجد ساتویں صدی کے اوائل میں تعمیر کی گئی تھی۔ مقامی زبان میں اسے روشنی کا پگوڈا کہتے ہیں کیونکہ کسی زمانے میں اس کے میناروں سے بحری جہازوں کو روشنی دکھائی جاتی تھی۔

امام سلیمان کو پوری تاریخ یاد تھی لیکن چین میں کسی کو تاریخ کے ساتھ لگاؤ کا خبط نہیں ہے۔ امام صاحب نے اب اپنا موضوع بدلا اور قدیم زمانے کی تاریخ سے نئے دور میں آگئے۔ انہوں نے بتایا کہ اس وقت چین میں چھ کروڑ مسلمان ہیں۔ صرف بیجنگ میں پچاس مسجدیں

ہیں ۔ بے شمار حلال ریستوراں ہیں، اور کئی محلے ایسے ہیں جہاں صرف مسلمان ہی رہتے ہیں۔ شہر کی ایک مشہور سڑک وونگ فو شنگ میں جو اونچی عمارت ہے اس میں صرف مسلمان ہی رہتے ہیں۔ الحاج عبد الرحیم ہورونی نے ۱۶۰۹ء میں بیجنگ میں پہلا مدرسہ قائم کیا تھا۔ اس کے بعد ایک ماہر فلکیات جمال الدین نے ایک رصدگاہ بنائی تھی جو اب تک کام کر رہی ہے۔ ثقافتی انقلاب کے زمانے (۷۶۔۱۹۶۶ء) میں مسلمانوں پر بہت ظلم کیے گئے اور مسلم ایسوسی ایشن جو ۱۹۵۱ء میں قائم کی گئی تھی اس پر پابندی لگا دی گئی ۔ لیکن گینگ آف فور کے خاتمے کے بعد مسلمان پھر منظم ہوگئے اور اسلام کا احیا ہوا ۔ حال ہی میں سعودی عرب کی امداد سے ایک عالی شان اسلامی مرکز اور ایسوسی ایشن کا دفتر تعمیر کیا گیا ہے۔ ایک اسلامی میوزیم زیر تعمیر ہے۔ مصر کے شاہ فواد نے جو لائبریری بنوائی تھی وہ دوبارہ کھول دی گئی ہے۔ ۱۹۸۲ء میں بیجنگ یونیورسٹی میں ایک اسلامی انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا ہے ۔ بیجنگ کی آٹھوں یونیورسٹیوں میں عربی کے شعبے ہیں اور غیر ملکی زبانوں کے کئی دوسرے اداروں میں بھی عربی پڑھائی جاتی ہے ۔ امام سلیمان نے سرسری طور پر کہا کہ آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ ہمارے اکثر نوجوان عربی بولتے ہیں۔ یہ بات مجھے پہلے ہی معلوم ہو چکی تھی۔

ہم نیوجی اسٹریٹ کی مسجد پہنچے تو خطبہ شروع ہو چکا تھا۔ امام سلیمان ہمیں پہلے ہی بتا چکے تھے کہ یہ مسجد ۹۹۶ء میں تعمیر ہوئی تھی ۔ مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی ۔ مجھے دروازے کے قریب جگہ ملی۔ یہ مسجد کسی مسجد سے زیادہ پگوڈا معلوم ہوتی ہے بلکہ وہ کئی پگوڈا ہیں کیونکہ مسجد سے ملحق اس کی کئی اور عمارتیں بھی ہیں۔ لیکن اندر جانے کے بعد یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ یہ چین کی مسجد ہے۔ سوائے گنبد کے وہ ہماری عام مسجدوں کی طرح ہی ہے ۔ چھت پر پیڑ پودوں کے نقش ہیں اور دیواروں پر قرآنی خطاطی کے ساتھ کنول کے پھول نقش ہیں ۔

نماز کے بعد میں نوجوانوں کی محفل میں شامل ہوگیا۔ وہ سب کسی نہ کسی ادارے کے شعبۂ عربی سے تعلق رکھتے تھے۔ ''آپ لوگ عربی پر اتنی توجہ کیوں دیتے ہیں؟'' میں نے ان سے سوال کیا۔

''یہ قرآن کی زبان ہے۔'' ایک نوجوان نے جواب دیا جس کی داڑھی کے چند بال ہی تھے ۔ ''عربی کے بغیر ہم قرآن نہیں سمجھ سکتے اور قرآن سمجھے بغیر ہم اپنی زندگی شریعت کے مطابق کیسے ڈھال سکتے ہیں ۔''

ایک لڑکی جو چین کے حساب سے بہت ہی لمبی تھی، بولی ''اب ہر شخص اسلام کے عوامی کردار کا قائل ہو گیا ہے۔ ننکشیا ہوئی کے نیم خود مختار علاقے کے شہر ین چوان میں، جہاں سے میں آئی ہوں، ہر آدمی مانتا ہے کہ اسلام روحانی افیون نہیں ہے اور نہ توہمات اور جہالت کا مذہب ہے بلکہ وہ ایسا ضابطۂ اخلاق ہے جو معاشرے کے اخلاق اور معاشی ترقی کو فروغ دیتا ہے۔ اب کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کو بھی ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ مذاہب کا احترام کریں اور مسجدوں میں کمیونزم کی تبلیغ نہ کریں۔ ۱۹۷۸ء کے بعد سے اس علاقے میں دو ہزار دو سو مسجدیں تعمیر کی گئی ہیں اور ہر ایک ہزار مسلمانوں کے گاؤں میں مسجد ہے۔ ہر مسجد میں سند یافتہ امام ہیں جو عربی بول سکتے ہیں۔ وہ قرآن اور اسلام کی تعلیم دیتے ہیں۔''

''آپ نے کہا کہ آپ شریعت نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

''ہم شریعت کے مطابق زندگی گزارنا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہمارے خاندانی معاملات شریعت کے مطابق طے کیے جائیں۔ ہم اسلامی سزائیں رائج کرنا چاہتے ہیں۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''آپ سعودی عرب کی طرح بننا چاہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

اس پر ان طلبہ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ اس طرح کے سوال جواب پر حیران ہو رہے تھے۔ ''ہم دوسرے اسلامی معاشروں کی طرح بننا چاہتے ہیں۔'' ان سب نے ایک ساتھ جواب دیا۔ پھر لمبی لڑکی نے کہا۔ ''ہم پوری زندگی اسلام کے مطابق گزارنا چاہتے ہیں۔ صرف اتنی سی نہیں جو سرکاری اہل کار ہمیں سمجھاتے ہیں۔''

وہاں دو پاکستانی بھی آ گئے۔ معلوم ہوا کہ وہ پاکستانی سفارت خانے میں عہدیدار ہیں۔ کھانے پر سلیم اور اقبال صاحب نے ہم سے کہا کہ آپ کو گاؤں بھی جانا چاہیے تاکہ چینی اسلام کو قریب سے دیکھ سکیں۔ اقبال صاحب سفارت خانے میں فرسٹ سیکریٹری تھے اور انہوں نے سفارت خانے کی طرف سے میرے دورے کا انتظام کر دیا۔ مجھے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آیا۔

کانفرنس کے بعد میں نے اپنے دوستوں اور ہوٹل کو چھوڑا اور سستے سے گیسٹ ہاؤس میں چلا گیا۔ کانفرنس کے دوران میں بیجنگ کی ناردرن جیاتنگ یونیورسٹی میں انگریزی کی خوبصورت خاتون لیکچرر عائشہ لنگ فینگ سے دوستی ہو گئی تھی۔ وہ ہو گی کوئی بیس پچیس سال کی۔ وہ اپنے آپ کو ہوئی نسل سے کہتی تھی۔ یغور اور قازق مسلمان تو خاص خاص علاقوں میں رہتے

ہیں ہوئی مسلمان پورے چین میں پھیلے ہوئے ہیں ۔ وہ جہاں رہتے ہیں وہاں کی مقامی چینی زبان ہی بولتے ہیں ۔ عائشہ کچھ رنجیدہ سی تھی کہ ایک نوجوان نے اس سے منگنی کر کے توڑ دی تھی ۔ چین میں اسلام کی تاریخ کے موضوع پر ہونے والے ایک اجلاس میں عائشہ نے مجھ سے کہا ''اگر آپ برا نہ مانیں تو کیا میں آپ کی دوست بن سکتی ہوں ۔'' میں نے کہا'' بالکل برا نہیں مانوں گا مجھے تو افسردہ لوگوں سے بہت لگاؤ محسوس ہوتا ہے ۔'' اس کے بعد وہ میرے ساتھ ہی بیٹھتی ۔ اب وہ میری ترجمان بن گئی تھی ۔ وہ ہر صبح مجھے گیسٹ ہاؤس سے لیتی اور بیجنگ کے مسلم علاقوں کی سیر کراتی ۔ وہ مجھے کئی مدرسوں میں لے گئی اور چنگ زین سی (یعنی عبادت گاہ، یعنی مسجدیں) دکھائیں ۔ ہم نے مین ہوان صوفی سلسلے کی ذکر کی محفل میں بھی شرکت کی ۔ ایک دن وہ کہنے لگی ۔ میں مدرسے اور مسجدیں گھوم گھوم کر تنگ آ گئی ہوں، اب کچھ نئی بات ہونا چاہیے ۔ آپ قدیم شاہی محل اور دیوار چین کے شیرٹن ہوٹل میں ایک بار پھر نہیں چلیں گے ؟''

''نہیں تو ۔'' میں نے جواب دیا ۔

'' تو پھر گالف کھیلیں ۔ اب بیجنگ میں اٹھارہ ہول اور بہتر پار کا انٹرنیشنل معیار کا گالف کلب ہے ۔ اس میں جاپانی ہماری مدد کر رہے ہیں ۔''

''اور کوئی مشورہ ؟''

'' تو پھر ہم نارتھ چائنا انٹرنیشنل شوٹنگ اکیڈمی چل سکتے ہیں ۔ وہ دنیا بھر میں مشہور ہے ۔ آپ ہر قسم کی رائفل ۔ سب مشین گن، اینٹی ایئر کرافٹ گن حتی کی اینٹی ٹینک راکٹ لانچر چلا سکتے ہیں ۔''

''جنگی کھیلوں سے کم کوئی کام نہیں ہو سکتا ؟''

''اچھا تو اسٹاک ایکسچینج چلتے ہیں ۔ میں اپنے دوست کے ساتھ چند مہینے پہلے وہاں گئی تھی ۔ وہاں بہت مزہ آتا ہے ۔''

''کسی اور جگہ نہیں چل سکتے ؟''

عائشہ نے سوچنا شروع کیا ۔ میں نے دیکھا کہ ہوٹل کی لابی میں کچھ گڑبڑ سی ہو رہی ہے ۔ ''ہاں، انٹرنیشنل ہوٹل میں فیشن شو ہو رہا ہے ۔ چلو وہ دیکھ لیں ۔'' اس نے کہا ۔

''چلو پہلے ہم یہ تو دیکھیں کہ وہاں کیا ہنگامہ ہو رہا ہے ۔'' میں نے کہا ۔ ہم ہجوم کی طرف گئے ۔ ایک بہت ہی بوڑھا اور انتہائی دبلا پتلا چینی ایک قدیم فن جیگا تنگ کا مظاہرہ کر رہا تھا ۔

ایک نوجوان خالص امریکی انگریزی میں بتا رہا تھا کہ وہ بوڑھا کیا کر رہا ہے۔ دیکھنے والوں میں اکثریت غیر ملکی سیاحوں کی تھی۔ ''آج چین میں جیگا نگ کے اور ہی معنی ہیں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ سائنٹفک ٹیسٹ کے بعد اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اس کے ذریعہ لاکھوں آدمی ایک بالکل ہی نیا روحانی تجربہ حاصل کرتے ہیں۔ یہ مغرب کے مذہبی تجربہ اور توہماتی جادوٹونے سے بالکل الگ چیز ہے۔ اب زیادہ سے زیادہ دانشور اور سائنس داں اسے قبول کر رہے ہیں۔ اس میں خیال اور مادہ کے درمیان تعامل کے امکانات کا راستہ کھلتا ہے۔'' معلوم ہوا کہ وہ بوڑھا جیگا نگ کا ماسٹر ہے۔ وہاں جیگا نگ کے چھ بڑے مکتبۂ فکر ہیں۔ ان تاؤ، بودھ، کنفیوشس، میڈیکل، ووشو (مارشل آرٹ) اور ایک بیناما کھاڑہ ہے۔ اس نے بتایا کہ اس وقت سینتیس یونیورسٹیوں میں یہ فن سکھایا جاتا ہے اور پانچ کروڑ سے زیادہ لوگ ہر روز اس کی پریکٹس کرتے ہیں۔ اس سے کئی بیماریاں دور ہوجاتی ہیں۔ اس سے صحت اچھی ہوتی ہے اور وہ کینسر بھی ٹھیک ہوجاتا ہے، آپریشن کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس فن کے ماہروں نے بیماروں پر ''وائی جی'' (باہر کی ہوا) پھونکنے میں بڑی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔'' وہاں لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ میں بھی اس میں کھڑا ہوگیا۔

''یہاں کھڑا ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے'' عائشہ نے مجھے گھسیٹتے ہوئے کہا، ''یہ وائی جی تو میں بھی کرسکتی ہوں۔ آخر میں کاہے کے لیے ہوں۔''

مجھے یہ خیال پسند آیا اور میں اس کے ساتھ چل دیا۔ اس نے مجھے ہوٹل کے ایک پرسکون سے کونے میں کرسی پر بٹھا دیا۔ پھر اس نے میرے چہرے کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ کیے اور آہستہ آہستہ اوپر سے نیچے کی طرف ہاتھ لے کر چلی۔ وہ میرے جسم کو نہیں چھو رہی تھی۔ ہاتھ اوپر اوپر ہی چل رہے تھے۔ اب اس نے کہا آنکھیں بند کرلو۔ اس کے بعد وہ اسی طرح میرے سر سے پیروں کی انگلیوں تک اپنے ہاتھ گھماتی رہی۔ چالیس منٹ وہ ایسا کرتی رہی۔ یہ عمل ختم ہوا تو مجھے اپنے جسم میں ایک عجیب قسم کی سنسنی سی محسوس ہوئی۔ میں تروتازہ ہوگیا تھا اور مجھے بھوک لگنے لگی تھی۔

''بہت بہت شکریہ۔ اب مجھے جب بھی جیگا نگ کی ضرورت ہوگی تمہارے پاس آجایا کروں گا۔ تم کس مکتبے سے تعلق رکھتی ہو؟'' میں نے کہا۔

''بے نام۔'' اس نے کہا اور ہم دونوں ہنس پڑے۔

''چلو کھانا کھاتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اچھا خیال ہے۔'' عائشہ بولی۔ ''میں آپ کو خاص کھانا کھلاؤں گی۔''

ہم نے ایک بڑی سی ٹیکسی لی جو ادھر سے جا رہی تھی۔ تیانن من چوک کے جنوب مغرب میں ٹیکسی رکی اور عائشہ نے اتر کر نعرہ لگایا ''یہ دنیا کا سب سے بڑا کے ایف سی ریستوراں ہے۔ یہ اسی ہفتے کھلا ہے۔'' ہم اندر گئے۔ عائشہ نے ایک بورڈ پر اس کی تفصیل پڑھنا شروع کی۔ ''اس کی تین منزلیں ہیں اور اس کا رقبہ ایک ہزار اسی مربع میٹر ہے۔ اور اس میں بیک وقت پانچ سو آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ اس کا آٹو میٹک کوکر ایک گھنٹے میں دو ہزار تین سو پیس پکا سکتا ہے اور ایک ہزار پیس فرائی کر سکتا ہے۔ ایک عام دن ایک ہزار آدمی فی گھنٹہ یہاں کھانا کھاتے ہیں۔ ہفتہ اتوار کو یہ تعداد ایک ہزار آٹھ سو سے دو ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔ روزانہ ایک لاکھ سے زیادہ انسان اس ریستوراں کے سامنے سے گزرتے ہیں۔''

دوسرے دن وہ صبح ہی صبح آ گئی۔ ''آج میں آپ کو ویڈیو ریکارڈنگ کے لیے لے جاؤں گی۔''

''کیسی ویڈیو ریکارڈنگ؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''یونیورسٹی سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ایک عورت نے یہ کام شروع کر رکھا ہے۔'' اس نے وضاحت کی۔ ''وہ عورتوں سے تین یوآن اور مردوں سے تیرہ یوآن لیتی ہے۔''

''کس کام کے لیے؟''

''اصل میں ہم ایک کلر کیمرہ کے سامنے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ وہ فلم وہ اپنے دوسرے گاہکوں کو دکھاتی ہے۔ اس طرح عورت اور مرد ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ یہ جدید ٹیکنالوجی ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ یہ کمپیوٹر پر جوڑے ملانے والا طریقہ ہے۔ یہاں اس نے یہ شکل اختیار کر لی ہے۔

''مگر ہمیں اس کی کیا ضرورت ہے؟'' میں نے عائشہ سے کہا۔

''اس طرح یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ عورت اور مرد ایک دوسرے کے لیے موزوں ہیں یا نہیں۔'' عائشہ بولی۔

اب میں سمجھا کہ یہ کیا کھیل ہو رہا ہے۔ ''عائشہ'' میں نے کہا ''میں تو شادی شدہ ہوں۔''

اس نے پیار سے میرا ہاتھ پکڑا اور بولی ''شریعت میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا بازو میرے گرد ڈالا اور اپنا سر میرے کاندھے پر رکھ دیا۔ اور سرگوشی میں کہا ''میں آپ کی دوسری بیوی بن سکتی ہوں۔''

میں گھبرا کے پیچھے ہٹ گیا ''نہیں نہیں، میں شریعت کے اس حصے کو نہیں مانتا۔''

عائشہ نے حیرت اور صدمے کے جذبات کے ساتھ مجھے دیکھا۔ ''یعنی آپ سچے مسلمان نہیں ہیں؟ تو پھر آپ مدرسوں اور مسجدوں میں کیوں گھومتے پھر رہے ہیں۔''

''دیکھو'' میں نے اسے سمجھایا ''شریعت کی تمام باتیں مانے بغیر بھی کوئی مسلمان ہوسکتا ہے۔''

وہ پریشان سی ہوگئی اور مایوس بھی۔ اس کے بعد وہ تن کر کھڑی ہوگئی اور زور زور سے بولنے لگی۔ ''عرب بھائی تو ہمیشہ دوسری اور تیسری بیوی کی تلاش میں رہتے ہیں اور تم صرف اس شریعت کو مانتے ہو جو تمہارے مطلب کی ہے۔''

میں اسے شریعت کے بارے میں سمجھا رہا تھا تو پاکستانی سفارت خانے کے لوگ بھی وہاں آگئے۔ میں کہہ رہا تھا کہ شریعت الوہی قانون نہیں ہے۔ اسلام میں اگر کوئی چیز الوہی ہے تو وہ قرآن ہے۔ شریعت انسان کے وضع کیے ہوئے اصول ہیں۔ یہ کوشش تھی ایک خاص تناظر میں الوہی قوانین کو سمجھنے کی اور خاص تناظر تھا آٹھویں صدی کا مسلم معاشرہ۔ ہمیں اپنے معاشرتی تناظر میں شریعت کو سمجھنا چاہیے اور اس سے اصول وضع کرنا چاہئیں۔

پاکستانیوں نے مجھ سے کہا۔ جلدی کرو۔ اگر تم مسلمانوں کے گاؤں دیکھنا چاہتے ہو تو جلدی چلو۔ میں نے عائشہ کو افسردہ چھوڑا اور ان کے ساتھ چل دیا۔ ہم بیجنگ سے پینتیس کلو میٹر سے کم فاصلے پر چوانگ جو اور چن ین گاؤں پہنچے۔ یہ جڑواں گاؤں ہیں۔ بیجنگ کی کھلی کھلی سڑکوں کے مقابلے میں یہاں تنگ اور گرد آلود سڑکیں ہیں۔ چوانگ جو اور چن ین ایک دوسرے سے ایک کلو میٹر سے بھی کم دور ہیں۔ مگر دونوں میں مسجد ہے۔ چوانگ جو کی تاریخی مسجد کی مرمت کی جا رہی تھی۔ چن ین کی مسجد ثقافتی انقلاب کے بعد بنائی گئی تھی۔ چوانگ جو میں ہمارا استقبال مسجد کے امام موسیٰ ہوئی نے کیا۔ انہوں نے بڑے فخر سے ہمیں مسجد دکھائی۔ یہ مسجد بھی باہر سے پگوڈا نظر آتی ہے۔ اندر ایک طویل کمرہ ہے۔ لکڑی کی چھت اینٹوں کی دیواروں پر رکھی ہوئی ہے۔ چھت اور دیواروں پر چینی پھول پتے بنے ہیں اور خطاطی کی گئی ہے۔ مسجد کو گرم رکھنے

کے لیے چھت اور دیواروں پر گرم پانی کے پائپ لگے ہوئے ہیں جو تھوڑی دیر بعد بھاپ چھوڑتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے خطاطی پوری طرح نہیں دیکھی جاسکتی۔ موسیٰ ہوئی نے بتایا کہ یہ مسجد پندرھویں صدی کے اوائل میں تعمیر کی گئی تھی اور ثقافتی انقلاب کے زمانے میں اسے قریب قریب بالکل ہی تباہ کر دیا گیا تھا۔ اب حکومت اس کی مرمت کے لیے رقم دے رہی ہے۔ حکومت کی طرف سے امام مسجد کو بھی چند سو یوآن تنخواہ ملتی ہے۔ ہم نے گاؤں کے چھ ہزار باسیوں میں سے بہت سے لوگوں کے ساتھ نماز ادا کی۔ بعد میں ہم چائے پینے امام صاحب کے کمرے میں گئے جو لائبریری کے کام بھی آتا تھا۔

چین کے عام گھروں کی طرح امام موسیٰ کی لائبریری میں بھی خاص چیز لوہے کی انگیٹھی تھی جو کمرے کے بیچ میں لگی ہوئی تھی۔ اس میں کوئلے کی راکھ سے بنائے ہوئے گولے جلائے جاتے ہیں۔ امام صاحب تھوڑی دیر بعد وہ گولے اٹھاتے اور انگیٹھی میں ڈال دیتے۔ اس کا دھواں ایک پائپ کے ذریعہ باہر جا رہا تھا۔ اس سے کمرہ کافی گرم ہوگیا تھا۔ یہ پائپ چولہے کا کام بھی دیتے ہیں اور اس پر کھانا اور چائے بھی پکائی جاتی ہے۔ ہم انگیٹھی کے گرد بیٹھ گئے۔ ہم چائے پی رہے تھے اور قدیم مخطوطے دیکھ رہے تھے۔ بعض کتابیں تو مسجد سے بھی پرانی تھیں۔ میں عربی میں لکھی ہوئی چینی مسلمانوں کی تاریخ دیکھ رہا تھا اور سلیم صاحب چینی طب پر پندرھویں صدی میں لکھی ہوئی مرصع کتاب دیکھ رہے تھے۔ ہم کتابیں دیکھ ہی رہے تھے کہ نائب امام حاجی نورالدین نے ہمیں اپنے گھر چلنے کی دعوت دی۔ انہوں نے کہا کہ میں گاؤں میں ان کا مہمان ہوں گا۔

حاجی نورالدین مسجد سے پانچ منٹ کے فاصلے پر اپنی بیوی اور چار سال کی بچی کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ تینوں بڑی روانی کے ساتھ عربی بولتے تھے۔ گھر کے کمرے بہت چھوٹے چھوٹے تھے۔ لیکن مجھے معلوم ہوا کہ چین میں کمرے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بیڈ روم میں ڈبل بیڈ تھا اور اس میں بھی وہی انگیٹھی لگی ہوئی تھی۔ ان کے گھر میں گوبھی کا ڈھیر لگا ہوا تھا جو سردیوں کے لیے ذخیرہ کی گئی تھی۔ ڈرائنگ روم میں گیس کوکر کے ساتھ واش بیسن تھا، ایک میز پڑی تھی اور چھوٹی سی وارڈروب تھی جس پر سونی کا کلر ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے میرے سونے کے لیے گدا بچھا تھا۔ سلیم اور اقبال صاحب یہ وعدہ کر کے چلے گئے کہ ایک ہفتے بعد وہ مجھے لینے آجائیں گے۔

صبح کو نوڈل اور چائے کا ناشتہ کرنے کے بعد میں نے نور الدین سے کہا کہ میں غسل خانے جانا چاہتا ہوں ۔ وہ مجھے اپنے ساتھ گھر سے باہر کوئی پچاس میٹر دور لے گئے ۔ وہاں انہوں نے ایک نیچی سی چھت والی عمارت کی طرف اشارہ کیا جہاں چھوٹے چھوٹے کیوبکل بنے ہوئے تھے اور ان میں کھڈیاں نظر آرہی تھیں ۔ ہر کیوبکل کا دروازہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کیوبکل چھوٹے قد کے بونوں کے لیے بنائے گئے ہیں۔ عام قد کا آدمی کھڈی پر بیٹھ کر دوسرے کیوبکل میں بیٹھے آدمی کو ضرور نظر آئے گا اور وہ دونوں وہاں بیٹھے بیٹھے ہی باتیں بھی کر سکتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ جن کیوبکل میں لوگ بیٹھے ہیں وہ کوئی نہ کوئی کتاب پڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔اس سے مجھے تسلی ہوئی مگر پھر بھی میں اپنے آپ کو تیار نہیں کر سکا۔ تھوڑی دیر میں وہاں کھڑا رہا مگر کسی کیوبکل میں داخل ہونے کی مجھے ہمت نہیں ہوئی ۔

گاؤں میں میری آمد سے سب لوگ بہت خوش تھے ۔ ہر روز کسی نہ کسی کے گھر میری دعوت ہوتی۔ کھانے میں زیادہ تر نوڈل اور گوبھی ہوتی ۔ میں جہاں بھی جاتا میرے ساتھ امام ہوئی اور حاجی نورالدین ہوتے۔ ہماری بات ثقافتی انقلاب کی زیادتیوں سے شروع ہوتی پھر کمیونزم اور مارکسزم کی موت اور جمہوریت کی خوبیوں پر پہنچتی اور آخر میں گاؤں والوں کے لیے اسلام کی اہمیت پر ختم ہوتی ۔ معلوم ہوا کہ دونوں گاؤوں کے لوگ سب سے زیادہ شریعت نافذ کرنے کے لیے بے چین ہیں ۔وہ جمہوریت اور مال و دولت سے زیادہ وہ شریعت کا نفاذ چاہتے تھے۔ جوں جوں دن گزرے تو مجھے محسوس ہوا کہ ان کی یہ خواہش میری اپنی خواہش سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ہر صبح میں اجتماعی غسل خانوں کی طرف جاتا اور ہر بار ناکام ہو کر واپس آجاتا۔ چار دن گوبھی کھانے اور قبض کا شکار رہنے کے بعد میرا جسم پھٹنے کے قریب ہو گیا تھا۔
میں نے سوچا کہ کیا یہ عام مسلمانوں کے حالات کا استعارہ نہیں ہے؟

جب تک پاکستانی کونسلر مجھے لینے آئے میری بری حالت ہو چکی تھی۔ انہوں نے اتنی مہربانی کی کہ مجھے صرف ایسے غسل خانے میں ہی نہیں پہنچایا جسے میں استعمال کر سکتا تھا بلکہ پی آئی اے کی پہلی فلائٹ پر میرے لیے اسلام آباد کی سیٹ بک کرا دی۔ فلائٹ کا انتظار کرتے ہوئے میں یہی سوچتا رہا کہ مسلمانوں کے دماغ پر شریعت نے کتنا غلبہ حاصل کر رکھا ہے۔ حتیٰ کہ چینی مسلمان بھی جو مسلمان ملکوں سے اتنے دور بستے ہیں شریعت کے لیے اتنے بے چین ہیں

۔ یہی وہ چیز ہے جو دوسری قوموں سے مسلمانوں کی الگ شناخت بناتی ہے۔ لیکن میں اپنے آپ سے سوال کرتا کہ کیا یہ ضروری ہے کہ اس شناخت کا اظہار قرونِ وسطیٰ کے فارمولوں میں قدیم مذہبی علماء کی آراء اور ان کے تجزیوں کے مطابق ہی کیا جائے؟ بار بار قدیم تاریخ کی طرف رجوع کرتے رہنے سے مسلمان خود عملی طور پر حق تلاش کرنے کے بجائے بنے بنائے اصولوں کے غلام ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ خیال کہ صدیوں پرانا سماجی نظام ان کے تمام مسائل حل کرسکتا ہے مسلمانوں کے لیے نفسیاتی طور پر سکون آور دوا بن گیا ہے۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ ہر شخص جو شریعت نافذ کرنے کا خواہش مند ہے ماضی میں نہیں رہنا چاہتا۔ مجھے عائشہ کا خیال آیا۔ شریعت کے ساتھ اسے کتنا لگاؤ ہے لیکن اپنے برتاؤ میں وہ بالکل نئے زمانے کی ہے۔

میں اسلام آباد پہنچا تو وہاں ایک اور ہی ہنگامہ برپا تھا۔ اس کا مرکز بیس سال کی ایک شرمیلی سی عورت صوفیہ بی بی تھی۔ شادی کے بغیر اس کے بچہ پیدا ہوگیا تھا۔ اس کے باپ نے اس کے خلاف زنا کا مقدمہ درج کرادیا تھا۔ صوفیہ نے ایک شخص مقصود احمد پر زنا کا الزام لگایا تھا۔ پولیس نے صوفیہ اور مقصود احمد کے خلاف مقدمہ درج کرلیا۔ عدالت نے کہا کہ مقصود کے خلاف کافی ثبوت نہیں ہیں۔ عدالت نے صوفیہ کی گواہی کو ناکافی قرار دیا۔ ضیا کی حکومت نے جو اسلامی قوانین نافذ کیے تھے ان کے تحت یہ پہلا مقدمہ تھا۔ اخباروں نے اسے خوب اچھالا۔ اعلیٰ عدالت نے فیصلہ دیا کہ اگر کسی غیر شادی شدہ عورت کے بچہ ہوجائے اور وہ کہے کہ اس کے ساتھ زنا بالجبر کیا گیا ہے تو اسے سزا نہیں دی جاسکتی۔ صوفیہ بری ہوگئی۔ لیکن صوفیہ بی بی کے مقدمے سے چند اور سوال پیدا ہوئے۔

''عورتوں کے ساتھ شریعت کا کیا جھگڑا ہے؟'' یہ سوال میں نے اسماء برلاس سے کیا۔ اسماء ان پہلی عورتوں میں سے تھیں جو فارین سروس میں آئی تھیں۔ لیکن ان کی ملازمت جلد ہی ختم ہوگئی۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے ضیاء الحق کی فوجی حکومت پر نکتہ چینی کی تھی، اس لیے اسے ملازمت سے نکال دیا گیا۔ میری اس سے ملاقات ہوئی تو وہ اخبار مسلم میں کام کررہی تھی۔ مسلم حزبِ اختلاف کا اخبار تھا۔ اسماء کی شہرت اسلام کی ایک حقوقِ نسواں کی حامی اسکالر کی حیثیت سے تھی۔ وہ عورتوں کے حقوق کے لیے جدوجہد کررہی تھی۔

''شرمناک بات یہ ہے کہ آج اسلام کے نام پر جو قوانین بنائے جارہے ہیں ان کا اسلام کی اصل روح اور اسلامی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' اسماء نے کہا۔ ''شرعی قوانین

عباسی دور (۱۲۸۵ھ۔۷۴۹ء) میں فقہاء نے بنائے ہیں جو سب مرد تھے۔ صنفی امتیاز اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب فوجداری مقدمات میں عورتوں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ اس کا ثبوت وہ مشہور قانون شہادت ہے جس میں ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کی گواہی مانی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عورت مرد کے مقابلے میں آدھی انسان ہے۔ قرآن میں ایسے پانچ واقعات کا ذکر آتا ہے جہاں گواہی کا معاملہ سامنے آتا ہے۔ ان میں صرف ایک موقع ایسا ہے جس میں ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کی گواہی کے لیے کہا جاتا ہے۔ زنا جیسے سنگین معاملے میں قرآن شوہر کے مقابلے میں بیوی کی شہادت کو ترجیح دیتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر شوہر اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگاتا ہے اور وہ موقع کے چار گواہ پیش نہیں کرسکتا تو قرآن عورت کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ خود شہادت دے اور اپنی بے گناہی کی قسم کھائے۔ اس کے بعد وہ شوہر کو مزید کارروائی کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

اسماء نے کہا کہ یہ شریعت شادی کے بغیر مختلف قسم کے جنسی عمل کے درمیان فرق بھی نہیں کرتی۔ شادی شدہ مرد کے کسی دوسری عورت کے ساتھ جنسی عمل، غیر شادی شدہ مرد اور عورت کی باہمی رضامندی سے مباشرت اور زنا بالجبر کے درمیان بھی فرق نہیں کیا جاتا۔ اسی لیے زنا کی شکار عورت کو صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ سوڈان اور نائجیریا جیسے دوسرے مسلم ملکوں میں بھی سنگسار کرنے کی سزا دے دی جاتی ہے۔ سنگسار کرنا بھی ایک بدعت ہے کیونکہ قرآن میں کسی جرم کی سزا بھی سنگسار کرنا نہیں ہے۔''

''شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم فقہاء اپنے زمانے کی پیداوار تھے۔ اس لیے وہ اس سے زیادہ اور کیا کرسکتے تھے اور کوئی بھی علم خلا میں تو پیدا نہیں ہوتا۔'' میں نے کہا۔

''لیکن ہم تو کرسکتے ہیں اور ہمیں کرنا بھی چاہیے۔'' اسماء نے جواب دیا۔ ''ہمارے پیچھے صدیوں کا تجربہ ہے اور ہم نے یہ سیکھا ہے کہ عورتوں اور مردوں کے درمیان فرق کرنے کے معاملے میں اس قانون کا اصول غلط ہے اور وہ کسی طرح بھی قرآنی تعلیمات کے مطابق نہیں ہے۔''

''تو پھر ہم ایسا کیوں نہیں کرتے؟''

کیونکہ شریعت میں اصلاح کو اسلام پر حملہ تصور کیا جاتا ہے۔'' اسماء نے کہا۔ ''ملا بہت ہی چالاک ہیں انہوں نے شریعت اور مذہب کو ایک کردیا ہے۔ چونکہ یہ دونوں ایک ہی مان لیے گئے ہیں اس لیے شریعت میں کسی قسم کی اصلاح کو کہا جاتا ہے کہ یہ مذہب میں تبدیلی کی

جارہی ہے۔ ملاّ کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں ان کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہونا پڑے گا کیونکہ عام سادہ لوح مسلمان ان کے ساتھ ہیں اور کسی بھی ایسے اقدام کو آسانی کے ساتھ اسلام کے خلاف قدم بلکہ اسلام دشمن کہہ دیا جاتا ہے۔ اس طرح ان ملاؤں نے اسلام پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے اور یہ کتنی ستم ظریفی ہے کہ یہی وہ مذہب ہے جس میں مذہب کے پیشہ ور ترجمانوں یا مذہبی اجارہ داروں کی اجازت ہی نہیں ہے۔''

''آخر ہم مسلمان شریعت کے غیر منصفانہ تصور کے اسیر کیوں ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔ اس وقت میرے ذہن میں وہ چینی اور پاکستانی مسلمان تھے جنہوں نے شریعت کی ایک رومانی تصویر اپنے دل کے ساتھ لگا رکھی ہے۔

''شریعت میں عورتوں کو پردہ کرانا اسلام کی لازمی نشانی بن گیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ نشانیوں کو مقدس مان لینے کے بعد انسان یہ سوچنا چھوڑ دیتا ہے کہ یہ کس چیز کی علامت ہیں اور اصل میں یہ کیا کہتی ہیں۔'' اسماء نے کچھ سوچا اور پھر بولیں ''میرا خیال ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی جنگ یا بحران کے وقت امریکہ وغیرہ میں پرچم کی پوجا شروع ہوجاتی ہے۔ جب سے نوآبادیاتی نظام اور اس کے بعد سیکولر مغرب کی طرف سے مسلمانوں پر نظریاتی حملے شروع ہوئے ہیں مسلمان سوچے سمجھے بغیر بعض ایسی علامات اور نشانیوں کی طرف زیادہ سے زیادہ راغب ہوتے چلے گئے ہیں جنہیں وہ مذہب کا حصہ سمجھتے ہیں۔ اس سے اسلام کے ہمہ گیر ہونے کا تصور پیدا ہوا۔''

ہماری اس بات چیت کے چند مہینے بعد ہی اسماء کو پاکستان سے نکلنے اور امریکہ میں سیاسی پناہ لینے پر مجبور ہونا پڑا۔ میں نے لندن میں یہ خبر سنی تو مجھے وہ بات چیت یاد آگئی۔ مجھے لفظ ''ہمہ گیر'' یاد آیا جس میں ضیاء الحق پاکستانی معاشرہ کو بند کر دینا چاہتے ہیں۔ مدرسہ حقانیہ میں جن طلبہ سے میں ملا وہ مکمل شریعت سے کم پر راضی ہی نہیں تھے۔ چین میں گاؤں کے مسلمان اور طلبہ سب اپنی زندگیوں میں ''ہمہ گیر اسلام'' نافذ کرنا چاہتے تھے۔

اب میں نے ''ہمہ گیر'' اسلام کے متعلق کتابیں پڑھنا شروع کیں۔ مجھے جلد ہی معلوم ہوگیا کہ ''ہمہ گیر اسلام'' کا لفظ اسمٰعیل فاروقی کا پسندیدہ لفظ تھا۔ انہوں نے اپنی کتاب The Cultural Atlas of Islam میں جو انہوں نے اپنی بیوی کے ساتھ مل کر لکھی تھی، لکھا ہے کہ ''اسلامی ریاست ایک ہمہ گیر (totalist) ریاست ہوگی۔ خدا کے احکام کی پابندی ہر انسان پر

صرف لازمی ہی نہیں ہے بلکہ ان احکام کو انسان کے ہر عمل میں جاری وساری ہونا چاہیے۔ جو چیز اسلامی ریاست کو اسلامی بناتی ہے وہ ہے شریعت۔ اس کا نفاذ ہی اس ریاست کی بنیادی وجہ ہوگی۔ شریعت ہر چیز کا احاطہ کرتی ہے۔ اپنی کتاب Tawhid: Its Implication for Thought and Life میں وہ کہتے ہیں کہ اسلامی نظام کی ہمہ گیری موجودہ زمانے کے انسانوں کے اعمال اور ان کے مقاصد کے لیے ہی نہیں ہے بلکہ وہ ہر زمانے اور ہر مقام کے لیے ہے اور ان انسانوں کے لیے بھی ہے جو ان اعمال کا مرکز ہوں گے۔ مجھے شریعت کے اس تصور سے خوف آیا اور افسردگی بھی ہوئی۔

جب سے رسالہ انکوائری بند ہوا تھا پرویز منظور بہت افسردہ رہنے لگے تھے۔ وہ اکثر مجھے ٹیلی فون کرتے اور امہ کی زبوں حالی پر باتیں کرتے اور جب تک ہم پوری طرح تھک نہیں جاتے اس وقت تک وہ باتیں کرتے رہتے۔ پاکستان اور چین سے میری واپسی کے بعد انہوں نے مجھے فون کیا۔ انہیں معلوم ہوا کہ میں بھی بہت مایوس اور افسردہ ہوں تو بہت پریشان ہوئے۔ ''کچھ دن میرے پاس آکر رہو۔'' انہوں نے کہا۔ ''ہم دونوں مل کر روئیں دھوئیں گے اور ایک دوسرے کو تسلی دیں گے۔'' ان کے ساتھ میرا تجربہ اچھا تو نہیں تھا مگر میں نے ان کی دعوت قبول کرلی۔ انہوں نے ابو لیلیٰ سلانی کے فرضی نام سے لکھنا شروع کرر کھا تھا۔ اس نام سے ان کی تحریریں سمجھ میں آنے والی تھیں۔ میں نے چند دن اسٹاک ہام کے بہت ہی خشک علاقے سلانتونا میں ان کے ساتھ گزارے۔ ہم ہندوستانی فلمیں دیکھتے، گانے سنتے یا شعر و شاعری سے دل بہلاتے۔ پرویز کے پاس پرانے ہندوستانی فلمی گانوں کا بڑا خزانہ تھا۔ یہ انہوں نے کراچی اور لندن سے خریدے تھے۔ وہ ان گانوں کے ویڈیو بار بار دیکھتے رہتے تھے۔ مگر انسان آخر ایک ہی چیز کتنی بار دیکھ سکتا ہے۔ ایک دن ایک اور گانا سننے سے بچنے کے لیے میں نے ان سے سوال کیا۔ شریعت کی اہمیت کیا ہے؟''

''آیت اللہ صاحب'' انہوں نے اپنے خطیبانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔ ''مسلم شعور نے شریعت کا تصور تین متلازم طریقوں سے قائم کیا، حق، طریق کار اور تاریخ'' انہوں نے اس کی وضاحت یہ کی کہ شریعت دنیا کو کائنات کے بجائے تاریخ، حسن عمل کو خیال کے بجائے ایک واقعہ، ایمان کو خدا کی حقیقت سے آگاہی کے بجائے خدا کی رضا پر چلنا مانتی ہے۔ شریعت کو بہتر

طور پر سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے ضابطۂ عمل قرار دیا جائے۔ مثال کے طور پر شریعت کا اخلاقی پہلو یہ کہتا ہے کہ نیک انسان بنو نہ بنو اچھے کام کرو۔ اس لیے شریعت کو قانون کہنا اس کے بے شمار معانی کے ساتھ ظلم ہوگا۔

''اس لیے شریعت گویا قانون کے بجائے اخلاقی ضابطہ ہے۔'' میں نے کہا۔

''بالکل ٹھیک'' پرویز میری بات پر بہت خوش ہوئے ''لیکن مسلمان دماغ قانون اور ضابطۂ اخلاق میں تمیز نہیں کر سکتا۔''

''اگر قانون غیر اخلاقی ہو جائے تو کیا ہوگا۔ اسی طرح حق و صداقت طریق کار بن جائے تو؟''

''ہاں۔۔'' وہ بولے اسلامی تاریخ میں یہی تو ہوا۔''

اب ہم تاریخ کے سفر پر نکل پڑے تھے۔ پرویز نے کہا رسول اللہؐ کے زمانے میں شریعت نہیں تھی۔ رسول اللہؐ کے وصال کے ڈیڑھ سو سال بعد تک علوم اور اعمال کا جو مجموعہ مذہبی علوم کہلاتا تھا اسے شریعت کا نام نہیں دیا گیا تھا۔ یہ علم بیشتر ذاتی، آزادانہ اور موضوعی تھا۔ اسے معروضی اور قانون بنانے کا کام عباسی دور کے اوائل میں کیا گیا جب جمع شدہ علم کو تاریخ کے ساتھ خلط ملط کر دیا گیا۔ اس کے بعد حصول علم کو تاریخ ساز عمل کے بجائے، بذات خود مسلم تاریخ کی پیداوار سمجھا جانے لگا۔ چنانچہ تاریخ نے مذہبی تعلیم اور تحقیق کی جگہ لے لی۔ اب تعلیم کا مقصد استدلال کے ساتھ سمجھنے کی کوشش نہیں رہا بلکہ وہ صرف قدیم فقہاء کے فتووں کو سمجھنا ہی رہ گیا۔ خدا کی رضا جو پہلے عقلی دلائل سمجھی جاتی تھی اب اوامر و نواہی کے ذریعہ سمجھی جانے لگی۔ اسے شریعت کا نام دیا گیا۔'' پرویز نے کہا۔

دوسری اسلامی صدی کے بعد سے خدا کا کلام سمجھنے کے لیے خاص نظام وضع کیے گئے۔ عباسی دور کے آخر میں یعنی تیرھویں صدی کے قریب اسلامی قوانین کے اس نظام کو فقہ کا نام دیا گیا۔ شریعت کے اسلوب اور مواد کو اس کے ذریعہ سمجھا جانے لگا۔ شریعت کے طریق کار اور اصل اسلام میں اب کوئی فرق نہیں رہا۔ پرویز نے وضاحت کی۔

''چنانچہ آج مسلمان جسے شریعت کہتے ہیں اس کا اسلام کی سچائی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ دراصل فقہ ہے جو تاریخ میں منجمد فتوے اور عدالتی فیصلے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''بالکل صحیح۔'' پرویز بولے۔ ''یہ روایتی مطلق العنانی کے لیے نظریاتی طریق کار ہے۔

اسی لیے اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ اس کے بعد اسلامی دینیات اور قانون میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔''

اس بات پر ہم دونوں ہی متفق تھے کہ شریعت کا طریق کار جرأت مندانہ، مجتہدانہ اور قیاسی افکار کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ اس کا اوامر ونواہی کا طریقہ تخلیقی فکر کو دبا دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج شریعت پر انحصار کرنے والے افراد اور معاشرے انتہائی قدامت پسند پسماندہ اور ماضی پرست ہیں۔ نجات کا ذریعہ بننے کے بجائے وہ جبر کا آلہ بن گیا ہے۔

پرویز ویڈیو پلیئر میں کیسٹ بدلنے اٹھے۔ ''اچھا مولوی صاحب، شریعت اور اسلامی بنیاد پرستی میں کیا تعلق ہے۔'' میں نے سوال کیا۔

وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ ''اسے اس طرح سمجھنا چاہیے کہ بنیاد پرستی نئے زمانے کی بدعت ہے۔ اس کی کوئی تاریخی نظیر نہیں ہے۔ کلاسیکی مسلم علم کلام یا اسلامی روایت پر اس کی اساس نہیں ہے۔ یہ اصطلاح حال میں بنائی گئی ہے۔ اور جو چیز اسے جدید بناتی ہے وہ ریاست کا تصور ہے۔ قدیم اسلام میں ایسی کسی قومی ریاست کا تصور نہیں تھا جو جغرافیائی سرحدوں میں قائم ہو۔ روایتی طور پر ہمارا واسطہ زیادہ برادری یا سلطنت سے تھا۔ اسلامی بنیاد پرستی کے لیے ایسی قومی ریاست کا جدید تصور ضروری ہے جو جغرافیائی سرحدوں میں بند ہو اور جس کے پیچھے شاندار ماضی کی مثالی روایات ہوں۔ اس سے ایک نیا مذہبی اور سیاسی نظریہ پیدا ہوا۔''

''اس نظریہ میں کیا خاص بات ہے؟''

''اس میں خاص بات یہ ہے کہ اس سے اسلامی بصیرت میں ریاست ایک بنیادی حقیقت بن گئی اور مسلم شعور کی سب سے بڑی حقیقت قرار پائی۔ اسی لیے تمام بنیاد پرست اسلامی ریاست قائم کرنے کی بات کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایسی اسلامی ریاست کے بغیر اسلام نامکمل ہے جس میں شریعت اور اسلامی قوانین رائج ہوں۔ اس طرح اسلام کو ایسا مطلق العنان نظام بنا دیا گیا ہے جس میں ہر انسانی صورت حال کا فیصلہ ریاست ہی کرتی ہے۔ چنانچہ معاشرہ اور ریاست ایک ہوگئے اور سیاست غائب ہوگئی۔ سماجی اور ثقافتی تنوع ختم ہوگیا اور ہر طرف یکسانیت ہی یکسانیت پھیل گئی۔ ظاہر ہے اس کا نتیجہ فاشزم ہی ہوگا۔ یہاں شریعت درحقیقت آمرانہ نظام کا آلۂ کار بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم دنیا کے آمر اور بادشاہ شریعت کو بہت پسند کرتے ہیں۔'' پرویز نے کہا۔

''اور بعض مسلم لیڈر خواہ کتنے ہی ماڈرن بنتے ہوں وہ لوگوں کے ہاتھ کاٹنے اور انہیں سنگسار کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

پرویز ایک دم کرسی سے اچھلے ''اچھا، یہ دل جلانے کی باتیں بہت ہو چکیں۔ اب اچھے اچھے گانے سنتے ہیں۔''

افسردگی اور مایوسی کے باوجود پرویز کے گھر میرا جانا اچھا ہی رہا۔ اب میرا یہ خیال پختہ ہو گیا کہ شریعت کی اصلاح کے بغیر ایک ایسا مسلم معاشرہ قائم کرنے کا خواب کبھی پورا نہیں ہو سکے گا جس معاشرہ کو ارضی جنت کہا جا سکے اور شریعت کی اصلاح کا مطلب ہے اسلام کی اصلاح۔ بہشت کی طرف جانے والا راستہ یہ ہے کہ الوہی قوانین پر نئے سرے سے غور کیا جائے۔ یعنی مسلم افراد اور ان کی برادریوں کو یہ حق ملنا چاہیئے کہ وہ اپنے زمانے اور حالات کے مطابق مذہبی کتابوں کی نئی تشریح اور تفسیر کر سکیں۔ اصل میں شریعت چند اصولوں کے سوا اور کیا ہے جو مسلم معاشروں کی رہنمائی کے لیے اقدار کا ڈھانچہ مہیا کرتے ہیں۔ لیکن یہ اصول اور اقدار کوئی منجمد چیز نہیں ہیں بلکہ یہ نامیاتی اصول ہیں جو حالات اور پس منظر تبدیل ہونے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ اور نئی تشریح کا اختیار صرف ان علماء اور فقہاء کو ہی نہیں تھا جنہیں گزرے صدیاں ہوئیں اور نہ یہ کام ان ملاؤں کا ہے جنہوں نے عام مسلمانوں کے دل و دماغ پر قبضہ کر رکھا ہے بلکہ یہ ہر مسلمان کا کام ہے ایمان لانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آنکھیں بند کر کے پرانے لوگوں کی تقلید کی جائے بلکہ ہر ایمان لانے والے کو سوچ سمجھ کر مسلسل مذہبی کتابوں کی نئی تشریح و تفسیر کرتے رہنا چاہیے۔ اس کی راہ میں مذہبی اور سیاسی مقتدر طبقوں کی طرف سے رکاوٹ پیدا کی جائے گی۔ چنانچہ میں نے تہیہ کیا کہ یہ رکاوٹیں دور کرنے کے لیے میں اور بھی ان تھک کام کروں گا۔

باب ۔ ۱۲

سیکولرزم کے مزے

اسلام کی اصلاح کے راستے میں جو رکاوٹیں ہیں میں انہیں دور کرنے کی کوشش کروں گا۔ ارادہ تو نیک تھا مگر یہ ہوگا کیسے؟ مغربی ماہرین کے حلقوں میں اس کا یہ جواب گردش کرتا رہتا ہے کہ، اسلام اس وقت اپنی اصلاح کے لیے بالکل تیار ہے۔ پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ ان کے نزدیک اصلاح کا مطلب پندرھویں اور سولھویں صدی میں عیسائی مذہب میں کی جانے والی اصلاح جیسی کوئی چیز تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ میں جو مذہبی اصلاح ہوئی تھی اس نے نظریاتی اور علمی مباحث کا دروازہ کھول دیا تھا اور ہماری طرف سے یہ ان لوگوں کا جواب بھی ہوسکتا ہے جو مسلمان حلقوں میں اس قسم کے خیالات کو پروان ہی نہیں چڑھنے دیتے۔ لیکن جب بھی ہماری محفل میں یہ موضوع چھیڑا جاتا تو میرل ڈیوساس کی مخالفت کرتی۔ وہ اپنے آپ کو عیسائی مذہب، اس کی اصلاح اور یورپی تاریخ کا ماہر اور اس موضوع پر ہماری اسپیشل ایڈوائزر سمجھتی تھی۔ اس کا بنیادی اعتراض اسلام اور عیسائیت کی تاریخ میں مماثلت تلاش کرنے پر تھا۔ یعنی اسلام چونکہ اپنی پندرھویں صدی میں ہے اور اسی عمر میں عیسائیت میں بھی اصلاح ہوئی تھی، اس لیے اسلام بھی اب اصلاح کے لیے بالکل تیار ہے۔ لیکن اس سلسلے میں چند ایسے سوال بھی پیدا ہوتے تھے جن پر پوری توجہ سے غور کرنا ضروری ہے۔ یورپی اصلاح نے عقائد سے پیدا ہونے والے تمام بنیادی سوالات میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ اس نے تخلیق کائنات کے مقصد پر اٹھنے والے سوالوں کے جواب

جاننے کے نئے راستے کھول دئے تھے۔اب عقیدے اور عقل کے درمیان توازن بڑی حد تک تبدیل ہو چکا تھا۔یورپ میں جدید دور اصلاح مذہب سے شروع ہوا۔سرمایہ دارانہ نظام سے آج کی سائنس تک سب کو اسی کا عطیہ مانا جاتا ہے۔ایک ہی نسل میں جو بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی اس نے کولمبس کے سفر اور میگی لین کے دنیا کے گرد پہلے بحری سفر (۱۴۹۲ء سے ۱۵۲۶ء کے درمیان) کو ایک دوسرے سے جدا کیا وہ یہی تھی کہ ہر چیز کو سمجھنے کے لیے عقل نے مرکزی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ ذہنی غلامی سے آزادی کے لیے یورپ کو عقل کی ضرورت تھی، لیکن اسلام کو ایسی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے عقل ہمیشہ ایمان کا حصہ رہی ہے۔حتیٰ کہ دقیانوسی سے دقیانوسی ملا اور گاؤں کا سیدھا سادہ امام مسجد بھی بڑی خوشی سے اس موضوع پر بات کرنے کو تیار ہو جائے گا کہ قرآن میں عقل کی کتنی اہمیت بیان کی گئی ہے اور رسول اللہؐ نے معروضی علم حاصل کرنے کی کتنی تلقین کی ہے اور اسلامی تہذیب نے علوم وفنون میں کیا کارنامے سرانجام دئے ہیں۔ ہمارا مسئلہ عقل کی اہمیت اجاگر کرنا نہیں ہے بلکہ مسئلہ عقل کے استعمال کا ہے۔نظام تعلیم کی وہ شمع ایک بار پھر روشن کرنے کا ہے جس پر ان تمام کارناموں اور مسلم تاریخ کا انحصار ہے۔

مجھے جو گرہ کھولنا ہے وہ کوئی اور ہے۔ مجھے لاطینی لفظ seculum سے الجھنا ہے، جس کا مطلب ہے "آج کی دنیا"، یعنی مادّی وجود کا حال۔یورپی اصلاح مذہب نے اس دنیا میں حکمرانی کے اختیارات کلیسا کے ہاتھ سے لے کر ریاست کے حوالے کر دئے تھے۔پوپ کے بجائے اب شہزادوں کو حق حکمرانی مل گیا تھا۔یہ معاشرہ کو سیکولر بنانے کے عمل کا آغاز تھا۔یہ مذہب کی اصلاح کی دینی جدوجہد سے شروع ہوا تھا اور ریاست کو سیکولر بنانے پر ختم ہوا۔یہ ریاست ضمیر کی آزادی اور مذہبی عقائد کی کثرت اور تنوع کی ضمانت دیتی تھی۔ یہی شہری آزادیوں کی بنیاد ہیں۔ یہ سلسلہ مارٹن لوتھر سے شروع ہوا اور ٹامس جیفرسن کے اس اعلان تک پہنچا کہ مذہبی معاملات میں ریاست کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ مذہب اور ریاست کو الگ الگ رہنا چاہیے۔

جب مذہبی جنگوں میں ان دونوں پہلوؤں کا مقابلہ ہوا تو مذہب ہی بدنام ہوا۔ یہاں ایک اور مسئلہ بھی پیدا ہوا۔اصلاح مذہب نے ضمیر کی آزادی کا جو دروازہ کھولا تھا اس نے مذہب کی بنیاد پر قائم ہونے والی آمریت کے بجائے سیکولر آمریت کا امکان پیدا کر دیا۔ پہلی مطلق العنان سیکولر ریاست فرانس کے انقلاب نے پیدا کی۔جدید ریاست کو جو بے پناہ

اختیارات حاصل ہوئے اس نے سب کو پریشان کیا۔ یہ مسئلہ جدیدیت کی تعریف سے پیدا ہوا جس کی بنیاد مذہب اور ریاست کی معاندانہ تاریخ پر تھی۔ اس تعریف کی رو سے ہر وہ چیز جو مذہب سے متعلق تھی وہ غیر معقول، غیر سائنسی اور اس لیے کمتر قرار پائی۔ یہ کسی نے نہیں سوچا کہ عقیدہ اور عقل حقیقت کو سمجھنے کے دو طریقے بھی ہو سکتے ہیں۔ جب میں یہ سوچ رہا تھا تو خیال آیا کہ اس بارے میں تو بحث مباحثے کافی ہو چکے ہیں اور مسلمانوں کی تاریخ میں بڑے بڑے عالی دماغوں نے اس میں حصہ لیا تھا۔ جسے سیکولرازم کہا جاتا ہے اس کی اساس مسلم تاریخ میں ملتی ہے۔ اس تاریخ سے رجوع کر کے موجودہ زمانے کے مسائل بھی حل کیے جا سکتے ہیں۔

مذہب اور ریاست کو الگ کرنے اور مذہب کو سیاست سے الگ کرنے سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ اس سوال نے مسلم علماء و فضلاء کو اسلام کے ابتدائی زمانے سے ہی پریشان کیے رکھا ہے۔ اسلام میں قانون، حسن اخلاق اور سیاست ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ اسلامی سیکولرزم کہنا ایک متضاد سی چیز نظر آتی ہے۔ لیکن سیکولرزم اسلام کی تاریخ میں موجود ہے اگرچہ اسے مذہب اور سیاسی اقتدار میں علیحدگی کے طور پر کبھی بیان نہیں کیا گیا۔ امیہ سلطنت جو رسول اللہؐ کے وصال کے صرف پچاس سال بعد بنی اور عباسی سلطنت، جسے مسلمانوں کا سنہری دور کہا جاتا ہے نام کی ہی اسلامی ریاستیں تھیں۔ خلیفہ کو دینی اور شرعی اختیارات حاصل نہیں تھے، یہ اختیارات علماء (قاضی) کے پاس تھے۔ فاطمی سلطنت کے سوا، جس کی بنیاد اسمٰعیلی فقہ پر تھی، باقی تمام ریاستیں جو اس کے بعد آئیں، سیکولر تھیں۔

ابتدائی دور کے علماء کو مذہب اور سیاست کی علیحدگی کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں تھا۔ مسلم فلاسفہ میں جس نے سب سے پہلے اس مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا وہ تھا فارابی، جسے عزت کے ساتھ ارسطو ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ فارابی نے موسیقی کا ایک آلہ ایجاد کیا تھا جسے وہ وسط ایشیا میں بجاتا پھرتا تھا اور اس بہانے صاحب اقتدار طبقوں کے ساتھ فلسفیانہ بحث و تمحیص کرتا تھا۔ آخری عمر اس نے مالی کی حیثیت سے گزاری۔ لیکن اس ے پہلے اس نے ایک کتاب لکھی جو یونانی سیاسی افکار اور اسلامی نصب العین کے درمیان امتزاج پیدا کرنے کی سنجیدہ کوشش تھی۔ اس کے خیال میں فلسفی، اعلیٰ حکمراں، شہزادہ، قانون ساز اور امام ایک ہی تصوّر کا حصہ ہیں اور وہ اپنی کامل ریاست کو ایک آفاقی سیکولر ریاست سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کسی بھی ریاست کا اصل مقصد خوشی کا حصول ہے جو صرف فلسفیوں کی پاک باز ریاست ہی فراہم کرسکتی ہے۔

فارابی ان فلسفیوں میں شامل تھا جنہیں معتزلہ کہا جاتا تھا۔معتزلہ کا لغوی مطلب ہے الگ ہونے والے۔اس میں زیادہ تر فلسفی شامل تھے لیکن سائنس داں، شاعر حتیٰ کہ خلیفہ بھی ان کے ساتھ تھے۔یہ سب شریعت کی بنیاد پر قائم عقیدے کی پابندی کرنے کے خلاف تھے۔انہوں نے اسلام کو زیادہ انسان دوست مذہب بنانے کی کوشش کی۔معتزلہ کی دلیل تھی کہ عقل کے ذریعہ انسان بھی جان سکتا ہے کہ وہ اخلاقی کام کیسے کرے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ ریاست کے نظام میں مذہب کو شامل کرنا لازمی نہیں ہے۔بعض مورخ الکندی کو معتزلہ مکتب فکر کا بانی مانتے ہیں۔لیکن اس کی تاریخ اس سے بھی پرانی ہے۔اس کا آغاز دو کم شہرت یافتہ فلسفیوں واصل بن عطا اور عمرو ابن عبید سے ہوتا ہے۔وہ دونوں ۶۹۹ء میں پیدا ہوئے۔کہا جاتا ہے کہ دونوں حسن بصری کی محفل میں بیٹھے ان کا وعظ سن رہے تھے۔وعظ کے بعد حسن بصری سے دو آدمیوں نے ایک ایسے مفروضہ آدمی کے بارے میں بحث شروع کر دی جس نے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا ہوا تھا۔پہلا آدمی کہتا تھا کہ گناہ کبیرہ کا مسلسل ارتکاب کرنے والے کو مسلمان تو مانا جائے لیکن اسے بدعقیدہ قرار دے دیا جائے اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا جائے۔دوسرے کی دلیل یہ تھی کہ بدترین گناہ کرنے والا اسلام سے روگردانی کرتا ہے اس لیے اسے ایمان والا نہیں کہا جاسکتا۔قبل اس کے کہ حسن بصری اس کا جواب دیتے ان کے نوجوان طلبہ نے کہا کہ اس کا ایک اور حل بھی ہے، ایسا آدمی صاحب ایمان ہے اور نہ غیر صاحب ایمان۔اس سے حسن بصری خوش نہیں ہوئے اور ان طلبہ سے کہا کہ یہاں سے چلے جاؤ۔چنانچہ واصل اور عبید وہاں سے نکلے اور مسجد کے دوسرے کونے میں اپنے خیالات کی تعلیم دینے لگے۔معتزلہ جو بہت ہی آزاد خیال مانے جاتے تھے ان میں گیارھویں صدی کے ممتاز فلسفی ابن سینا اور بارھویں صدی کے فلسفی ابن رشد بھی شامل تھے۔

معتزلہ کا مقابلہ اشعری فلاسفہ سے تھا جو کہتے تھے کہ صرف انسانی عقل حسن اخلاق کا ادراک نہیں کرسکتی اور خدا کو سمجھنا انسانی عقل سے باہر ہے۔اشعری مکتبۂ فکر کا آغاز ابوالحسن اشعری نے کیا تھا جو ۸۷۴ء میں بصرہ میں پیدا ہوئے۔اشعری اس وقت کے معتزلی رہنما الجبائی کے شاگرد تھے۔ان کے سوانح نگار ابن خلیقون نے لکھا ہے کہ ایک دن اشعری نے اپنے استاد سے تین بھائیوں کے بارے میں پوچھا۔ان میں سے ایک بھائی سچا مسلمان، پاک باز اور نیک تھا، دوسرا کافر، بدمعاش اور کمینہ انسان تھا اور تیسرا بچّہ تھا۔وہ تینوں مرگئے۔عاقبت میں

ان کا کیا ہوگا۔ الجبائی نے جواب دیا۔ پاک باز بھائی بہشت میں اعلیٰ مقام پائے گا، کافر جہنم میں جائے گا اور بچّہ ان میں ہوگا جنہیں نجات مل گئی ہے۔ اس پر اشعری نے کہا۔ اگر بچہ بہشت میں اعلیٰ مقام پانے والے بھائی کے مقام پر جانا چاہے تو کیا اسے اجازت مل جائے گی؟ نہیں، الجبائی نے جواب دیا۔ اس سے کہا جائے گا کہ تیرے بھائی نے اپنے نیک اعمال کی بنا پر یہ مقام حاصل کیا ہے، تو نے ابھی ایسا کوئی کام نہیں کیا۔ اب اشعری نے کہا۔ اگر وہ بچہ کہے کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے تو نے مجھے اتنی عمر ہی نہیں دی کہ میں میری تیری بندگی نہ کرسکا۔ اس پر الجبائی بولے۔ اس کے جواب میں اللہ کہے گا۔ میں جانتا تھا کہ اگر تجھے زیادہ عمر مل جاتی تو تو میری نافرمانی کرتا اور جہنم میں جاتا۔ اس لیے میں نے تیری بھلائی کے لیے ایسا کیا۔ اس پر اشعری نے کہا۔ اب اگر وہ بچّہ کہے کہ اے خداوندِ دو عالم، چونکہ تو جانتا تھا کہ اس کی (میرے بھائی کی) قسمت میں کیا ہے اور تو یہ بھی جانتا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے تو تُو نے اس کے فائدے کا کیوں حکم دیا میرے فائدہ کا حکم کیوں نہیں دیا؟ اس پر الجبائی خاموش ہوگئے۔

ایک جمعہ کو اشعری نے بصرہ کی مسجد میں، جہاں وہ پڑھاتے تھے بلند آواز میں اعلان کیا۔ جو لوگ مجھے جانتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ میں کون ہوں۔ لیکن جو لوگ نہیں جانتے میں انہیں بتائے دیتا ہوں کہ میں علی ابن اسمٰعیل اشعری ہوں۔ میرا عقیدہ تھا کہ قرآن مخلوق ہے اور یہ کہ انسانی آنکھ خدا کو نہیں دیکھے گی اور ہم خود اپنے برے اعمال کے خالق ہیں۔ اب میں حق کی طرف آگیا ہوں۔ میں ان خیالات سے انکار کرتا ہوں اور اب میں معتزلہ کی کمینگی اور ان کے رسوائے زمانہ افکار کی قلعی کھولوں گا۔

اشعری کی حمایت امام غزالی نے کی جنہوں نے براہ راست ان کا مقابلہ کیا۔ ان کے ساتھ فخر الدین رازی اور مؤرخ ابنِ خلدون تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ساتویں سے چودھویں صدی تک اسلامی تاریخ کا دور معتزلہ اور اشعری علما کے درمیان جنگ و جدل کا دور ہے۔ آخر اشعری فکر کی فتح نے اسلام میں سیکولر انسان دوستی کا خاتمہ کردیا اور مسلم تہذیب کو موجودہ حالت پر پہنچا دیا۔

اگر اسلامی فکر اور فلسفے میں یہ مباحث اسی زور شور سے جاری رہتے اور اشعری کے بجائے معتزلی افکار کامیاب ہوجاتے تو کیا ہم اصلاح کے راستے پر نہیں پڑ جاتے؟ یہ ایک جائز سوال ہے جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ میں بیس اور تیس سال کی عمر اور ایرانی انقلاب

کے زمانے میں اشعری فکر کا بہت بڑا حامی تھا۔ امام غزالی کی کتاب احیاء العلوم اور ابن خلدون کا مقدمہ میرے بستر کے ساتھ تپائی پر رکھا رہتا۔ میں انہیں اکثر پڑھتا رہتا اور ان کے حوالے دیتا رہتا۔ مجھے اشعری فکر میں سب سے زیادہ جو چیز پسند تھی وہ ان کی علمی مہارت اور اسلامی علوم پر ان کا عبور تھا۔ اب میں چاہتا تھا کہ کسی ایسے شخص کے ساتھ بات کروں جو پوری طرح سیکولر فکر کا قائل ہو اور میں ایسے آدمی کو جانتا تھا۔

افتخار ملک ظفر ملک کے دور کے عزیز ہیں۔ وہ بہت ہی لمبے ہیں۔ ان کے گھنے بال ہیں اور داڑھی مونچھیں صاف ہیں۔ گویا سیکولر خیالات کے لیے بالکل ہی موزوں انسان ہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ میں پرانے زمانے کی طرح انہیں کھانے پر بلاؤں اور اپنے سوال پہلے سے تیار رکھوں۔ سوال یہ ہو کہ سیکولرازم سے اسلامی معاشروں کو کیا نسبت ہوسکتی ہے؟ جو لوگ سیکولر معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں وہ مذہب کو سمجھتے ہیں اور نہ سیاست کو۔ علامہ اقبال کہہ گئے ہیں۔
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی۔

''تم اور اقبال دونوں ہی غلط کہتے ہو'' افتخار نے جواب دیا۔ ''ظالم سامراجیت کا توڑ صرف سیکولرازم ہی ہے۔ روایت پرستی نے مسلمانوں کے دماغ ماؤف کردیے ہیں۔''

وہ یہ بھی جانتے تھے کہ سیکولرزم کی اپنی خرابیاں بھی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ جس طرح ہم اسلامی بنیاد پرستی کو اصل اسلام سے انحراف سمجھتے ہیں اسی طرح عراق اور شام کی بعث پارٹی الجزائر کی نیشنل لبریشن فرنٹ اور تیونس کی کانسٹی ٹیوشن پارٹی لبرل سیکولرزم سے منحرف ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ سیکولرزم بھی ایک قسم کا مذہب ہی ہے۔ اس میں بھی کئی فرقے ہیں۔ ایک فرقہ لبرل سیکولرزم پیش کرتا ہے اور دوسرا اس کی غلط توجیہ کرتا ہے۔ بہرحال اس کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ مذہب اور ریاست کو الگ ہونا چاہیے اور اظہار رائے کی آزادی ہونا چاہیے۔ افتخار یہ مانتے تھے کہ سیکولر فکر رکھنے والے بھی اتنے ہی کٹر نظریہ پرست ہوسکتے ہیں جتنے مذہبی لوگ۔ لیکن سیکولرازم کثرت رائے، اختلاف کی آزادی اور مسلم معاشروں میں جمہوریت کے پھولنے پھلنے کے لیے ایک سائبان فراہم کرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مذہبی جھگڑے اتنے بڑھ گئے ہیں کہ اب مسلمانوں کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کو الگ الگ کردینا چاہیے۔ مسلمانوں کے تناظر میں سیکولرازم مذہب کے خلاف نہیں ہے بلکہ وہ تنگ نظری، نسلی اور فرقہ وارانہ شدت پسندی اور دقیانوسیت کے خلاف ہے۔ کوئی بھی مسلم سیکولر انسان مذہب کی بے حرمتی نہیں کرسکتا

بلکہ وہ تمام مذاہب کا احترام کرے گا۔

میں نے تسلیم کیا کہ اس میں بھی چند مشکلات ہیں۔ عام انسانوں اور بالخصوص مسلمانوں میں مذہب ایک ایسا متوازن انسان پیدا کرتا ہے جو حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں میں امتزاج پیدا کر سکے۔ ان دونوں کو چھوڑنے سے کیا مذہب کا اصل مقصد ہی فوت نہیں ہو جائے گا۔ دوسرے مذہبی شدت پسندی اور تنگ نظر قوم پرستی کا جواب سیکولرزم نہیں ہے بلکہ مذہبی رواداری اور کثرت پسندی ہے جسے ہمارے سماج میں فروغ دینا چاہیے۔ تیسرے مسلم معاشروں میں سیکولرزم نے عام مسلمانوں کو اپنے اندر شامل نہیں کیا بلکہ الگ کر دیا ہے۔ وہ عام آدمی جسے ماڈرن مسلمان توہم پرست اور اپنے آپ سے کمتر سمجھتے ہیں اس میں ان کا کردار بہت کم ہے اور وہ اکثریت میں ہیں۔ سیکولرزم کے ساتھ روایتی اسلام کو ایک خدمت گار کا درجہ مل جاتا ہے جسے اکثریت اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہے اور وہ مذہب کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی۔ جن کی زیادہ اکثریت ہوتی ہے وہ عام طور پر روایات۔ روایتی عوام اور ان کے مذہب کو بدنام کرتے ہیں۔ اس سے مذہب سیاست سے علیحدہ نہیں ہوتا بلکہ وہ رجعت پسندانہ اور متشدد راستے سے سماج کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔

''تم میری بات نہیں سمجھے۔'' افتخار بولے ''سیکولرزم کے بارے میں ہمارا تجربہ خواہ کچھ بھی ہو میں تو مذہب کی قیمت پر سیکولرزم کی حمایت نہیں کر رہا ہوں بلکہ اسے ایک ایسا طریقہ مان رہا ہوں جس کے ذریعہ بذات خود مذہب کی نئی تعبیر کی جا سکتی ہے۔''

''لیکن آپ سیکولرزم کے نظریہ کو یورپ کی تاریخ سے علیحدہ کیسے کر سکتے ہیں۔'' میں نے سوال کیا۔ '' آج ہم جس سیکولرزم کو جانتے ہیں اس پر یورپ کی ہی چھاپ ہے۔ آزادی اور حریت فکر کا تصور ہی دوسری ثقافتوں اور تہذیبوں کے مستقبل کی بنیاد بنا ہے کیونکہ یہی ایک آفاقی معیار ہے جس سے شخصی آزادی اور حریت فکر کو سمجھا جا سکتا ہے۔''

افتخار نے مانا کہ یہ مشکل ضرور ہے لیکن کہا کہ سیکولرازم کی ایک ہی تعریف تو نہیں ہے۔ مسلم تاریخ کے ایک دور میں بھی سیکولر سماج رہا ہے اور اس کا پس منظر یورپی تاریخ سے بالکل ہی مختلف تھا۔ ہندوستانی تاریخ میں بھی سیکولرازم تھا۔ برِصغیر ہمیشہ مختلف اور متنوّع ثقافتوں اور مذاہب کا مرکز رہا ہے اور شخصی، سماجی اور سیاسی زندگی کی حقیقت کو قبول اور برداشت کرنے کے مختلف راستے اختیار کیے جاتے رہے ہیں۔ آج بھی ہندوستان میں سیکولرازم کا جو تصور ہے اس

میں بھی کثرت میں وحدت کے قدیم تصور کو ہی شامل رکھا گیا ہے۔ ہندوستان کے بہت سے لکھنے والے بڑے زور شور سے اس تصور کا دفاع کرر ہے ہیں کیونکہ انہیں مذہبی انتہا پسندوں اور سیکولر بنیاد پرستوں دونوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ بہت ہی اہم خیال تھا۔ کیونکہ ہم جس کا سامنا کرر ہے ہیں وہ تخیل کی ناکامی ہے۔ مسائل کے مروّجہ حل سے آگے سوچنے میں ناکامی اور یہ صرف ہمارا مسئلہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ مغرب کا مسئلہ بھی ہے۔

''بہت سے لوگوں کے تجزیہ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم اپنے مسائل کا حل محض اس لیے قبول نہیں کرسکتے کہ وہ مغرب کی طرف سے آیا ہے۔'' افتخار نے کہا۔

''اور مغرب بھی یہ تسلیم نہیں کرتا کہ اس کے سیکولرازم کے نظریہ میں بھی کچھ خرابیاں ہیں۔ وہ ایک سے زیادہ توجیہ قبول نہیں کرتا۔ سیکولرازم کا ایک متبادل انداز جو ایک زندہ حقیقت ہو ہر ایک کے لیے فائدہ مند ہوگا۔ اس سے ہر شخص کو موقع ملے گا کہ وہ یورپ کی تاریخ کی خرابیوں سے ماورا ہو کر سوچے۔'' میں نے جواب دیا۔

ہم نے اتفاق کیا کہ اسلام کی اصلاح کو مغرب کے ساتھ اس کے اختلافات سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا اور مغرب کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اب ایک ہی معاملہ رہ جاتا ہے کہ کیا اسلامی سیکولرزم میں کوئی ایسی بات ہے جس کے ساتھ ہم اپنا رشتہ استوار کرلیں۔

''ترکی میں امید کے آثار نظر آتے ہیں۔'' افتخار نے کہا۔ ''اپنی مشکلات کے باوجود ترکی کا سیکولرزم مستقبل کی لہر بن سکتا ہے۔''

اس کی یہ بات مجھے اس وقت یاد آئی جب چند مہینے بعد میں ترکی گیا۔ ترکی ایک سیکولر جمہوریت ہے۔ میں ایک ٹینک پر رکھی توپ کی نال میں جھانک رہا تھا۔ استنبول کے گلی کوچوں میں گھومنے پھرنے کے بعد میں اپنے ایک دوست سے ملنے استنبول ٹیکنکل یونیورسٹی گیا تھا۔ وہ دوست وہاں پولیٹکل سائنس کا پروفیسر ہے۔ میں سیکولر راستے کے امکانات کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرا دوست ترکی کے سیکولرازم کا ماہر ہے۔ وہاں مجھے فوج کا سامنا کرنا پڑا جو یونیورسٹی کی حفاظت کررہی تھی۔

سیکولرازم کی حفاظت کرنے والے ٹینک کی کھڑکی سے ایک فوجی کا سر باہر نکلا اور وہ پکارا۔ ''کیا چاہیے؟'' ٹینک کے پیچھے اتاترک کا مجسمہ کھڑا تھا اور اس کا اٹھا ہوا ہاتھ مجھ سے کہہ

رہاتھا'' چلے جاؤ۔'' سپاہی سمجھ گیا کہ میں ترکی کا رہنے والا نہیں ہوں۔ اس لیے اس نے انگریزی میں پوچھا۔ ''کس سے ملنا ہے۔''

میں نے بتایا کہ میں یونیورسٹی میں جانا چاہتا ہوں۔ میں اپنے ایک دوست سے ملنے آیا ہوں جو پولیٹکل سائنس کا پروفیسر ہے۔

ٹینک نے اپنی توپ کا رخ پہلے اوپر پھر نیچے کیا جیسے وہ میری بات کا جواب دے رہا ہو۔ پھر وہ میرے قریب آگیا۔ توپ کا دہانہ میرے قریب آیا تو میں پیچھے ہٹ گیا۔

''مہمانوں کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ چلے جاؤ'' سپاہی نے کہا۔

''پروفیسر میرا انتظار کر رہے ہیں۔'' میں نے ہمت کر کے کہا۔

سپاہی ٹینک سے باہر آگیا۔ وہ میرے پاس آیا اور دونوں ہاتھوں سے مجھے دھکا دیا ''تم انگریزی نہیں سمجھتے۔ کہہ دیا کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں۔''

''دیکھو'' میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی ''میں برطانیہ کا شہری ہوں۔ میں صرف اپنے دوست سے ملنے آیا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے اپنا پاسپورٹ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس نے اسے غور سے دیکھا اور پھر اسے زمین پر پٹخ کر چیخا ''مہمانوں کو اجازت نہیں ہے۔''

یہی رویہ ہے جس کی وجہ سے ترکی کو یورپی یونین میں شامل نہیں کیا جا رہا ہے۔ میں نے پاسپورٹ اٹھایا اور وہاں سے چل دیا۔ سپاہی نے ہوا میں ہاتھ لہرایا اور ٹینک پر چڑھ گیا۔

میں نے اپنے دوست فرخ الپٹکین کو فون کیا اور ساری بات بتائی۔ اصل میں فرخ میرا دوست نہیں ہے بلکہ میرے بھائی جمال کا دوست ہے۔ دونوں شیخ ناظم کے مرید ہیں۔ دوسرے دن صبح ہی صبح وہ میرے پاس آگیا ''پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔'' اس نے مجھے چند کتابیں دیں ''بس، طالب علم کا بہروپ دھار لو۔'' اب ہم یونیورسٹی گئے۔ میں طلبہ کے ہجوم میں شامل ہوگیا اور ٹینک سے بچتا بچاتا اندرونی دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازے پر کھڑے ایک فوجی نے سب کی تلاشی لی۔ اندر جانے کے بعد اس وقت تک کچھ طلبہ میرے ساتھ رہے جب تک میں نے اپنے دوست کو تلاش نہیں کر لیا۔ اس کے شعبے میں جانے سے پہلے میری تلاشی پھر لی گئی۔

''تم خوش قسمت ہو کہ میرے پاس پہنچ گئے۔ حکمراں میری سیاست سے خوش نہیں ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ میں ایک بار پھر جیل چلا جاؤں گا۔''

مجھے معلوم تھا کہ وہ کئی مہینے کی قید کے بعد حال ہی میں رہا ہوا ہے۔ اسے سیکولرازم پر نکتہ

چھینے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس کا جرم یہ بھی تھا کہ جو لڑکیاں حجاب لینا چاہتی تھیں وہ ان کی حمایت کرتا تھا۔ حجاب لینے والی لڑکیوں سے ترکی کے سیکولرازم کو خطرہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ سوال ترکی کے لیے ہی نہیں ہے باقی یورپ کے لیے بھی ہے۔ فرانس اور جرمنی میں مسلم لڑکیوں کو حجاب پہننے کی اجازت نہیں ہے۔ انہیں اسکول میں نہیں جانے دیا جاتا۔ لیکن غیر مسلم گوری عورتوں کا سر پر رومال باندھنا اخلاقی اور فیشن ایبل مانا جاتا ہے۔ یہ تضاد کیوں ہے۔

"سیدھی سی بات ہے" اس نے کہا "رومال یا اسکارف ایک علامتی طاقت رکھتا ہے۔ سیکولر معاشرہ میں آزادی اسی طرح سیکولر اصولوں کی پابند ہے جیسے مذہبی معاشروں میں مذہب کی پابند ہے۔ کوئی سیکولر معاشرہ اپنے شہریوں کو مطلق آزادی نہیں دیتا بلکہ اسے اپنی حدود کا پابند کرتا ہے۔ حجاب ان حدود کی خلاف ورزی ہے۔"

اس نے کہا "ترکی کو جنرلوں اور مغرب زدہ اشرافیہ نے یرغمال بنا لیا ہے۔ میں تو صرف اتنا مانگتا ہوں کہ ترکی کو اس کے عوام کے حوالے کر دیا جائے اور انہیں ہماری سیاست اور قومی امور پر اپنے کلچر اور اپنی شخصیت کی چھاپ نقش کرنے کی اجازت دی جائے۔ یہ کوئی بڑا مطالبہ تو نہیں ہے۔"

اور اس بھاری بھرکم شخص کے منہ سے یہ باتیں بہت ہی سادہ سی معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ خاص لہجہ میں انگریزی بول رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے جرمنی سے پولیٹیکل سائنس میں پوسٹ گریجویشن کی تھی۔ ہم پہلی بار ۱۹۸۱ء میں باسفورس یونیورسٹی میں ملے تھے جہاں اتاترک کانفرنس ہو رہی تھی۔ "ترکی میں سیکولرازم کے اصل مسائل کیا ہیں؟" میں اپنے اصل موضوع پر آ گیا۔

"سیدھی سی بات ہے" وہ بولا "یہ ہمارے احساس کمتری کی پیداوار ہے۔ سیکولرازم اتاترک کی ایجاد نہیں ہے جیسے لوگ سمجھتے ہیں۔ بلکہ اس کی جڑیں عثمانی سلطنت میں ہیں۔ ۱۶۹۹ء اور ۱۸۱۷ء میں یورپی طاقتوں سے ترکی کی شکست کے بعد یہ احساس کمتری پیدا ہوا۔ اس کا اندازہ یورپ میں پہلے ترک سفیر یری سکیز محمد چلبی کی ڈائری سے ہو جاتا ہے۔ وہ پیرس اور ویانا کے سفر کے بعد مغربی تہذیب کی علمی برتری کا قائل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے مغربی کلچر اور مغربی فکر نے مقامی کلچر اور نصب العین کی جگہ لینا شروع کر دی تھی۔ ترکی کے دینی علما کی اکثریت میں اتنی علمی استعداد نہیں تھی کہ وہ نئے افکار جنم دیتے یا مغربی ٹیکنالوجی اور سائنس کا کوئی تخلیقی امتزاج پیدا کرتے۔ اس کے ردعمل میں وہ اور بھی کٹر مذہبی اور تنگ نظر ہو گئے۔ اس

طرح مغرب کی پسندیدگی میں اضافہ ہوا۔
ترکی میں مغربی اثرات عثمانی خلفاء کے محلوں سے شروع ہوئے۔ اس کو علمی جواز ان ترک نوجوانوں نے مہیا کیا جو اس دور کے آخر میں نمودار ہوئے۔ یوں تو ان کی تعداد صرف چھ تھی لیکن ان کا اثر ورسوخ بہت زیادہ تھا۔ یہ پہلے ترک تھے جنہوں نے روشن خیالی کا تصور قبول کیا اور اسلام کے ساتھ اس کا امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ نوجوان تھے سناسی، علی سعاوی، فواد پاشا، مصطفےٰ رشید، ضیا پاشا اور نامک کیما۔ یہ کوئی بڑے فلسفی یا مفکر نہیں تھے۔ لیکن دینی علماء، جو بڑی حد تک عثمانی سلطنت کے زوال کا باعث تھے علمی اور فکری طور پر اس لائق نہیں تھے کہ حکومت کی بداعمالیوں پر نکتہ چینی کرسکتے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ تمام علماء ہی ایسے تھے کیونکہ کچھ ایسے بھی تھے جو یہ کام کررہے تھے۔ مثلاً احمد جودت پاشا نے مدرسہ کے نظام تعلیم پر سخت تنقید کی اور کہا کہ یہ نظام ایسے لوگ پیدا نہیں کرسکتا جن کی ہمارے مستقبل کو ضرورت ہے۔ ان کی دلیل تھی کہ ماضی کو بھلائے بغیر ترکی کے مستقبل کی تعمیر شروع کرنا چاہیے۔ لیکن ایسے علماء کم تھے۔ اکثریت ان علما کی تھی جو سلطنت کی کارروائیوں کی حمایت میں فتوے دینے پر ہی خوش تھے۔ بہر حال سلطان نے خود جو شروع کیا تھا اتاترک اس کا ہی نتیجہ تھے۔ وہ اس وقت ترکی کی ضرورت تھے اور وہ سینکڑوں سال کے زوال کا شاخسانہ تھے۔

''اتاترک نے سیکولرازم کو نجات کی الٰہیات کے طور پر پیش کیا۔ یورپ کے معجزات قبول کرنے کا مطلب تھا کہ یورپی نظریات کے تمام اجزا قبول کرلیے جائیں۔ جدید ہونے کا مطلب ہوا کہ ہوبہو مغربی بن جاؤ۔ مغرب کی نقالی ایسی کی گئی کہ ان کا لباس اور ان کا اٹھنے بیٹھنے کا انداز بھی اختیار کرلیا گیا۔ انہوں نے ترک تاریخ کو بھی مذہبی تاریخ سے الگ کرکے قومی تاریخ کے طور پر پڑھانا شروع کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح وہ یورپی تاریخ میں جگہ بنالیں گے۔ اس طرح اتاترک اور ان کے حامیوں نے اسلام کو اسی نظر سے دیکھا جس نظر سے مغرب دیکھتا تھا کہ ایک تاریک، رجعت پسند اور عیسائیت کا دشمن مذہب۔

میں نے سوال کیا کہ اتاترک کا انقلاب تاریخ کے دوسرے انقلابوں سے کیسے مختلف تھا؟

''اصل بات تو یہ ہے کہ کمال اتاترک کا انقلاب مختلف نہیں تھا۔ مثلاً وہ ایران کے موجودہ انقلاب سے مختلف نہیں تھا۔ پورا انداز وہی تھا۔ وہی ایک طلسماتی شخصیت تحریک کی قیادت کرتی ہے۔ پھر انقلاب کامیاب ہوجاتا ہے تو خالص انقلابی نظریہ پر عمل کرانے کے لیے

وہی تشدد کا راستہ اور ایک ہی آدمی کے ہاتھ میں یہ فیصلہ کرنے کا اختیار کہ کیا انقلابی ہے اور کیا انقلاب دشمن۔ ترکی میں بھی یہی ہوا۔ اتاترک ایک طرح سے خدا بن بیٹھے۔ ان کا نعرہ تھا ''میں ترکی ہوں، مجھے نقصان پہنچانے کا مطلب ترکی کو نقصان پہنچانا ہے۔'' انہوں نے اعلان کیا کہ اسلام، اس کے علما اور اس کی روایات ترک قوم کو جدید بنانے کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ انہوں نے پرانے نظام کو اسی طرح تباہ کرنے کی کوشش کی جیسے آج ایرانی ملاّ شاہ کے نظام کو تباہ کررہے ہیں۔ اس کے بعد وہ دور شروع ہوا جب ان انقلابی اصلاحات کو مستحکم کر دیا گیا۔''

یہ دور ۱۹۲۴ء سے ۱۹۴۹ء تک رہا۔ اس عرصے میں اسلامی سرگرمیوں اور اسلامی فکر پر پابندی تھی۔ اس عرصے میں جو نسل پیدا ہوئی وہ اسلامی روایات مذہب اور ترکی کے اسلامی ماضی سے بالکل ہی نابلد تھی۔ بعض دانشور تو اپنے ماضی کو دور جاہلیہ کہتے تھے۔ اس سے ترکی کی علمی اور فکری زندگی پر بہت برا اثر پڑا۔ سب سے افسوس کی بات تو یہ ہے کہ اس دور میں جو دانشور پیدا ہوئے وہ آنکھیں بند کر کے مغربی فکر کی پیروی کر رہے تھے۔ عثمانی دور میں جو نقالی کی گئی تھی کم سے کم اس کا پس منظر ترکی تو تھا۔

سرکاری حمایت اور اپنی تعداد کی وجہ سے یہ نسل آج بھی بہت اثر رکھتی ہے۔ یہ اوسط درجہ کے لوگ ہیں لیکن امریکہ اور یورپی ملکوں میں ان کی بہت پذیرائی ہوتی ہے۔ مغربی مؤرخ اتاترک کے انقلاب کو مکمل انقلاب کہتے ہیں اور لوزین کے معاہدے کو، جہاں ترکی کو سیکولر جمہوریہ تسلیم کیا گیا تھا، بیسویں صدی کا عظیم معجزہ قرار دیتے ہیں اور وہ اتاترک کو فیبین سوشلسٹ کہتے ہیں۔ یہ احمقانہ باتیں سیکولر جدیدیت پسندوں کو اور بھی مضبوط کرتی ہیں اور وہ اور بھی زیادہ شدّت کے ساتھ عوامی جذبات کچلنے لگتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''ایک اعتبار سے غفلت کا یہ دور ۱۹۴۹ء میں ختم ہوا۔ انقلاب کے بعد تمام دینی مدرسے بند کر دیئے گئے تھے اور ان کی جگہ سیکولر اسکول کھول دیئے گئے تھے۔ یورپ کی طرح ترکی میں بھی دینی مدرسوں کو حکومت سے باہر آزادی کے ساتھ کام کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ البتہ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب ترکی جمہوری دور میں داخل ہوا تو بہت سے سیاست دانوں نے دینی مدرسے قائم کرنے کی مہم چلائی۔ انہیں امام خطیب اسکول کہا جاتا تھا۔ تیس سال بعد قرآن، تفسیر اور احادیث کے ساتھ اسلامی تاریخ کی تعلیم کی اجازت دی گئی۔ عوام کی طرف سے اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ ۱۹۷۵ء میں تعلیمی اصلاحات کی گئیں جن میں عربی اور دینیات وغیرہ پڑھانے

کے لیے با قاعدہ نصاب تیار کیا گیا۔ ۱۹۸۰ء کے فوجی انقلاب کے بعد دینی مدرسوں کے طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے یونیورسٹیوں میں داخلے کی اجازت مل گئی۔''

''میرا خیال ہے ترکی کا مستقبل یہ طلبہ ہی طے کریں گے؟'' اس نے کہا۔

''مگر مجھے تو ان مدرسوں پر بھروسہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا ''میں نے پاکستان اور دوسرے مسلم ملکوں میں جو مدرسے دیکھے ہیں وہ تو دقیانوسی بنیاد پرست ہی پیدا کرتے ہیں۔ یہ تمہارے امام خطیب کے طلبہ ان سے مختلف کیسے ہوں گے؟''

''ان مدرسوں اور ہمارے امام خطیب اسکولوں کو خلط ملط نہ کرو۔ ترکی میں ہم ان مدرسوں کی خامیاں جانتے ہیں۔ امام خطیب کے طلبہ روایتی اسلام کے بجائے کلاسیکی اسلام کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔''

اس نے بتایا کہ یہ طلبہ جدید افکار، سائنس اور معاشرتی علوم بھی پڑھتے ہیں۔ وہ مدرسوں کے طلبہ کی طرح اپنا اسلام ماتھے پر سجائے نہیں پھرتے۔ وہ جدید دنیا کو سمجھتے ہیں۔ امام خطیب کے فارغ التحصیل ایک اور اعتبار سے بھی نہایت اہم ہیں۔ اتاترک نے رومن رسم الخط رائج کر کے ترکی کے لوگوں کو اپنی تاریخ اور اپنے دین سے محروم کر دیا تھا۔ وہ اپنی دینی اور تاریخی کتابیں تک نہیں پڑھ سکتے تھے کیونکہ وہ عربی رسم الخط نہیں جانتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنی تاریخ بھی مغربی مورخوں کے حوالے سے پڑھی۔ اس طرح وہ اپنی جڑوں سے کٹ گئے تھے۔''

اس نے مذاق میں میرے بازو پر ہاتھ مارا۔ ''امام خطیب سے پڑھنے والے عربی رسم الخط جانتے ہیں اس لیے وہ اصل کتابیں پڑھ سکتے ہیں۔ وہ ماضی کو حال سے اور مستقبل سے ملا سکتے ہیں۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ ترکی کا مستقبل ان سے ہی وابستہ ہے۔''

''آپ اس خطرناک ماحول میں کیسے پڑھ سکتے ہیں جب یونیورسٹی کے دروازے پر ٹینگ گشت کر رہے ہوں۔'' میں نے سوال کیا۔

''یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔'' وہ بولا ''جب بھی سیکولرازم کو خطرہ ہوتا ہے یا یہ خطرہ ہوتا ہے کہ اسلامی پارٹی کے لوگ کامیاب ہو جائیں گے تو فوراً سڑکوں پر ٹینک آ جاتے ہیں۔ انہوں نے تو لڑکیوں کے سر پر رومال باندھنے کا مسئلہ بھی ٹینکوں کے ذریعہ ہی حل کیا۔ ہماری تو عادت پڑ گئی ہے اس کی۔ ہمارے لیے ترکی تو باسفورس ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''باسفورس میں دو قسم کی لہریں چلتی ہیں۔ اوپر والی لہر بحر اسود سے چلتی ہے اور بحر مرمرا تک جاتی ہے جو نیچے ہے۔ لیکن نچلی لہر مخالف سمت میں جاتی ہے کیونکہ دونوں سمندروں کی کثافت میں فرق ہے۔ بحر مرمرا میں نمک زیادہ ہے اس لیے اس میں کثافت بھی زیادہ ہے۔ اسی طرح ترکی کی اوپر والی سطح سیکولر ہے لیکن نچلی سطح پر ہم مسلمان ہیں۔ چنانچہ باسفورس کی طرح حاکم اور محکوم دو مختلف سمتوں میں سفر کر رہے ہیں۔''

''تمہیں امید ہے کہ امام خطیب کے فارغ التحصیل لوگ اس دائرے کو چوکور کر دیں گے؟'' میں نے سوال کیا۔ مجھے ڈر تھا کہ میرے دوست کا یہ جوش وخروش اسے پھر جیل نہ لے جائے۔

''ہم عثمانیوں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ وہ باسفورس کے بارے میں خوب جانتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے گندے پانی کے نکاس کا بہت اچھا انتظام کر رکھا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ ہنسا۔

میں بھی ہنس دیا۔

''یہ سچ ہے۔ پورے استنبول کا گندہ پانی نچلی لہر کے ساتھ بحر اسود میں چلا جاتا ہے۔ وہ صاف پانی اوپر کی لہر سے لیتے ہیں جسے حماموں وغیرہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ کاش ہم بھی کوئی ایسا نظام اپنا لیں جو سیکولرازم کی گندگی بہا دے اور تازہ خیالات۔''

''ہے نا مزے کی بات۔ ٹرکش باتھ، جہاں جسم کے ایک ایک مسام سے میل نکل جاتا ہے۔''

''میرا ارادہ بھی حمام جانے کا ہے۔'' میں نے زور سے کہا۔

زیادہ گرمیوں میں استنبول بہت گرم ہو جاتا ہے اور پسینے سے جسم چپکنے لگتا ہے۔ تعلیم سے زیادہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو آپ کے اندر آگ بھڑکا دے۔ یونیورسٹی کے پہلے دورے کے بعد سے میں اس آگ میں پھنک رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا ''کسی حمام کا پتہ بتاؤ۔'' اور اس نے جواب دیا۔ چلو میرے ساتھ آؤ۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم میلوں پیدل چلے جا رہے ہیں۔ ہر قدم پر میں پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو معلوم ہوا کہ ابھی تو آدھا گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔ فرخ نے اٹھارویں صدی کے ایک پبلک حمام کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بری حالت میں نظر آ رہا تھا۔ میں کسی ایسے حمام کی توقع تو نہیں کر رہا تھا۔ فرخ نے بتایا کہ اسے کئی سال سے استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ میرے ساتھ یہ اس کا خوف ناک مذاق تھا۔ ہم اندر گئے تو موٹی موٹی دیواروں کی وجہ سے اس کے اندر ٹھنڈ

تھی۔ اس غار نما عمارت کے تین حصے تھے۔ ایک میں کپڑے اتارے جاتے، دوسرے میں خوب پسینہ لایا جاتا اور تیسرا ٹھنڈے پانی میں غوطہ لگانے کے لیے تھا۔ یعنی یہ اس زمانے میں ہوتا تھا جب یہ حمام چلتا تھا۔ ہم کپڑے اتارنے والے کمرے میں داخل ہوئے وہاں کبھی بیچ میں فوارہ ہوتا تھا اور کافی بنانے کے لیے ایک طاقچہ تھا۔ ایک نیچے کے دروازے سے ہم ٹھنڈے کمرے میں داخل ہوئے۔ یہاں کپڑے دھوئے جاتے تھے اور گرم کمرے میں جانے کی تیاری کی جاتی تھی۔ گرم کمرے میں مساج کے لیے سنگ مرمر کی سل پڑی تھی۔ نہانے کے لیے چھوٹا حوض تھا اور تخلیہ کے لیے حجرہ سا تھا۔ فرخ نے ہنستے ہوئے پانی کی سپلائی کے نظام کی وضاحت کی۔ حوض کی دیوار میں پتھر کا ایک طاقچہ سا بنا تھا جسے مسلک کہتے تھے جہاں سے پکی مٹی کے پائپوں کے ذریعہ ٹھنڈا پانی ''ایلک لک'' کے ''سوگک لک'' غسل خانوں کے فواروں میں جاتا تھا۔ میں اپنے خیالوں میں سوچنے لگا کہ سکون آور مساج کے بعد میں پسینے میں بھیگ رہا ہوں۔ پھر تازہ ٹھنڈے پانی سے غسل کرر ہا ہوں۔ مگر افسوس، کئی صدیوں کی تاخیر ہو چکی تھی۔

میں وہاں سے اتنا ہی پسینے میں چچپاتا باہر نکلا جیسے اندر گیا تھا۔ اب میں نے تکلف نہیں کیا اور فرخ سے اجازت لی تاکہ تقسیم چوک میں اپنے ہوٹل میں جا کر اچھی طرح نہاؤں۔ پہلے میں نے ایک ٹیکسی کو اشارہ کیا۔ مگر دیکھا کہ اس میں پہلے ہی زیادہ آدمی بیٹھے ہیں تو بس کی طرف بھاگا۔ بس رکتے ہی انسانوں کا ایک ہجوم اس کی طرف دوڑا۔ ابھی میں سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ میں نے اپنے آپ کو بس کے اندر لوگوں میں پھنسا کھڑا دیکھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ بس کدھر جا رہی ہے۔ اب میں پسینہ میں شرابور اور تھکا ہوا ہی نہیں تھا اب تو مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ مجھے جس غذا کی ضرورت تھی وہ کوئی اچھی مچھلی کھلانے والا ریستوراں ہی مہیا کرسکتا تھا۔

ریستوراں کا برآمدہ باسفورس کے سامنے تھا۔ میں دنیا بھر میں سب سے زیادہ مدہوش کردینے والے منظر میں کھڑا صبح کی تازہ ہوا کھا رہا تھا۔ میں ریلنگ پر جھکا ہوا سامنے نظارے دیکھ رہا تھا۔ ہر سمت ایک اور نظارہ سامنے آجاتا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کسی بھی انسان کا دل ان نظاروں سے کیسے بھر سکتا ہے۔ لیکن وہاں ایک اور نظارہ بھی تھا۔ میں وہاں سے ہٹا تو میں نے دیکھا۔ ایک بوڑھا آدمی ہر چیز سے بے نیاز ہاتھ میں کتاب لیے اس پر جھکا ہوا تھا۔ میں بہت حیران ہوا۔ قریب جا کر دیکھا تو وہ ڈاک کے ٹکٹوں کا البم تھا۔ وہ میگنی فائنگ گلاس سے

ایک خاص ٹکٹ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ٹرکش منی ایچر کا لفظ میرے دماغ میں بیٹھ گیا اور میں مسکرانے لگا۔ اس بوڑھے نے محسوس کرلیا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے اوپر دیکھا اور گلاس اٹھا کر راکی کا ایک گھونٹ لیا۔ پھر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

''زبردست البم ہے۔'' میں نے چمڑے کی جلد والے اس کور کو دیکھتے ہوئے کہا جس میں کسی مرصع اور سونے کے نقوش والی کتاب کو ہونا چاہیے اور واقعی اس میں ایسی ہی کتاب تھی۔

''میں نے اوائل عمر سے ہی ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنا شروع کر دیے تھے۔ میرے پاس عثمانی سلطنت کا جاری کیا ہوا پہلا ٹکٹ بھی ہے۔ یہ ۱۸۶۳ء میں جاری کیا گیا تھا۔ یہ ٹکٹ ترک تاریخ کی داستان ہیں اور یہی میری یادیں ہیں۔ میں انہیں دیکھتا ہوں تو میری تاریخ میرے سامنے آجاتی ہے۔ میں اپنی زندگی کے واقعات بھی ان کے اندر دیکھتا ہوں، وہ زندگی جو میں نے گزاری ہے۔''

بزرگ نے ورق الٹ الٹ کر مجھے ٹکٹ دکھانا شروع کیے۔ ان میں اتاترک کی تصویروں والے بہت سے ٹکٹ تھے۔ ایک بہت بڑا ٹکٹ ایسا تھا جس پر ایک عبارت درج تھی۔ ''یہ کیا لکھا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ ترک نوجوانوں سے اتاترک کا خطاب ہے۔ میرے کہے بغیر ہی ان بزرگ نے اپنا میگنی فائنگ گلاس اٹھایا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ ''ترک نوجوانو، تمہارا پہلا فرض یہ ہے کہ ہمیشہ ترکی کی آزادی اور ترک جمہوریہ کی حفاظت کرتے رہو۔ یہ تمہارے وجود اور تمہارے مستقبل کی اساس ہے۔ یہ اساس تمہارا سب سے قیمتی خزانہ ہے۔ مستقبل میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو تمہیں اس خزانے سے محروم کرنا چاہیں گے۔ اگر کبھی تمہیں اپنی آزادی اور اپنی جمہوریہ کی حفاظت کرنا پڑی تو حالات اور امکانات کی پروا کیے بغیر اپنا فرض ادا کرنا۔ حالات اور امکانات بہت ہی مشکل ہوسکتے ہیں۔ تمہاری جمہوریہ اور تمہاری آزادی کے خلاف سازشیں کرنے والے پہلے کتنی ہی فتوحات حاصل کر چکے ہیں۔ جبر وتشدد اور حیلے بہانوں سے تمہارے وطن کے قلعے اور تمہاری بندرگاہیں تمہارے دشمن اپنے قبضے میں لے سکتے ہیں اور سب سے افسوس ناک بات یہ ہوگی کہ ملک کے اندر حکم راں غلطیاں کرنے لگیں اور ان میں غدار گھس جائیں اور یہ لوگ اپنے ذاتی مفادات کے لیے دشمنوں کے ساتھ مل جائیں۔'' وہ ٹھہرے۔ جس جوش وخروش کے ساتھ وہ پڑھ رہے تھے اس سے میں سمجھ گیا تھا کہ یہ پوری تقریر انہیں زبانی یاد

ہے۔ ''ترک نوجوانو، تم جو ترکی کا مستقبل ہو، ان مخدوش حالات میں بھی ترکی کی آزادی اور ترک جمہوریہ کی حفاظت تمہارا فرض ہے۔ تمہیں جس طاقت کی ضرورت ہے وہ تمہارے عالی نسب خون میں موجود ہے جو تمہاری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔''

اسی جوش میں انہوں نے ایک اور راکی کا آرڈر دے دیا۔ میں نے جیب سے سگار نکالا اور سکی ہوئی مچھلی کا آرڈر دیا۔ ہم کئی گھنٹے بیٹھے کھاتے پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ وہ بزرگ ایک ایک ٹکٹ اٹھاتے اور پھر تاریخ میں کھو جاتے۔ ان کا نام تھا بایان محبّ اور وہ چورانوے برس کے تھے اور کمال اتاترک کے شیدائی تھے۔ ''میں ۱۸۹۴ء میں مدلی میں پیدا ہوا۔ مدلی ایجین سمندر میں ایک بہت ہی خوبصورت جزیرہ ہے۔'' انہوں نے کہا'' مدلی عثمانی سلطنت میں تھا اور وہاں کے باشندے زیادہ تر کاشت کار تھے اور زیتون کی کاشت کرتے تھے۔ میرے والد اسکول کے ڈائریکٹر تھے۔ وہ بہت ہی مذہبی آدمی تھے اور لوگ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ ہمارا بہت بڑا خاندان تھا۔ میری والدہ، میری خالہ اور نانی دادی کے مکان ساتھ ہی ساتھ تھے۔ گھروں کے پیچھے جو باغیچے تھے وہ ہمارے لیے ایک بہت بڑا باغ بن گئے تھے۔ ہم ایک باغیچے سے دوسرے باغیچے میں بھاگے پھرتے تھے۔''

''اپنے بچپن کی سب سے اہم بات جو آپ کو یاد ہو وہ کیا تھی؟'' میں نے سوال کیا۔

''سب سے اہم؟ نیا آئین۔'' انہوں نے کسی جھجک کے بغیر جواب دیا۔ ''۱۹۰٦ء میں ترک نوجوانوں نے سلطان عبدالحمید کو مجبور کیا کہ وہ آئین تبدیل کریں۔ میرے والد نے مجھے بتایا کہ اب ہمیں زیادہ آزادی حاصل ہوگئی ہے۔ اس سے پہلے میں نے آزادی کا لفظ کبھی نہیں سنا تھا۔ مجھے یاد ہے میں نے والد سے پوچھا تھا۔ آزادی کیا ہوتی ہے؟''

بایان باتیں کیے چلے جارہے تھے۔ ایک موقع پر میں نے کہا وقت بہت ہوگیا ہے۔ اب مجھے چلنا چاہیے تو وہ پریشان ہوگئے۔ ''نہیں ابھی نہیں، تم میرے ساتھ چلو اور میرے گھر ٹھہرو۔''

میں انکار کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ہم ان کے عالی شان مکان پر پہنچ گئے۔ وہ قدیم عثمانی نوادرات سے سجایا گیا تھا۔ ڈرائنگ روم کی بالکنی سے باسفورس نظر آتا تھا۔ دو براعظموں کی روشنیاں سامنے جھلملا رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ اتنے خوبصورت نظارے میں کوئی سو کیسے سکتا ہے۔ اس گھر میں ایک ہی فرد اور تھی اور وہ تھی ان کی پوتی زہرا۔ وہ استنبول یونیورسٹی کی گریجویٹ تھی اور ان دنوں کانفرنسوں کا انتظام وانصرام کرنے کا کام کرتی تھی۔ ''مجھے

اپنے بچوں کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگتا ہے۔'' بایان نے کہا۔ ''لیکن سوائے زہرا کے سب انقرہ میں رہتے ہیں۔ ان سے کم کم ہی ملاقات ہوتی ہے۔'' زہرا کافی لینے چلی گئی تو ہم پھر نکٹوں کی بات کرنے لگے۔

میں ان کے گھر سات دن ٹھہرا۔ وہ نکٹوں سے اکتائے تو اپنے خاندان کی تصویریں لے کر بیٹھ گئے۔ میں بیسویں صدی کے شروع کی تصویریں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایک تصویر میں پورا خاندان دادی کے گرد جمع تھا۔ اس وقت بایان آٹھ نو برس کے ہوں گے۔ وہ چچا زاد بچوں کے ساتھ دادی کے پیچھے کھڑے تھے۔ تمام مرد اور بچے ترکی ٹوپی اوڑھے ہوئے تھے۔ عورتوں کے سر ڈھکے ہوئے تھے۔ ایک تصویر میں بایان ترکی ٹوپی، لمبا کوٹ اور بوٹ پہنے بیٹھے تھے اور ان کی بڑی اور چھوٹی بہن ان کے ساتھ کھڑی تھیں۔ ان تصویروں پر ہجری سن ۱۳۴۹ء لکھا تھا۔

ایک شام انہوں نے بتایا کہ یہ تصویریں ۱۹۱۱ء میں اتاری گئی تھیں۔ میں نے اسکول کی تعلیم مکمل کر لی تھی اور بیل جیم یونیورسٹی لیج میں معدنیات کی انجینئرنگ کے شعبے میں داخلہ لینے والا تھا۔ میں ترکی ٹوپی اوڑھے یونیورسٹی میں گھومتا پھرتا تھا۔ یہ عجیب سا لگتا تھا۔ ہم الگ سے نظر آتے تھے۔ ہم وہاں چند ہی ترک طلبہ تھے اور سب اکٹھے ہی رہتے تھے۔ ہم میں سے اکثر ٹیکنکل مضامین پڑھ رہے تھے۔ چند ہفتے بعد ہم سب نے ترکی ٹوپی اتار دی اور ہیٹ اور ٹائی لگالی۔'' انہوں نے کچھ اور تصویریں میرے سامنے رکھ دیں۔ ایک تصویر میں وہ ہیٹ اور ٹائی لگائے کھڑے ہیں۔ سر کے چھوٹے بالوں کے بیچ میں مانگ نکلی ہوئی ہے۔ ایک اور تصویر میں کئی ترک طلبہ کھڑے ہیں۔ سب نے خوبصورت سوٹ پہنے ہوئے ہیں اور بیچ میں مانگ نکالی ہوئی ہے۔ عثمانی رسم الخط میں ان پر ۲۷ فروری ۱۹۱۱ء کی تاریخ لکھی ہوئی ہے۔

میں تصویریں دیکھ رہا تھا تو انہوں نے بتایا کہ پہلی جنگ عظیم کی وجہ سے ان کی پڑھائی رک گئی تھی۔ جرمنی نے فوراً ہی لیج پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن انہوں نے ترک طلبہ کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا۔ انہیں ترکی بھیجنے کے لیے خاص ٹرین کا انتظام کیا گیا۔ جنگ کے بعد جب میں نے تعلیم مکمل کی تو اس وقت تک لیج تبدیل ہو چکا تھا۔ اب ترکی دشمن ملک تھا اور اس کے باشندوں کے ساتھ برا سلوک کیا جا رہا تھا۔ ہمیں اپنی تعلیم جاری رکھنے کی اجازت نہیں دی گئی اور ترک طلبہ کے لیے ٹیکنیکل تعلیم ممنوع قرار دے دی گئی۔ مجھے کامرس پڑھنے پر مجبور کیا گیا اور میں نے دوبارہ فرسٹ ائیر سے پڑھائی شروع کی۔''

وہ جنگ بند ہونے کے بعد ۱۹۲۳ء میں واپس ترکی آئے۔انہوں نے ایوالک شہر میں رہائش اختیار کی۔اور ۱۹۳۸ء میں اس شہر کے مئیر منتخب ہوئے۔''اس زمانے میں مجھے اتاترک کو جاننے کا موقع ملا۔'' بایان جب بھی اتاترک کا نام لیتے ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی آجاتی۔'' وہ اکثر ہمارے شہر آتے تھے اور ہمارے ساتھ ہی ٹھہرتے تھے۔ وہ بہت ہی جادوئی شخصیت رکھتے تھے۔ جب سے انہوں نے گیلی پولی میں ترک فوج کو اکٹھا کیا تھا اور یورپی طاقتوں کو شکست دی تھی میں انہیں پسند کرنے لگا تھا۔ اب میں ان کی اصلاحات کا بھی حامی ہوگیا تھا۔ میں رسم الخط تبدیل کرنے، ترکی ٹوپی کی جگہ ہیٹ اوڑھنے اور عورتوں کا نقاب اتروانے کا بھی حامی تھا۔لیکن یہ تو ظاہری چیزیں تھیں اتاترک تو ترک قوم کا ذہن اور فکر ہی تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ وہ ترکوں کو صحیح معنی میں ایک قوم بنانا اور اسے دوسری قوموں کی برداری میں برابر کا مرتبہ دلانا چاہتے تھے۔''

وہ کمال اتاترک کے ایسے شیدائی تھے کہ کہنے لگے میں نے اپنی زندگی انہیں کے انداز میں ڈھال لی۔ میں نے ایک اسکول کھولا جس میں فرانسیسی اور ریاضی پڑھائی جاتی تھی۔ میں نے جنرل مینیجر یونین کوآپریٹیوز کے عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد بھی کمال اتاترک کی فکر کو فروغ دینے کا کام جاری رکھا۔کمال اتاترک کے بغیر ترکی نہیں بن سکتا تھا۔ ان کے بغیر یہ ختم ہوجاتا۔''

بایان کی صحبت مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ بہت اچھے میزبان ہی نہیں تھے بلکہ ایک اچھے انسان بھی تھے اور طویل زندگی میں جتنے بھی تجربے حاصل ہوئے تھے انہیں وہ اپنے لوگوں کی بھلائی کے کام میں لاتے تھے۔ انہوں نے دو زندگیاں گزاری تھیں ایک کمال اتاترک سے پہلے اور دوسری اتاترک کے بعد۔ تاریک اور روشن۔ وہ اپنے آپ کو سیکولر مسلمان کہتے تھے اور کہتے تھے کہ انہوں نے کئی بار قرآن پڑھا ہے۔لیکن وہ یہ بات نہیں چھپا سکتے تھے کہ اسلام کے بارے میں ان کے خیالات مغربی مستشرقین سے مختلف نہیں ہیں۔ ان کے خیال میں اسلام مغربی تہذیب کا تضاد ہے اور وہ صحیح کہتے تھے کہ اسلام کے نام پر بہت سے جرم کیے گئے ہیں۔لیکن میرے خیال میں یہ بات غلط ہے کہ اسلام آج کی دنیا کو کچھ نہیں دے سکتا۔ بایان کی نظر میں جتنی بھی اچھی چیزیں ہیں وہ اتاترک کی وجہ سے ہیں اور جتنی خرابیاں ہیں وہ عثمانیوں کی وجہ سے۔

میں ۱۹۸۰ء کی دہائی میں کئی بار استنبول گیا۔ میں اسلامی تاریخ، آرٹس اور کلچر کے بین الاقوامی مرکز کی دعوت پر وہاں جاتا تھا۔ یہ مرکز تنظیم اسلامی (OIC) نے قائم کیا تھا۔ دعوت اس مرکز کے ڈائریکٹر اکمل الدین احسان اوغلو کی طرف سے آتی تھی۔ اکمل الدین نہایت خوش لباس اور اسمارٹ آدمی تھے اور شکل وصورت سے بین الاقوامی سفارتی نمائندے نظر آتے تھے۔ انہوں نے یہ مرکز تاریخی محل یلدیز میں قائم کیا تھا اور اس کے لیے اس محل کی خوب آرائش کی گئی تھی۔ یلدیز کی تاریخ بھی عجیب تھی۔ وہ تھیٹر بھی رہ چکا تھا اور میوزیم بھی۔ وہ چڑیا گھر بھی رہا تھا اور لکڑی کاٹنے کا کارخانہ بھی۔ اکمل الدین کی محنت کی وجہ سے یہ مرکز تنظیم اسلامی کا نہایت کامیاب ادارہ بن گیا تھا۔ وہاں اکثر کوئی نہ کوئی کانفرنس ہوتی رہتی تھی۔ اکمل الدین مجھے عثمانی پاشا کا بہترین نمونہ معلوم ہوتے تھے۔ وہ مرکز کے ڈائریکٹر کے علاوہ وہ استنبول یونیورسٹی میں سائنس کی تاریخ کے پروفیسر بھی تھے۔ وہ کئی جلدوں میں عثمانی دور کی سائنسی تحریروں پر تحقیقی کتاب لکھ رہے تھے۔ اس کے علاوہ عثمانی ریاست، معاشرہ اور تہذیب کی تاریخ پر بھی کام کر رہے تھے۔ یہ کتاب بھی دو جلدوں میں لکھنے کا ارادہ تھا۔

عثمانی خاندان نے چھ سو سال حکومت کی۔ جو اس لیے ایک بڑا کارنامہ تھا کہ اس علاقے میں حکومتیں اور سلطنتیں ایک دو نسلوں سے زیادہ نہیں چلتی تھیں۔ عثمانی تاریخ میں ان کی دولت اور طاقت میں اتار چڑھاؤ آتا رہا۔ تیرھویں صدی کے اوائل میں ان کی حکومت اناطولیہ کے ایک چھوٹے سے علاقے تک محدود تھی۔ لیکن پندرھویں صدی کے آخر تک وہ موجودہ ترکی اور بلقان کے بیشتر علاقوں تک پھیل چکی تھی۔ سولہویں صدی میں وہ ایک وسیع سلطنت بن چکی تھی، جو سلوویکیہ سے نوبیا تک اور الجزائر سے کاکیشیا تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ اپنی فوجی طاقت کی وجہ سے ہی اہم نہیں تھی بلکہ کلچر، فنون لطیفہ اور سائنسی علوم میں بھی اس کا بڑا مقام تھا۔ اس نے مختلف رنگوں اور نسلوں اور مختلف زبانیں بولنے والی قوموں کو یک جا کر دیا تھا۔ اس سلطنت میں مذہبی اور ثقافتی تنوع برقرار رکھا جاتا تھا اور عوام پر کبھی جبر وتشدد نہیں کیا گیا۔ کبھی کسی کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا گیا اور نہ کسی کو ترکی کی ثقافت اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا۔

بایان عثمانیوں میں ہر طرح کی برائیاں تلاش کرتے تھے اور اکمل الدین کہتے تھے کہ مغرب اور مسلمانوں دونوں نے عثمانیوں کو بدنام کیا ہے۔ اس کی اچھائیوں اور اس کے کارناموں کو جان بوجھ کر چھپایا گیا ہے۔ اسے یورپ کا مرد بیمار کہا گیا۔ مسلمانوں کے ذہن

میں بٹھا دیا گیا کہ اسلامی تہذیب کے زوال کا باعث عثمانی ہی تھے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ عثمانی سلطنت کا عروج ۱۶۰۰ء تک رہا، اس کے بعد کے تین سو سال اس کے زوال کی داستان ہے۔ اکمل الدین اور ان کے ساتھی اسے دوسری ہی نظر سے دیکھتے ہیں۔ بیس سال کی تحقیق کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اٹھارویں صدی کے آخر تک اسی طرح سائنس اور علم و تعلیم کا دور دورہ رہا۔ اس کے بعد ترجموں وغیرہ کے ذریعہ مغربی افکار قبول کرنا شروع کر دئے گئے۔ عثمانی سلطنت کا زوال مسلمانوں کے عمومی زوال کا حصہ تھا جس کے بعد اسلامی دنیا پر مغربی طاقتوں کا قبضہ ہوگیا۔

اکمل الدین مانتے تھے کہ عثمانیوں میں بھی خرابیاں تھیں۔ وہ اور ان کے ساتھی ان خرابیوں کو انسانی کمزوری کے طور پر دیکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر ہم انسان کی حیثیت سے ان کا مطالعہ کریں تو تاریخ اور روایات پر ہمارا اعتماد پختہ ہو جائے گا۔ اکمل کہتے تھے کہ اتاترک کے حامیوں نے عثمانیوں کو بدنام کر کے خود ترکی کو بدنام کر دیا ہے۔ قوم دو حصوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔ ایک اتاترک کے حامی اور دوسرے ان کے مخالف۔ اس طرح اسلام اور مغرب کو بھی ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے۔ ایک بار انہوں نے کہا ”آپ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے۔ آج ہم جسے مغرب کہتے ہیں اسلام کے بغیر اس کا بھی کوئی وجود نہیں ہوسکتا تھا۔ یورپ کی روشن خیالی کہاں سے آئی ہے۔ کیا یہ ان فلسفیوں کے دماغ سے بنی بنائی نکل آئی ہے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اسے تکمیل تک پہنچایا؟ نہیں۔ اس کی بنیاد اسلام نے رکھی۔ اسلام نے یورپ کو وہ سکھایا جو وہ سائنس، فلسفہ اور تعلیم کے متعلق جانتا تھا۔ ابتدا سے شروع کر کے اسلام نے یورپ کو سکھایا کہ چیزوں کو عقل و استدلال سے کیسے سمجھو، تہذیب اور بربریت کے درمیان کیسے فرق کرو اور سول سوسائٹی کی بنیادی خصوصیات کیسے معلوم کرو۔ اسلام نے تدریس اور فلسفہ کا طریق کار یورپ کو سمجھایا۔ یونیورسٹی کا تصور بھی اسلام نے ہی یورپ کو دیا۔ حتیٰ کہ تدریسی اصطلاحات بھی یورپ نے اسلام سے لی ہیں۔ اسلام نے یورپ کو تجربی طریق کار سے ہی متعارف نہیں کرایا بلکہ اس نے اسے عملی ریسرچ کی اہمیت بھی بتائی۔ کوپرنکس نے جس کی بنا پر انقلاب برپا کیا تھا ریاضی کی وہ تھیوری بھی مسلمانوں کی پیش بینی کا ہی نتیجہ تھی۔ اسلام نے یورپ کو دواؤں اور جادو کا فرق بتایا۔ جراحی کے آلات ایجاد کیے اور یہ سکھایا کہ ہسپتال کیسے چلائے جاتے ہیں اور عثمانیوں نے اس سلسلے میں نہایت اہم خدمات انجام دیں۔“

لبرل انسان دوستی جس پر یورپ بہت فخر کرتا ہے اور اتاترک کے حامی جس کی نقالی کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ بھی اسلام کا ہی تحفہ ہے ۔ اکمل الدین نے کہا ''یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد کی لبرل انسان دوستی کا ماخذ اسلام کی ''آداب تحریک'' ہے، جس میں لوگوں کو انسان بننے کے آداب سکھائے جاتے تھے ۔ اسلام نے قانون اور معاشرتی علوم کی تدریس کا انتہائی پیچیدہ نظام ہی وضع نہیں کیا جس کے مطابق مدرسوں اور جامعات میں تعلیم دی جاتی تھی بلکہ ایسے ادبی اور ثقافتی حلقے اور مجلسیں بھی بنائیں جہاں مجلسی آداب کی تربیت ہوتی تھی۔ مدرسوں میں صرف ونحو، علم کلام، شعروشاعری، تاریخ، طب اور فلسفہء اخلاق پڑھائے جاتے تھے ۔ یورپ نے من وعن یہ نظام ہم سے لیا ہے ۔ اس لیے مغربی اور اسلامی انسان دوستی میں کوئی فرق نہیں ہے ۔ چنانچہ اگر اتاترک کے حامیوں کو لبرل انسان دوستی سے دلچسپی تھی تو انہیں اپنی تاریخ پر نظر ڈالنا چاہیے تھی بجائے اس کے کہ مغرب کی نقالی کرتے ۔''

میں نے ترکی کے ان دوروں میں اندازہ لگایا کہ ترکی ان ظاہری اختلافات سے باہر نکلنا چاہتا ہے۔ میں بہت سے دانشوروں سے ملا۔ ان میں علی بلاج بھی تھا جو پبلشر تھا اور ایک اخبار میں کالم لکھتا تھا۔ وہ انگریزی بالکل نہیں جانتا تھا مگر ہم کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے کی بات سمجھ لیتے تھے۔اس کے گرد ہر وقت نوجوانوں کا ہجوم رہتا تھا جن میں ایسے نوجوان بھی ہوتے تھے جو ترجمان کا کام کرتے رہتے۔ ''کیا آپ اتاترک کے نظریہ کے خلاف ہیں؟'' ایک دن میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''میں خلاف ہوں نہ متفق۔'' اس نے کسی جھجک کے بغیر جواب دیا ''مجھے یا میرے گروپ کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمارا تعلق تو سیکولرازم اور مذہب دونوں کی غیرانسانی خصوصیات سے ہے۔ ہمارا مسئلہ عام لوگوں کی فلاح و بہبود ہے۔سماجی انصاف، مساوات، صاف ستھرا ماحول، ہماری تہذیب کی انسانی بنیاد، اسلامی روایات کا تنقیحی احیا اور علوم وفنون اور شعر وشاعری کا فروغ ہمارا مسئلہ ہے۔ ہم ان موضوعات کا اسلامی متبادل تلاش کر رہے ہیں اور یہی وہ چیزیں ہیں جن سے ترکی کے جوانوں، بوڑھوں، مسلمانوں اور غیر مسلموں سب کو غرض ہے۔''

صاف معلوم ہو رہا تھا کہ جب بھی انتخابات ہوئے تو بلاج جیسے مسلمان دانشور رائے دہندوں پر ضرور اثر انداز ہوں گے ۔ چنانچہ اس کا فائدہ نجم الدین اربکان جیسے لوگوں کو پہنچا جو میکینکل انجینئر تھے اور جن کے والد ایک مذہبی عالم تھے۔ وہ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں وزیر مملکت اور

نائب وزیر اعظم رہ چکے تھے اور بھی بہت سے لوگ تھے جو اپنے اپنے شہروں کے میئر منتخب ہو گئے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اسلام اب ترکی کی زندگی میں اہم رول ادا کرنے والا ہے۔

میں جب بھی ترکی جاتا میرا پہلا شوق عود کر آتا۔ میں ترک حمام جانا چاہتا تھا۔ فرخ ہر صبح میرے پاس آجاتے اور اپنے ساتھ لے جاتے۔ ایک دن وہ مجھے سلطان حمام لے گئے جہاں رنگین شیشوں کی چھت صوفیانہ ماحول پیدا کر رہی تھی۔ ماہر تعمیر نے بہت اوپر دیواروں میں روشندان بنا کر مدھم روشنی کا سماں پیدا کیا تھا۔ یہ روشنی سنگ مرمر کے فرش پر طرح طرح کے نقش بناتی تھی۔

''آپ جانتے ہیں کہ ورسائے میں جب ایک بھی ٹوائلٹ نہیں تھا تو استنبول میں اسٹیم باتھ موجود تھا۔'' فرخ نے کہا۔

''ہاں۔ میں یقین کر سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

سلطان سلیمان ذی شان کے دور (۱۵۲۰ء تا ۱۵۶۶ء) میں ترکی میں سینکڑوں پبلک حمام تھے۔ خود سلطان نے ماہر تعمیر سنان کو حکم دیا تھا کہ ان کا حمام سلطنت کی شان و شوکت کے مطابق عالی شان بنایا جائے۔ اٹھارھویں صدی کے آغاز تک استنبول میں چودہ ہزار پانچ سو حمام تھے۔ ان میں سے ڈیڑھ سو بہت بڑے اسٹیم باتھ تھے۔''

فرخ مجھے تمام حمام دکھانا چاہتا تھا۔ ہم سارے شہر میں گھومتے پھرتے تھے۔ چغالا وغلو حمام استنبول میں سب سے بڑا تھا جس کا رنگا رنگ اندرونی حصہ حیرت انگیز طور پر خوبصورت تھا۔ بیرونی دروازے کے ساتھ سنگ مرمر کا فوارہ تھا۔ مرکزی غسل خانے کے گنبد کے آٹھ ستون تھے جو پتھر کے بجائے کسی نقاش کا شاہکار نظر آتے تھے۔ گلات سرائے کا حمام تاریخی حماموں میں سب سے زیادہ آراستہ و پیراستہ حمام تھا۔ فرخ کے بقول اسے سلطان بایزید دوم نے ۱۴۸۱ء میں بنوایا تھا۔ یہ ان کے محل کے ساتھ ہی تھا۔ یہ حمام ایک فلم کے سیٹ کے طور پر استعمال کیا جا چکا ہے۔ معلوم ہوا کہ استنبول میں جتنی مسجدیں ہیں اتنے ہی حمام ہیں۔ مسجدوں کے گنبدوں کے ساتھ ان کے گنبد بھی شہر میں دور سے نظر آتے ہیں۔ مگر فرخ نے تہیہ کر رکھا تھا کہ مجھے اس حمام کی طرف نہیں لے جائے گا جہاں ابھی تک غسل کیا جاتا ہے۔

میری اور میرے اجمالی ساتھیوں کی پریشانی یہ تھی کہ ہم مسلمان کی حیثیت سے سیکولرازم کے ساتھ سمجھوتہ کیسے کر سکتے ہیں۔ ہم عام مسلم حلقوں کے اس خیال سے کیسے بچ سکتے ہیں جو

سیکولرازم کو گناہ سمجھتا ہے۔ یہ باتیں ترکی کے حوالے سے کی جاتی تھیں۔ میں نے یہ سوال پرویز منظور سے کیا۔

''دیکھو مولوی صاحب،'' پرویز نے جواب دیا۔ ''ہم مسلمان اسے قبول کر سکتے ہیں اور نہ رد کر سکتے ہیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اس کا مطالعہ کریں۔ ہمیں ''ظلم'' کی اپنی نوعیت کے حساب سے اسے دیکھنا چاہیے۔''

یہ ایک نیا تصور تھا جس پر میں نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ ناانصافی کے اسلامی تصور کے مطابق ظلم ایک پیچیدہ اصطلاح ہے۔ پرویز کے بقول اس کے معنی کی چار سطحیں ہیں۔ اس کا مطلب کسی کے ساتھ برائی کرنا، برا سلوک کرنا یا ناانصافی کے ساتھ پیش آنا بھی ہے۔ لیکن اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ کسی کو اس کا جائز حق نہ دینا، کسی شخص یا کسی چیز پر جبر کرنا حتی کہ حق اور امانت میں خیانت کرنا بھی ظلم ہے۔ اس کو اور وسیع کیا جائے تو وہ جبر و استبدا، گمراہی، مالی استیصال اور جہالت پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ اپنے خلاف کوئی کام کرنا بھی ظلم ہے۔ اسلام میں یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ اس اعتبار سے اسلامی تناظر میں سیکولرازم مسلم معاشروں کے لیے ایک خاص معنی رکھتا ہے۔

''ہم جو چاہتے ہیں وہ مغرب کے استبداد سے آزادی ہے اور اس استبداد کا تعلق اس استبداد سے بھی ہے جو ہم نے اپنے اوپر روا رکھا ہوا ہے۔ یہ استبدا ہے سنہرے ماضی کا خواب۔ یہ استبداد ہے ایک خاص تاریخی دور میں منجمد شریعہ اور وہ استبداد جو ہمارے وہ حکمراں کرتے ہیں جنھیں مغرب نے ہمارے اوپر مسلط کر رکھا ہے۔ ایک طرف تو ہمیں اس ظلم کو دیکھنا چاہیے جو ہم اپنے عوام پر کرتے ہیں اور دوسری طرف ہمیں مغرب کا جائزہ لینا چاہیے جس نے نو آبادیاتی طاقت کے طور پر ہمارے معاشروں پر اپنے ادارے اور اپنا ڈھانچہ مسلط کیا ہے۔''

''مغرب اور غیر مغرب دونوں کو ہر قسم کے ظلم سے نجات ملنا چاہیے اور ایک کی نجات کا انحصار دوسرے کی نجات پر ہے۔ اس لیے ہمیں یہ کرنا چاہیے کہ ایک ہی وقت میں اسلامی اور آفاقی نجات کے لیے ظلم کے تصور پر غور کرنا چاہیے۔'' میں نے بڑے زور شور سے کہا۔ پھر میں نے اپنے آپ کو روکا ''لیکن ہمیں یہ احتیاط کرنا چاہیے کہ جس طرح مغرب نے اسلام اور مسلمانوں کو ہوا بنا دیا ہے اسی طرح کہیں ہم بھی مغرب کو ہوا نہ بنا دیں۔''

''مولوی صاحب،'' پرویز نے جواب دیا۔ ''یہی وجہ ہے کہ میں کہہ رہا ہوں کہ ہمیں ظلم

کے تصور پر توجہ دینا چاہیے۔ مغرب کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اسلام اس کی ضد ہے۔ یعنی سیکولرزم کے مقابلے میں اسلام ایک برائی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کو بھی مغرب اور سیکولرزم کو اسلام کی ضد نہیں سمجھنا چاہیے۔ برائی کا کوئی حل نہیں ہے۔ برائی کو ختم ہونا ہی چاہیے۔ انسانی برادریاں برائی کی بنیاد پر رشتے استوار نہیں کرسکتیں کہ ہم روشنی میں ہیں اور وہ تاریکی میں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ سیکولرازم کے اندر جو خرابیاں اور ظلم پنہاں ہے اس کی قلعی کھولیں، سیکولرازم کو بذات خود برائی اور ظلم نہ سمجھیں۔''

''ایک اور بات کی وضاحت بھی ضروری ہے۔'' پرویز نے کہا'' ہمیں افکار اور ان افکار کی ترویج کرنے والے ذرائع کے درمیان موجود رشتے کا بھی صحیح ادراک کرنا چاہیے۔ مثلاً سیکولرازم کے تصور کو جدیدیت سے الگ نہیں کیا جاسکتا کہ سیکولرازم جدیدیت کی وساطت سے ہی پھیلا ہے۔ سیکولرزم سے مسلمانوں کی کراہت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سیکولرازم اور جدیدیت ایک ہی مانے جاتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ سیکولرازم انہیں جدیدیت کی طرف لے جائے گا اور ہم نے حال ہی میں مابعد جدیدیت کے خیالات سے جو سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ جدیدیت کا مطلب ہے مغربی تاریخ کی فوقیت، ہماری روایات سے بیزاری اور سائنس، ترقیات اور آزادی کی مغربی تعریف وتشریح کی برتری۔ ہمیں سیکولرازم کو جدیدیت کی موجودہ تعبیر سے الگ کرکے دیکھنا چاہیے۔

''اگر ہم مذہب اور سیاست کو الگ کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں نیا وسیلہ تلاش کرنا پڑے گا۔ ایسا وسیلہ جس کی جڑیں اسلامی فکر میں ہوں۔ وہ جدیدیت جو ہماری تاریخ اور ہماری روایات سے مناسبت رکھتی ہو۔''

''تم نے اندازہ لگایا کہ اس طرح ہم غریبوں کے کندھوں پر کتنا بوجھ پڑ جائے گا۔'' میں نے اپنا سر پکڑتے ہوئے کہا۔'' ہمیں اپنی روایات میں ظلم تلاش کرنا پڑے گا۔ ہمیں مغربی افکار، مغربی اداروں اور مغربی میکنزم میں ظلم تلاش کرنا پڑے گا۔ ہمیں سیکولرازم کے اندر اداراتی ناانصافیاں چھاننے کے لیے ایک ہی وقت میں اسے قبول بھی کرنا پڑے گا اور رد بھی۔ ہمیں اپنی جدیدیت خود تخلیق کرنا پڑے گی۔ ہمیں بیک وقت دو سطح پر زندہ رہنا ہوگا۔ ایک سطح پر اس بات کا شعور ہوگا کہ تاریخ نے ہمارے حال کو کس طرح متاثر کیا۔ دوسری سطح یہ کہ زمانہ حال کے نتائج مستقبل پر کیسے اثر انداز ہوں گے۔''

میں نے سیکولرازم کے بارے میں زیادہ مصالحانہ رویہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس وقت مجھے بالکل خیال نہیں آیا کہ میں تو سیدھا تاریخ کے ظلم کا مقابلہ کر رہا ہوں۔ بڑے شک وشبہ کے ساتھ میں اس راستے پر چلا تھا۔ مگر اس کہانی کا اختتام راستے میں ہی میرا انتظار کر رہا تھا اور یہ انتہائی خطرناک انداز میں میرے سامنے آیا۔

باب۔ ۱۳

شیطانی آیات

میں ۱۹۸۸ء کے آخر میں ایک کانفرنس میں شرکت کے بعد کوالالمپور سے واپس آ رہا تھا۔ بیس گھنٹے کا سفر تھا۔ وقت کاٹنے کے لیے میں نے سلمان رشدی کا ناول The Satanic Verses پڑھنا شروع کردیا۔ میرے دل میں سلمان رشدی کی بڑی عزت تھی۔ میں اسے مظلوموں کا ترجمان سمجھتا تھا۔ مجھے اس کا ناول Midnight's Children اچھا لگا تھا۔ اس کا دوسرا ناول Shame اوسط درجہ کا تھا۔ اس سے اس کی پاکستان سے نفرت کا اظہار ہوتا تھا۔ اس لیے میں نے ملے جلے جذبات کے ساتھ نیا ناول پڑھنا شروع کیا۔

یہ طویل اور پیچیدہ ناول فضا میں ایک ہوائی جہاز کے پھٹنے سے شروع ہوتا ہے۔ دو مرکزی کردار جبریل فرشتہ اور سلادین چمچہ انگلستان کے ساحل پر گرتے ہیں اور معجزانہ طور پر بچ جاتے ہیں۔ فرشتہ ہندوستانی فلموں کا ایکٹر ہے جسے عجیب وغریب خواب آتے رہتے ہیں۔ چمچہ بھی ایکٹر ہی ہے مگر انگلستان میں۔ وہ ٹی وی کمرشلز میں اپنی آواز استعمال کرتا ہے۔ ہم لندن میں سلادین کی حرکتیں دیکھتے ہیں۔ ادھر جبریل فرشتے کے طور پر اپنے کام کرتا رہتا ہے اور آخر میں تباہی کا شکار ہوتا ہے۔ فرشتہ اپنے خوابوں میں بھٹکتا رہتا ہے۔ ناول کا جو اصل بیانیہ ہے اس میں اسلام کے آغاز اور رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کا ذکر ہے۔ آخر میں دونوں کردار بمبئی واپس آجاتے ہیں اور نیکی اور بدی پر بحث کرنے لگتے ہیں۔

جوں جوں میں پڑھتا جاتا تھا میرا غصہ بڑھتا جاتا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے گالیاں

دے رہا ہے۔ ناول کے بیچ میں ہی مجھے احساس ہوا کہ مجھے جو چیزیں بھی عزیز ہیں رشدی ان سب کی توہین کر رہا ہے۔ ہر لفظ کا نشانہ میں تھا اور میری ذات پر حملہ تھا۔ گھر پہنچنے تک میرا دل اور دماغ غصّے، خوف اور نفرت سے بھر گیا تھا۔ ابھی میں گھر پہنچا ہی تھا کہ میرل ڈیویس کا فون آ گیا ''خوش آمدید۔'' میرے مُنھ سے مشکل سے ہیلو نکلا اور پھر رشدی، ناول نگار میرے مُنھ سے نکلا۔ میرل نے کہا، ''اس کا کیا قصہ ہے؟'' اس کا ناول ابھی میں نے پڑھا ہے۔''

اس ناول میں کیا بات تھی جس نے مجھے اتنا پریشان کر دیا تھا؟ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ رشدی اپنے ناول میں اسلام پر نکتہ چینی کرے، یہ کام تو میں خود بھی کر چکا تھا۔ مجھے اور دوسرے تمام مسلمانوں کو جو بات بری لگی وہ یہ تھی کہ رشدی نے جان بوجھ کر رسول اللہؐ کی زندگی کے واقعات کو مسخ کیا ہے اور نہایت ہی بیہودہ اور فحش انداز میں مسخ کیا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اگر وہ اپنا ناول بنانے کے لیے آنحضرتؐ کی زندگی کے دو چار واقعات اور قرآن کی ایک دو آیات لے لیتا تو بھی مجھے تکلیف نہ ہوتی۔ لیکن رشدی نے تو حیات طیبہ کو مسخ کرنے اور مسلمانوں کے تشخص کو تباہ کرنے میں مصدقہ تاریخ کے ساتھ بھی ظلم کیا ہے اور اس بہانے سے زخموں پر اور بھی نمک چھڑکا ہے کہ یہ واقعات خواب میں پیش آتے تھے اور یہ کہ رشدی جیسے حقائق پیش کر رہا ہے۔

رشدی نے آنحضرتؐ کا نام بھی وہ استعمال کیا ہے جو قرون وسطٰی کے عیسائی ان کی بے حرمتی کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ رشدی یہاں تک ہی نہیں گیا ہے بلکہ اس نے تو قرآن کی آیات میں بھی تحریف کی ہے۔ ناول کے جس حصے نے مسلمانوں کو سب سے زیادہ مشتعل کیا وہ رسول اللہؐ کی ازواج مطہرات کے بارے میں ہے۔ اس نے کسی کو بھی نہیں بخشا ہے۔ جس قسم کی باتیں اس نے لکھی ہیں انہیں دہرایا نہیں جا سکتا۔ اسلام اور اس کی تاریخ کا تھوڑا بہت علم رکھنے والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ رشدی جان بوجھ کر تاریخ کو مسخ کر رہا ہے اور ایک منصوبہ کے تحت مسلمانوں کے پیغمبر کی بے حرمتی کر رہا ہے۔ یہ اہانت اتفاقی نہیں ہے بلکہ دانستہ طور پر کی گئی ہے۔

رسول اللہؐ کی زندگی مسلمانوں کی صرف شناخت ہی نہیں ہے اور مسلمان اپنی زندگی ان کے نقش قدم پر ڈھالنا اپنی سعادت ہی نہیں سمجھتے بلکہ ان کی حیات طیبہ ہی ان کے مسلمان ہونے کی قطعی دلیل ہے۔ آنحضرتؐ اور ان کی شخصیت اسلام کا نمونہ ہے اور ہر مسلمان اپنے آپ کو

براہِ راست ان سے منسوب کرتا اسی لیے ناول کا ہر لفظ اور ہر حصہ مجھے اپنی ذات پر حملہ معلوم ہوا۔ اس کا مقابلہ ضرور کرنا چاہیے۔ جس طرح کوئی بھی قوم اپنی نسل کشی کے خلاف اپنا دفاع کرتی ہے اسی طرح مسلمانوں کو اجتماعی طور پر اس کے خلاف احتجاج کرنا چاہیے۔ یہ ان کا ثقافتی تشخص تباہ کرنے کی سازش ہے۔ چنانچہ ناول چھپتے ہی اس کے خلاف ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ فون پر فون آرہے تھے۔ ''آپ کیا کر رہے ہیں؟'' دوست احباب پوچھ رہے تھے۔ ''مسلمانوں کے دفاع کے لیے آپ کو باہر نکلنا چاہیے۔'' مجھے اتنی باتیں سننا پڑیں کہ میں شکاریوں میں پھنسی لومڑی بن گیا۔ جس طرح لومڑی بے جان ہو کر بیٹھ جاتی ہے اسی طرح میرا بھی حال ہوا۔ میں یونہی ادھر ادھر بھٹکنے لگا۔ مجھے کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ ناول کو واپس لیا جائے، کچھ کہتے تھے کہ ناول کے ساتھ ''خبردار'' کی چٹ لگا دی جائے اور کچھ کہہ رہے تھے کہ رشدی پر توہین رسالت کا مقدمہ چلایا جائے۔ ہمارے دوستوں کا خیال تھا کہ اس کا جواب علمی انداز میں دیا جائے۔ ''مسلمان کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم رشدی کا مقابلہ کریں اور اس کی اس حرکت کا جواب دیں۔'' پرویز بار بار کہہ رہے تھے۔

اس کے بعد ۱۴ فروری ۸۹ء کا دن آگیا۔ مجھے وہ دن اس لیے یاد نہیں رہے گا کہ اس کا تعلق محبت سے ہے بلکہ اس لیے یاد رہے گا کہ اس کا تعلق موت سے ہے۔ آیت اللہ خمینی کے فتوے نے صرف رشدی کی موت کا اعلان ہی نہیں کیا بلکہ اس نے ایک دانشور کی حیثیت سے مجھے بھی معدوم کر دیا۔ اس فتوے نے ثابت کیا کہ مسلم دانشور اتنے کمزور و ناتواں ہیں کہ وہ اپنے عقائد کا دفاع بھی نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد جو ہنگامہ شروع ہوا اس نے اس پرانی کہاوت کو ثابت کر دیا کہ جب دو ہاتھی لڑتے ہیں تو گھاس ہی ماری جاتی ہے۔ میں گھاس تھا اور وہ ہاتھی تھے جو لڑ رہے تھے۔ میں ان کے بیچ فٹ بال بنا ہوا تھا۔ آیت اللہ اور رشدی اس علاقے کے لیے لڑ رہے تھے جو میری انسانیت کی آخری پناہ گاہ تھی۔ کیونکہ ان دو انتہاؤں کے بیچ اسلام کی وہ انسان دوست تعبیر تھی جس کا نمونہ رسول اللہؐ کی ذات گرامی تھی اور موجودہ زمانے میں جس کی تعبیر کے احیا کے لیے میں نے اپنی زندگی وقف کر دی ہے۔ دونوں اپنی اپنی انتہاؤں کے لیے لڑ رہے تھے۔ رشدی سیکولر فکر کی انتہاپسندی کے لیے اور آیت اللہ شریعت کی انتہاپسندی کے لیے اور اس سے صرف ان کو ہی نقصان نہیں پہنچ رہا تھا بلکہ اخباروں اور ٹیلی وژن نے جو طوفان اٹھایا

تھا اس نے مذہبی اور نسلی کشیدگی پیدا کر دی تھی اور تمام مسلمانوں کے اندر چاروں طرف سے گھر جانے کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا ہو رہی تھی۔ ہم سخت پریشان تھے۔ پرویز خاص طور سے پاگل ہو رہے تھے۔ جس وقت فتوے کی خبر آئی اس وقت گلزار حیدر اوٹوا میں اپنے گھر صوفے پر لیٹے ٹیلی وژن دیکھ رہے تھے۔ وہ تو اس صدمے سے واقعی بیمار ہو گئے۔ اس کے بعد وہ ایک سال بستر سے نہیں اٹھ سکے۔ میرل کے تو تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی۔ اس نے اس پر مضامین لکھنا شروع کیے۔

ہم بے اختیار تھے اور روزانہ اپنے آپ کو یہ یاد دلاتے تھے کہ ہم کمزور ہیں۔ ٹی وی پر خبریں دیکھنا ہمارے لیے ایک عذاب تھا۔ یہ بے عزّتی کی انتہا تھی۔ ہم اس عذاب سے بچ بھی نہیں سکتے تھے۔ آخر معلوم تو ہونا چاہیے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ ایک دن ہم ٹی وی کے سامنے بیٹھے تھے۔ میرل بھی ہمارے ساتھ تھی، وہ بھی اس کرب اذیت میں ہمارا ساتھ دے رہی تھی۔ بی بی سی کے چینل فور پر پروگرام Opinion چل رہا تھا۔ رشدی کی ناول نگار دوست فے ویلڈن بول رہی تھی۔ وہ کیمرے کے سامنے بیٹھی بولے چلی جا رہی تھی۔ اس کا ایک ایک لفظ ہمارے دلوں پر چُھری بن کر گر رہا تھا۔ ہم میں سے کسی میں یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ اٹھتا اور ٹی وی بند کر دیتا۔ وہ ہمارا مذاق اڑا رہی تھی۔ اس کی یہ تقریر بعد میں اخباروں اور رسالوں میں بھی چھپی۔ بلکہ اسے پمفلٹ کی شکل میں بھی چھاپا گیا جس کا عنوان تھا Sacred Cow اس نے اسلام کو چھٹی صدی میں اللہ کی طرف سے نازل ہونے والے ان بے لچک قوانین کا مجموعہ قرار دیا جس کے مطابق زندگی گزارنے اور سوچنے سمجھنے سے انکار کرنے والے یا ان پر شک کرنے والے جہنم کی آگ میں جھونکے جائیں گے۔ ان قوانین پر کوئی شک نہیں کر سکتا۔ شک کی سزا بہت ہی سخت ہے۔ صرف کتاب کھولو اور پڑھو، اپنے دماغ سے بالکل نہ سوچو۔ اس کا نعرہ ہے ”قتل کرو، قتل کرو۔“ اس کے مقابلے میں بائبل سوچنے کا موقع دیتی ہے۔ قرآن تبدیلی، تشریح، اپنے آپ کو جاننے حتیٰ کہ آرٹ کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ میرے ناول مسلم ملکوں میں نہیں بکتے“ وہ بکے جا رہی تھی۔

اس پر میرل نے چیخ ماری۔ ”اس لیے کہ وہ ناول بکواس ہوتے ہیں۔“

ٹیلی وژن اسکرین پر ویلڈن بولے جا رہی تھی۔ ”میری باتیں انہیں پسند نہیں آتیں اور پسند آئیں بھی کیسے۔ یہ تو ایک ناپاک کافر عورت کی باتیں ہیں۔ اگر ہم قرآن کی بات مانیں تو

عورتیں جنت میں جائیں گی ۔لیکن چونکہ جنت مردوں کے لیے ہے جہاں انہیں کنواری حوریں اور شراب ملے گی اس لیے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہاں بالغ عورتیں کیا کریں گی۔'' میں نے اور میرل نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ یہ تو لاعلمی کی انتہا ہے۔'' ویلڈن نے طنز کے ساتھ کہا'' میرا خیال ہے مسلمانوں کا دل صحیح جگہ پر ہی ہے۔بس یہ ہے کہ وہ بہت ہی سال خوردہ ہے۔عرب ہوں یا پاکی ہوں سب مسلمان ایک ہی جیسے ہیں۔'' اب وہ نسلی نفرت پھیلا رہی تھی۔'' وہ اس کثیر ثقافتی، کثیر مذہبی حقوق پر اصرار کرتے ہیں اور اپنے اسکول قائم کرتے ہیں۔ہمیں اس غیر ترقی یافتہ اور خوف سے بھرے مذہب کی تعلیم کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔''

یکدم مجھے احساس ہوا کہ ٹی وی کی آواز کے ساتھ ایک اور آواز بھی آرہی ہے۔ مڑ کر دیکھا تو میرل کے گالوں پر موٹے موٹے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ سسکیاں لے رہی تھی۔ میرے بچے اور میری بیوی بھی وہاں آگئے تھے۔ وہ اسے تسلیاں دینے لگے۔'' اسے کس نے اجازت دی ہے۔کوئی کیسے اجازت دے سکتا ہے۔ وہ کہے جا رہی تھی۔ مجھے امام غزالیؒ یاد آگئے جو ویلڈن کے برعکس شک کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے۔انہوں نے کہا ہے کہ ان لوگوں کی زبان سے زیادہ جہالت پھوٹتی ہے جو سمجھتے ہیں کہ وہ سب کچھ جانتے ہیں حالانکہ وہ کچھ بھی نہیں جانتے۔'' دنیا میں بڑے ظالم لوگ ہیں۔'' میں نے کہا۔'' ویلڈن سراسر ظلم کر رہی ہے۔''

میرل دو دن روتی رہی۔'' میں اسے اپنے دماغ سے نہیں نکال سکتی'' وہ آنسو بھری آواز میں بار بار کہتی تھی ۔'' میں اس کی شکایت کروں گی ۔ حالانکہ اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ مگر وہ نفرت پھیلا رہی ہے۔'' ایک دن اس نے کہا۔

بہرحال میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ میں نے ویلڈن کے پمفلٹ میں مسلمانوں کی جگہ یہودی لکھ دیا اور اسے لے کر اپنے ایک وکیل دوست کے پاس گیا۔'' اگر اس میں واقعی یہودی کا لفظ ہوا تو تم فوراً عدالت کے کٹہرے میں ہوگے۔'' وکیل نے کہا۔ پھر میں نے مسلم کی جگہ'' ہم جنس پرست'' لکھ دیا اور ٹیلی وژن پر اپنے ایک دوست کے پاس لے گیا۔ وہ بولا۔ اگر یہ لفظ لکھو گے تو تم سڑک پر نہیں نکل سکتے۔ اسی قسم کا جواب مجھے اس وقت ملا جب میں نے کہا کہ اگر اس جگہ سیاہ فام لکھ دیا جائے۔ اس کا مطلب ہے کہ ویلڈن مسلمانوں کے خلاف جو چاہے کہہ سکتی ہے۔ مسلمان ہی سب سے آسان نشانہ ہیں۔ میں نے New Statesman and Society کے ایڈیٹر اسٹوارٹ وائر کو فون کیا۔ طالب علمی کے زمانے میں اس سے میری پہلی

ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت وہ ٹائمز میں کام کررہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں ویلڈن کے جواب میں مضمون لکھنا چاہتا ہوں۔ کہنے لگا ''میں جانتا ہوں تم بہت زوردار لکھو گے۔ لیکن اس نے جو کہا ہے وہ سچ ہی تو ہے۔'' اس کا مطلب یہ ہوا کہ سیکولرازم کی قطعیت پر سوال نہیں کیا جاسکتا۔ پھر میں نے آبزرور، انڈی پنڈنٹ اور ٹائمز کو فون کیا۔ میری بات سننے کو کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ یعنی کچھ لوگوں کو اپنی بات کہنے کی زیادہ آزادی ہے۔ تاریخ کے ''ظلم'' نے مجھے جکڑ لیا تھا۔

ویلڈن اکیلی تو نہیں تھی۔ رشدی کے حق میں، یا مسلمانوں کے خلاف جو بھی مضمون چھپتا مجھے اپنی ذات پر حملہ محسوس ہوتا۔ لیکن بعض مسلمان جو کررہے تھے وہ بھی برداشت کے قابل نہیں تھا۔ جب کچھ لوگوں نے بریڈ فورڈ میں کتاب جلائی تو میں غصے سے تلملا اٹھا۔ کیا وہ برطانیہ اور یورپ میں کتابیں جلانے کی تاریخ سے واقف نہیں ہیں اور مجھے اس وقت اور بھی غصہ آیا جب کلیم صدیقی نے مسلم نوجوانوں کو اکسایا کہ وہ فتوے پر عمل کریں۔ دونوں جانب سے میرے اوپر ظلم کیا جارہا تھا۔

''ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' میرل بار بار سوال کررہی تھی۔

''ہمیں وہی کرنا چاہیے جو ہمیشہ مسلمانوں نے کیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ہم اس گھٹیا کتاب کے ظلم کا مقابلہ کتاب سے کریں گے۔ ہم دونوں ملائشیا کے ٹیلی وژن کے لیے ایک پروگرام کرنے وہاں جانے والے تھے۔ ہم جانتے تھے کہ وہ پروگرام ہماری آمدنی کے لیے ضروری ہے لیکن یہ بھی معلوم تھا کہ اگر اس وقت ہم یہاں سے بھاگے تو ہم اپنے فرض سے بھاگیں گے۔ ہم اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کرسکیں گے۔

آخر ہم نے اپنی روایت پر عمل کیا۔ اسلام میں کتاب کے ذریعہ کتاب کا مقابلہ کرنے کی روایت ہمیشہ سے موجود ہے۔ غزالی اور ابن رشد نے یہی کام کیا تھا۔ یہ مقابلہ صدیوں جاری رہا۔ آخر فتح غزالی کی ہوئی اور یہ کوئی تنہا مثال نہیں ہے۔ تاریخ میں مسلمان اہل کتاب اسی معنی میں کہے جاتے ہیں۔ اسلام میں علم کا حصول بھی عبادات میں شامل ہے۔ ہم اپنی تاریخ پر چل رہے تھے۔ ہم اس کتاب کو جواب اپنی کتاب ''خلاص'' سے دیں گے۔

میں مارچ ۱۹۸۹ء میں کتاب Distorted Imagination: Lessons from the Rushdie Affair لکھنے بیٹھ گیا۔ ہمارا موقف واضح تھا۔ ہم کتاب پر پابندی کے خلاف تھے۔ مسلمان کی حیثیت سے ہم سنسر شپ کے حق میں نہیں تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ کتاب پر

پابندی سے وہ کتاب چھپالی جائے گی اور اس کی مانگ اور بھی بڑھ جائے گی اور برطانوی قانون میں اہانت کا جو تصور تھا ہمیں اس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔ اسلام میں بھی اس کی کوئی نظیر نہیں تھی ۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ رشدی کی کتاب نے پہلی بار توہین رسالت کا مسئلہ کھڑا کیا تھا ۔ بہر حال طاقت ور لوگوں کو اس قسم کے قانون کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ ان کے پاس تو اتنی طاقت اور اتنا اثر ہوتا ہے کہ وہ اپنی مقدس روایات کے خلاف لکھی جانے والی کتاب یا فلم کو شائع ہونے یا ریلیز ہونے سے پہلے ہی روک سکتے ہیں ۔ ہم رشدی کی کتاب کو سمجھنا اور سمجھانا چاہتے تھے ۔ غیر مسلموں کو بالکل نہیں معلوم تھا کہ اس کتاب میں کیا خرابیاں ہیں ۔ اس کے جواز پر بھی غور کرنا چاہتے تھے ۔

میں نے بریڈ فورڈ، مانچسٹر اور مشرقی لندن میں مسلمان نوجوانوں سے بات کی ۔ معلوم ہوا کہ آیت اللہ کا فتویٰ ان کے لیے فخر کا باعث بن گیا ہے ۔ ان کی زندگی میں پہلی بار اس فتوے نے انہیں طاقت اور شناخت کا احساس دلا یا ہے ۔ انہوں نے دیکھا کہ فتوے سے پہلے جو لوگ ان کا مذاق اڑاتے تھے اب غور سے ان کی بات سنتے ہیں ۔ ان کی طرف سے ہتک کی کارروائیاں بڑھ گئی تھیں مگر وہ بات سنتے تھے ۔ جو ناشر پہلے مذاق اڑاتے تھے وہ اب معافیاں مانگنے لگے تھے ۔

لیکن ہم ان نوجوانوں کو بتانا چاہتے تھے کہ ان کی یہ طاقت اور فخر سراب سے زیادہ کچھ نہیں ہے ۔ آیت اللہ کا اسلام آج کی اصل دنیا سے تعلق نہیں رکھتا ۔ وہ تاریخ کے بوسیدہ صفحات میں بند اور اپنے وقت میں منجمد دقیانوسی عقائد سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس کے ماننے والے اپنے خیالات میں اتنے پختہ ہوتے ہیں کہ وہ نئے زمانے کے مطابق اس میں کسی قسم کی تبدیلی کی اجازت ہی نہیں دیتے ۔ وہ اپنی اور اپنے مذہب کی دردمندی اور ترحم کے ایسے قائل ہوتے ہیں کہ اس پر عمل ہی نہیں کرتے ۔ انہیں اپنے مقصد کی سچائی پر اتنا یقین ہوتا ہے کہ وہ سوچ ہی نہیں سکتے کہ دوسروں کے مقاصد بھی نیک ہوسکتے ہیں ۔ جس قسم کا اسلام وہ پیش کرتے ہیں اس کی بنیاد قرآن اور رسول اللہؐ کی تعلیمات پر نہیں ہوتی بلکہ مسلم سامراج کی تاریخ پر ہوتی ہے ۔ اس سے عارضی طاقت ہی حاصل ہوتی ہے ۔ ہم مسلم نوجوانوں کو ایک اور قسم کی طاقت سے روشناس کرانا چاہتے تھے ۔ یہ ہے علمی روایات اور موجودہ زمانے کو سمجھنے کی طاقت اور پھر ہم اپنی ثقافت اور اپنی تاریخ کی اخلاقی عظمت بھی بحال کرنا چاہتے تھے ۔ اس عمل سے ہمارے بارے

میں مغرب کی فکر تبدیل ہوگی اور پھر قدرتی طور پر ہم ایک دوسرے کو سمجھ سکیں گے۔ اس کے بعد معلوم ہوگا کہ بہت بڑا جرم کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ہی ہم آپس میں بات کرسکیں گے کہ اس جرم کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔

ہم نے کتاب پر ایک سال کام کیا۔ اب ہم متواتر ہونے والے حملوں کا مقابلہ کرسکتے تھے۔ بلکہ ہم ان سوالوں کا جواب بھی دے سکتے تھے جو اسکول سے واپس آکر بچے کرتے تھے۔ ''اسلام کا یہ مطلب تو نہیں ہے ابو؟'' یا ''مسلمان ایسا تو نہیں سوچتے؟'' اس سال میں گھر سے ہی نہیں نکلا۔ شیو بنائے بھی کئی کئی دن ہوجاتے تھے۔ میری شکل ان داڑھی والے ملاؤں سے ملنے لگی تھی جن سے میں بہت ڈرتا تھا۔ ہر صبح میں میرل کو فون کرتا۔ باتوں باتوں میں وہ کوئی چبھتا ہوا سوال کرتی اور پھر میں سارا دن اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں لگا دیتا۔

''اس بارے میں کیا خیال ہے کہ Satanic Verses فکشن کی کتاب ہے۔ دل سے بنائی ہوئی کہانی ہے۔'' ایک دن میرل نے سوال کیا۔

''یہ بات نہایت اہم ہے۔'' میں نے جواب دیا ''تمام قوموں میں مسلمان ہی ایسے ہیں جو تخیل کی طاقت سے بخوبی واقف ہیں۔ عقیدہ چاہے پہاڑ نہ ہلاسکے مگر خیال ضرور پہاڑ ہلاسکتا ہے۔ خاص طور سے اس وقت جب اسے ادب یا ٹیکنالوجی کی شکل دے دی جائے۔ اس کے بعد وہ خیالات نظریات میں بدل جائیں گے۔ وہ بل ڈوزر بن جائیں گے، جبر وتشدد اور جسمانی اور نفسیاتی اذیت کے آلات بن جائیں گے اور ان خیالات کے ذریعہ ہی پوری تاریخ اور پورے پورے کلچر نیست و نابود کرنے کا جواز تلاش کیا جائے گا۔ انسانوں کی ثقافتی اور مذہبی شناخت پر حملہ کرنے کے لیے فکشن سے زیادہ طاقت ور ہتھیار اور کوئی نہیں ہے۔ لیکن ہم تو یہ بھی بتانا چاہتے تھے کہ رشدی کی اس خیالی کہانی کی بنیاد ان باتوں پر بھی ہے جنہیں مسلمان مسلّمہ حقیقت قرار دیتے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ اس ناول میں خواب کے جو مناظر ہیں وہ رسول اللہ کی سیرت پر لکھی جانے والی مشہور کتاب کے انداز پر لکھے گئے ہیں۔ یہ کتاب ہے مارٹن لنگز کی Muhammad: His Life Based on the Earliest Sources۔ رشدی نے مارٹن لنگز کے الفاظ مسخ کرکے اپنی کہانی بنائی ہے۔ واقعہ وہی ہے۔ لیکن اس واقعہ کو اس نے غلط انداز میں پیش کیا ہے۔

''اور اس بارے میں کیا خیال ہے کہ رشدی پوسٹ موڈرن ناول نگار ہے۔'' ایک دن

میرل نے یہ سوال کر ڈالا۔

''بالکل متعلقہ سوال ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ پوسٹ موڈرزم موڈرزم کے خلاف ردِ عمل ہے۔ لیکن اس کی اساس بھی سیکولرازم پر ہی ہے۔ پوسٹ موڈرزم کا دعویٰ ہے کہ وہ اضافیت کا قائل ہے لیکن اس وقت اضافیت کہاں رہ جاتی ہے جب آپ سیکولرازم کی اس قطعیت کی حمایت کرتے ہیں کہ اظہار خیال کی مادر پدر آزادی ہونا چاہیے۔ فن کی پاکیزگی اور کلچر کی مکمل آزادی پر اصرار کر کے پوسٹ موڈرزم نے سیکولر انسان دوستی کو ایک قسم کی الٰہیات بنا دیا ہے۔ یہاں روایتی مذہب کے خدا کی جگہ ادب کو خدا کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ تمام مذاہب ادب کی قدر و قیمت تسلیم کرتے ہیں اور قرآن اور بائبل کے ماننے والے ان دونوں کتابوں کو بڑا ادب مانتے ہیں، مگر پوسٹ موڈرن لکھنے والوں میں اتنا اخلاق نہیں ہے کہ یہ حقیقت تسلیم کرلیں کہ فکشن کی طرح مذہب بھی انسانی صورت حال کا اہم، بامعنی اور ضروری حصہ ہوسکتا ہے۔ ان کی ساری جستجو مسلسل، مستقل اور لایعنی (کیونکہ ان کے نزدیک کوئی ایسا سچ نہیں ہے جس کی تلاش کی جائے) شک کے لیے ہے اور پوسٹ موڈرن عقیدے کی بنیاد ہی شک پر ہے۔ اس جستجو کا نتیجہ ذاتی عدم تحفظ اور پریشان خیالی ہی ہوسکتا ہے۔

''اس اعتبار سے رشدی اور آیت اللہ ایک ہی جگہ کھڑے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''جب ایک نظریہ ایسا پیمانہ بن جائے جس سے حقیقت ناپی جائے تو وہ ایسی مہر بند چیز بن جائے گی جس میں معروضی طو پر کسی دوسری حقیقت کو سمجھنے اور اپنے بچکانہ جذبات کا جائزہ لینے کی گنجائش ہی نہیں رہے گی۔ ہر چیز سفید یا سیاہ بن جائے گی۔ کسی اور دلیل کو سمجھنا تو دور کی بات ہے دوسرے کا موقف جاننے کا امکان بھی ختم ہوجائے گا۔''

''تو کیا ہمیں رشدی کو معاف کر دینا چاہیے؟'' میرل نے اس وقت پوچھا جب ہم اپنی کتاب Distorted Imagination کے اختتام پر پہنچ گئے تھے۔

''ہمیں یہ ضرور کہنا چاہیے کہ رشدی کو جسمانی نقصان نہ پہنچایا جائے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن ہم اسے معاف کرنے کو بھی تیار نہیں ہیں۔ اگر ہم اپنی ثقافتی اور تاریخی حقیقت کا دفاع نہیں کریں گے تو ہماری مذہبی شناخت ہی ختم ہوجائے گی اور ہمارا کوئی مستقبل نہیں ہوگا۔ یہ کہنے سے کہ رشدی کا ناول فکشن ہے یہ حقیقت معدوم نہیں ہوجائے گی کہ وہ ایک اصل چیز ہے اور ہمیں اس کی مذمت کرنا چاہیے۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو حقیقی نہیں ہیں اس کے باوجود

انہوں نے انسانوں کو بہت تکلیفیں پہنچائی ہیں ۔ ہٹلر کی کتاب Mein Kampf ایسی ہی ایک فکشن کی کتاب ہے جو تخیل کی بنیاد پر لکھی گئی ہے۔ کتنے پڑھے لکھے یورپی ہیں جو کہتے ہیں کہ وہ اتنی احمقانہ کتاب ہے جس پر توجہ ہی نہیں دینا چاہیے۔ جارحانہ خیالات پہلے الفاظ کا جامہ ہی پہنتے ہیں اور فکشن کی شکل میں ہی سامنے آتے ہیں۔ اسی لیے ہمیں رشدی کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اور پھر رشدی نے خود ہی اس ناول میں کہا ہے ''معافی سب سے زیادہ گہری اور سب سے شیریں بدعنوانی کو ممکن بناتی ہے۔ یعنی یہ خیال کہ اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔''

''واہ واہ، کیا بات کہی ہے چپو۔'' میرل نے میرا وہ نام لیا جو اس نے حال ہی میں رکھا تھا'' رشدی کی بات رشدی کے مُنھ پر ہی ماردی۔''

''شناخت اور کرپشن کے بارے میں وہی زیادہ جانتا ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

کتاب لکھنا تو آسان ہے مگر اسے چھپوانا آسان نہیں۔ اظہار خیال کی آزادی جسے کہتے ہیں اس کا حکم بھی مقتدر حلقوں کی طرف سے ہی آتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ میرے اپنے پبلشر کیسل یہ کتاب چھاپ دیں گے۔ مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ پیپر بیک چھاپنے والے ادارے ہیڈ لائن نے مسودہ لے لیا۔ مگر پھر اسے واپس کر دیا۔ ہم ایک کے بعد دوسرے پبلشر کے پاس گئے۔ کتاب سب کو پسند آئی مگر چھاپنے کو کوئی تیار نہیں ہوا۔ پھر ایک غیر معمولی بات ہوگئی۔

کیسل میں جو میرا پبلشر تھا اس نے میری کتاب نہ چھاپنے پر ادارہ سے استعفیٰ دے دیا۔ جان ڈنکن جو اصلی امریکی ہے اور اپنے ریڈ انڈین ہونے پر فخر کرتا ہے، برطانیہ میں آباد ہوگیا ہے۔ میں اس سے ۱۹۸۰ء کے ابتدائی دنوں میں ملا تھا جب میں رسالہ انکوائری نکال رہا تھا۔ اس وقت وہ ایک پبلشر مینسل میں کام کر رہا تھا۔ اس ادارے نے مشرق وسطیٰ اور اسلام پر کئی کتابیں شائع کی تھیں۔ منسل نے ایک درجن سے زیادہ کتابیں چھاپی تھیں اس کے بعد اسے کیسل نے خرید لیا تھا۔ جان بہت ہی شریف اور سیکولر انسان تھا۔ میری اس کے ساتھ دوستی ہوگئی تھی۔ اب وہ ملا تو کہنے لگا'' میری سمجھ میں یہ تو نہیں آتا کہ رشدی کے ناول پر یہ ہنگامہ کیا ہے مگر میں نے تمہاری چیخیں ضرور سنی ہیں۔ اس زمانے میں مسلمان ہونا ایسا ہی ہے جیسے امریکہ میں ریڈ انڈین ہونا۔ ہمیشہ کنارے سے لگے ہوئے۔'' اس نے کیسل چھوڑ کر اپنی پنشن سے ایک آزاد پبلشنگ ہاؤس بنا لیا تھا جس کا نام تھا'' Grey Seal'' یہ ایک ریڈ انڈین نام تھا جو اس کی بڑی بیٹی کا لقب بھی تھا۔ میری کتاب Distorted Imagination اس کے ادارے

کی پہلی کتاب بن گئی۔ کچھ لوگوں نے اس کی خوب تعریف کی مگر لبرل طبقے نے اسے نظر انداز کر دیا۔ بعد میں وہ مسلمانوں میں خاص طور سے مسلم طلبہ میں بہت ہی مقبول ہوئی۔

ہمارے لیے اظہار خیال کی آزادی یک طرفہ راستہ ثابت ہو رہی تھی۔ ہم نے کتاب کا مقابلہ کتاب سے کیا مگر ہماری کتاب کنارے لگا دی گئی تھی۔ مغرب کی سیکولر دنیا میں اظہار خیال کی آزادی پر سیکولر مقتدرہ کا اختیار ہے۔ اختیار کے اس ڈھانچے میں رسائی بھی انہی لوگوں کی ہے۔ چونکہ وہ مغرب کے لیے سب سے بڑی سچائی ہے اس لیے اس سے باہر کی کوئی بھی چیز خود بخود اپنی اہمیت کھو دیتی ہے۔ تمام مطلق العنان نظریوں کی طرح یہ بھی طاقت کا ایک وسیلہ ہے اور انہی کی طرح اس میں بھی قتل عام کا رجحان موجود ہے۔

کتاب چھپنے کے بعد مجھے برطانیہ میں ٹھہرنا اچھا نہیں لگا۔ وہاں کی فضا بہت ہی زہریلی ہو رہی تھی۔ میں وہاں سے کہیں دور جانا چاہتا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ ترکی میں ابھی میرا کام باقی ہے۔ حسب معمول اکمل الدین احسان اوغلو نے مجھے ایک کانفرنس کا دعوت نامہ بھیج دیا۔ وہاں کانفرنس کا کام ختم ہوتے ہیں فرخ نے استنبول گھمانا شروع کیا۔ میں نے اس سے کہا، ''اس بار مذاق نہیں چلے گا۔ میں سچ مچ ٹرکش باتھ میں جانا چاہتا ہوں۔''

''کوئی بات نہیں باس'' اس نے جواب دیا۔'' میں ایک جگہ جانتا ہوں جہاں میں تمہیں لے جاؤں گا۔''

وہ مجھے جمبر لیتاس حمامی لے گیا جسے روز باتھ یا '' گلابی حمام'' بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اصل غسل خانے کے بیچ میں جو پتھر کی سل تھی اس پر گلاب کے پھول بنے ہوئے تھے۔ اس پتھر پر لکھا تھا'' اس حمام کی خوبصورتی کا ساری دنیا میں کوئی جواب نہیں ہے۔'' حمام میں بہت ہجوم تھا لیکن میں اس کے منتظمین کے ساتھ شامل ہو گیا۔ حمام کا ایک ملازم سارے عمل میں میرے ساتھ رہا۔ اس غسل میں دو گھنٹے سے زیادہ لگے۔ ملازم نے بتایا کہ حمام میں کسی کو ایک لمحے کے لیے بھی ننگا ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ راولپنڈی کی ویگن کے تجربہ کی بنا پر یہاں میں مسلسل یہ کوشش کرتا رہا کہ میرا کپڑا کہیں سے سرک نہ جائے۔ ایک آدمی نے بکری کی کھال کے دستانے سے میری مالش شروع کی۔ یہاں تک کہ میری جلد چھلنے لگی اور مجھے تکلیف ہونے لگی۔ مجھے راولپنڈی میں شیو بنانے والا حجام یاد آ گیا۔ اس کے بعد میرے بدن پر خوب صابن لگایا گیا، پھر کھولتے پانی سے نہایا گیا۔ اس کے بعد پھر رگڑ رگڑ کے مالش کی گئی۔ پھر میں نے نہایت

ٹھنڈے پانی میں غوطہ لگایا۔ اس سارے عمل سے گزرنے کے بعد میں بالکل ابلا ہوا لابسٹر بن گیا تھا۔مگر میں بالکل تروتازہ ہوگیا تھا۔میرا دوست سچ کہتا تھا۔ اس سے جسم کا ایک ایک خلیہ صاف ہوجاتا ہے۔میں نے تازہ ہوانا سگار سلگایا اور چند کش لینے کے بعد تاریخ کے تمام مظالم کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوگیا۔

باب۔ ۱۴

رنگا رنگ ثقافتیں۔ پہلے اور اب

آپ اپنے آپ کو ان ہونی کے لیے کتنا ہی تیار رکھیں مگر آپ بے خبر پکڑے جاتے ہیں۔ وہ فروری کی سرد صبح تھی اور میں حسب عادت اتوار کے اخبار پڑھ رہا تھا۔ فتوے کی سالگرہ آرہی تھی اور اخباروں میں اس کا ذکر ہو رہا تھا۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ مغربی میڈیا میں کہیں بھی اس حقیقت کا ادراک نظر نہیں آتا تھا کہ رشدی کے واقعہ نے مسلمانوں پر کتنا بھرپور اثر ڈالا ہے۔ جلد بازی میں سب نے سیکولر راستہ اختیار کرلیا تھا اور اسلام کی اصلاح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ادھر نفرت، ناروا داری اور جہالت کے حملے جاری تھے۔ ہیرلڈ پنٹر، فریڈی فورسائتھ، انٹونیبر جس اور رابرٹ کلرائے سلک جیسے لبرل ادیبوں کی طرف سے مضامین کا طومار باندھا جا رہا تھا۔ فتوے والی ذہنیت کو ہی عام مسلمانوں کی ذہنیت سمجھ لیا گیا تھا اور دوسرے مسلمانوں کی بات نہیں سنی جا رہی تھی۔ اسلام کو اتنا بدنام کر دیا گیا تھا کہ مسلمانوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ ہر ایک کے دل ودماغ میں غصے کا لاوا ابل رہا تھا۔ وہ مغرب کے کثیر ثقافتی کلچر کی خوبیوں کو نہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ نہیں سوچ رہے تھے یہ رنگا رنگ کلچر انہیں کیا دیتا ہے۔ وہ شدید صدمے کی کیفیت میں الٹے مذہب میں پناہ ڈھونڈ رہے تھے۔ میں ایک ایسے بنگلہ دیشی ماؤنواز کمیونسٹ کو جانتا ہوں جو اچانک اسلام پر کتابیں پڑھنے لگا تھا۔ اس کا مطلب ایک ہی تھا کہ ہمیں بہت کام کرنا ہے۔ ان نظریاتی مہاجروں کے لیے کشتی تیار کرنا ضروری تھی۔ ممکن تھا کہ اسی طرح امہ کی اصلاح کا عمل شروع ہوجائے۔

دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں ڈر گیا کہ کہیں جیہواز وٹنس (عیسائی مبلغ) پھر نہ آگئے ہوں۔ میں نے بیزاری کے ساتھ دروازہ کھولا۔ وہاں بہت ہی چھوٹے قد کے دو آدمی کھڑے تھے۔ گورا رنگ تھا مگر داڑھی دونوں کے نہیں تھی۔ ابھی میں ''جی'' بھی نہیں کہنے پایا تھا کہ چھپکلی کی تیزی سے ایک صاحب آگے بڑھے اور مجھے لپٹ گئے۔ وہ میرے ملائشیا کے پرانے دوست ناصرالدین تھے۔ وہ میری نئی مہم جوئی کا نمائندہ بن کر آئے تھے۔ ان کے ساتھ ملائیشیا کے سفارت خانے کے کوئی صاحب تھے۔ ان کے لباس اور انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ زیادہ نہیں بولیں گے۔

''کتنا عرصہ ہوگیا ہمیں ملے ہوئے۔'' ناصرالدین نے اندر آتے ہوئے کہا۔

''ہوں، واقعی بہت زمانہ ہوگیا۔'' میں طالب علمی کے زمانے میں ان سے ملا تھا جب ہم ایف او ایس آئی ایس کے لیے کام کرتے تھے۔ ناصر ان دنوں ملائیشیائی مسلم اسٹڈی گروپ میں بہت سرگرم تھا۔ وہ بہت تیز بولتا تھا اور اس کی شہرت یہ تھی کہ وہ جو کام بھی شروع کرتا ہے اسے پورا ضرور کرتا ہے۔ کتنا ہی ناممکن کام ہو ناصر اسے کرلے گا اور بجلی کی تیزی سے کرے گا۔ وہ کبھی نچلا نہیں بیٹھتا تھا۔ اس دن میں چھٹی کے موڈ میں تھا۔ اس لیے میں نے جھک کر اس کی ٹھوڑی میں ہاتھ ڈالا اور اس کا منھ اوپر کرکے پوچھا، ''ناصر، کیا بات ہے؟ میں اب کچھ کرنے کو تیار نہیں ہوں۔''

''صبر کرو ضیا بھائی'' وہ بولا ''میں تو صرف پیغامبر ہوں۔'' یہ کہتے کہتے اس نے کمرے کے کئی چکر لگا لیے۔ پھر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔

میں نے دیکھا باہر مرسیڈیز کھڑی تھی۔ ''تمہارے گھر والے بھی آئے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں۔''

''انہیں اندر بلاؤ۔''

اب بوٹا سے قد کی اس کی پیاری سی بیوی بھی اندر آگئی۔ اس کا قد ناصر سے بھی چھوٹا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے چھ چھوٹے چھوٹے بچے بھی آگئے۔ ان سب کے قد ترتیب وار چھوٹے ہوتے چلے گئے تھے۔ سب سے بڑا لڑکا جس کی عمر بارہ سال تھی دو فٹ سے بھی کم لمبا تھا وہ بالکل اپنے باپ کی طرح چلتا تھا اور اسی کی طرح باتیں کرتا تھا۔ [illegible] معلوم ہوتا تھا کہ تمام بچے

باپ کے سانچے میں ڈھالے گئے ہیں۔

''معلوم ہوتا ہے تم بہت ہی مصروف رہتے ہو۔'' میں نے ناصر کی پیٹھ تھپکتے ہوئے مذاق کیا۔

''میں برادر انور کا پرائیویٹ سیکریٹری ہوں۔'' اس نے کمرے کے چکر لگاتے ہوئے کہا۔

''ہاں، میں نے افواہ سنی تھی۔''

''میں یہ کہنے آیا ہوں کہ وہ آپ اور باقی اجمالی دوستوں سے ملنا چاہتے ہیں۔''

برادر انور سے مراد انور ابراہیم تھے جو ملائیشیا کے وزیر تعلیم تھے۔ جن دنوں میں ایف او ایس آئی ایس کا سیکریٹری جنرل تھا وہ ملائیشیا میں مسلم یوتھ موومنٹ کے عہدیدار تھے۔ ۱۹۷۴ء میں جب انہوں نے کسانوں کی غربت اور بھوک کے خلاف عوامی تحریک چلائی تھی تو ہم نے اس کی حمایت میں لندن میں بھی مظاہرہ کیا تھا۔ اس تحریک کی وجہ سے جب انہیں گرفتار کرلیا گیا تھا اور انہوں نے بائیس مہینے کی قید کاٹی تھی تو ہم نے ان کی رہائی کے لیے مہم چلائی تھی۔ میں ملائیشیا گیا تو انہوں نے مجھے کوالالمپور کی سیر کرائی تھی اور اپنی طلبہ تنظیم کے اجلاس میں مجھ سے تقریر بھی کروائی تھی۔ ۱۹۸۲ء میں انور ابراہیم کو اس وقت کے نائب وزیر اعظم مہاتیر محمد قومی سیاست میں لائے تھے۔ پھر جب مہاتیر محمد وزیر اعظم بنے تو انور ابراہیم نے بہت تیزی سے ترقی کی۔ پہلے وہ نوجوانوں اور کھیلوں کے امور کے وزیر بنے، پھر وزیر زراعت اور اس کے بعد وزیر تعلیم بنادئے گئے جو بہت بااثر وزارت تھی۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ انور کی ترقی میں مہاتیر محمد کا بہت ہاتھ تھا لیکن انور خود بھی نہایت ذہین اور بہت ہی فعال سیاسی لیڈر تھے۔ ان کے اندر تنظیمی صلاحیتیں بہت زیادہ تھیں۔ وہ بہت ہی اچھے مقرر تھے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں انہوں نے اپنے زور خطابت سے عوام کی اکثریت کو اپنے لیڈر کا حامی بنالیا تھا اور مہاتیر محمد کی حکومت کو ۱۹۸۳ء کے آئینی بحران، ۷-۱۹۸۰ء میں حکمراں جماعت کے اندرونی اختلافات اور عدلیہ کے ساتھ تنازع میں بھی انہوں نے ہی بچایا تھا۔ ملائیشیا کے لوگ سمجھتے تھے کہ مہاتیر کے جانشیں انور ابراہیم ہی ہوں گے۔ مہاتیر محمد بھی اس خیال کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

انور ابرہیم ایک ماہر سیاست دان کے ساتھ دانشور بھی تھے۔ غربت، جہالت، ماحولیات، سائنس اور معاشی ترقی، ہر مسئلے پر ان کی نظر تھی اور ہر موضوع پر وہ عالمانہ گفتگو کرتے تھے اور ہر مسئلے کے حل کے لیے کوششیں کرتے تھے۔ ان کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ان مسائل کا

حل اسلامی نقطۂ نظر سے تلاش کرتے تھے۔ لیکن وہ کثیر جہتی معاشرہ کے قیام کے حامی تھے۔ اسلام کے ساتھ وہ مہاتما بدھ، کنفیوشس اور ہندوستان کے قدیم مفکرین کے فلسفے سے بھی خوب واقف تھے۔ دوسرے مسلمانوں کے برعکس وہ دوسرے عقائد، دوسرے کلچر اور دوسری تہذیبوں کی سچائی اور ان کی اقدار کے بھی قائل تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اس سے ان کی اپنی شناخت یا ان کے عقیدے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ ان کے لیے رواداری ایک عملی اچھائی ہے اور یہ انہوں نے مختلف مذاہب کے درمیان زندگی گزار کر اپنے تجربے سے سیکھا تھا۔

''ہم میں مفکروں اور دانشوروں کی کمی ہے۔'' یہ تھے وہ الفاظ جو انور نے مجھ سے اس وقت کہے تھے جب ہم کوالالمپور کے نواح میں واقع اوانا کلب میں ملے تھے۔ ہمارا سارا اجمالی قبیلہ وہاں گیا ہوا تھا۔ دراصل ہم کانفرنس میں شرکت کرنے گئے تھے۔ ہم ایک بہت ہی کشادہ لونگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کا دروازہ کھلا تھا جس میں سے عالی شان گالف کورس نظر آ رہا تھا۔ وہاں سے جنگل میں ڈھکی پہاڑیاں تو نظر آ رہی تھیں مگر خوش قسمتی سے وہ سب سے اونچی پہاڑی دکھائی نہیں دے رہی تھی جہاں لاس ویگاس کی طرح بڑے بڑے جوئے خانے بنے ہوئے ہیں۔ انور نے حسب معمول نہایت نفیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ انہیں سب کی توجہ کا مرکز بنا رہنا بہت پسند تھا۔ وہ اپنی تیز حس مزاح کی وجہ سے ادھر ادھر چوٹیں بھی کرتے رہتے تھے۔ ''اتنی مشہور و معروف شخصیتوں کے درمیان بیٹھ کر مجھے بے پناہ مسرت محسوس ہو رہی ہے۔'' انہوں نے کہا اور میں نے محسوس کیا کہ اس وقت ان کی آنکھیں کچھ اور کہہ رہی تھیں۔ ''مگر ہمارے پاس دکھانے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں صحیح دانشوروں کی کمی ہے۔ ہم سنجیدہ مفکر وں اور دانشوروں کا ایک گروہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے زمانے میں اندلس کا ماحول تخلیق کریں۔''

ایک ویٹر کافی لے آیا اور گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ انور نیس کیفے پسند کرتے ہیں جو پلاسٹک کے ساشے میں آئے تھے اور ساشے میں ہی خشک دودھ بھی آیا تھا۔ ہم سب نے ملائیشیا کی کافی پی۔ یہ بہت کالی تھی جس میں خوب شکر ڈالی گئی تھی اور اوپر سے بہت سا کنڈنسڈ دودھ پڑا ہوا تھا۔

''اسپین کے مورخ زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کے تجربے کا ذکر کرتے ہیں جو مل جل کر رہنے کا بہترین طریقہ ہے۔ یہ ماحول قریب آٹھ سو سال تک جاری رہا۔ یہ مسلم اسپین کی

خصوصیت تھی۔'' انور نے کہا۔

اس خیال سے کہ کہیں ہم یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ ماحول ہر طرح سے بھائی چارے والا تھا انہوں نے فوراً ہی کہا کہ وہاں جھگڑے اور اختلافات بھی تھے۔ لیکن اگر یہ دور اتنے عرصے برقرار رہا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے وہاں ایک فکری اور علمی فضا پیدا کر دی تھی۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ فضا ہم ملائیشیا میں بھی پیدا کر سکتے ہیں؟''

ہم سب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہمیں احساس تھا کہ انہوں نے ہمیں للکارا ہے۔

انہوں نے اپنے خیال کی وضاحت کی۔'' ملائیشیا کے اسلامی معاشرے میں تمام طبقوں اور مذاہب کو شامل ہونا چاہیے۔ زبردستی اور نعرے بازی سے کام نہیں چلے گا۔ خالص اسلام کے نام پر ثقافتی نعرے بازی مغرب کے تسلط کے ردعمل کے طور پر تو سمجھ میں آتی ہے لیکن اس سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اس سے صرف چہرہ بدل جائے گا اور جبر و استبداد اور ناانصافی کی تاریخ پھر دہرائی جانے لگے گی۔ ملائیشیا کی روح مختلف ثقافتوں کا اجتماع ہے۔ ایک کثیر ثقافتی معاشرہ پیدا کرنے کے لیے اس میں اسلام، کنفیوشس، ہندومت اور مغربی فکر کا امتزاج ہونا چاہیے تاکہ ایک نامیاتی اخلاقی اور معاشی نظام قائم کیا جا سکے۔ اس کے نتائج صرف ملائیشیا تک ہی محدود نہیں رہیں گے بلکہ مغرب بھی اسلام، کنفیوشس اور ہندومت کو اپنی سابقہ کالونیوں کے اندر ایک نئے تناظر میں دیکھے گا اور ایشیا کے کثیر ثقافتی اور انسان دوست کلچر کا صحیح ادراک کر سکے گا۔ یہ دیکھے گا کہ اپنی روحانی اقدار چھوڑے بغیر بھی جمہوریت اختیار کی جا سکتی ہے اور یہ کہ ارتقا کے لیے سیکولرازم ہی لازمی نہیں ہے۔'' انور نے اپنی تقریر میں اسلامی، چینی اور مغربی مفکروں کے افکار کے تفصیلی حوالے دئے۔ ہماری دلچسپی کے لیے انہوں نے اقبال، ٹیگور اور فلپائن کے ادیب ہوزے رزال کے حوالے بھی دیے۔''

''اس وقت ایشیا میں ترقی پسندانہ اور رجعت پسندانہ دونوں خیالات پائے جاتے ہیں۔ رجعت پسندوں نے جمہوریت اور سول سوسائٹی کے حامیوں کے ساتھ ٹکر لے رکھی ہے۔ ہمیں ایسے مفکروں کی ضرورت ہے جو عقیدے کی پختگی کے ساتھ دلائل سے کثیر ثقافتی اور کھلے معاشرہ کی وکالت کر سکیں۔ ہمیں ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کے اصول پر معاشرے کی بنیاد رکھیں۔''

ملائیشیا میں چونکہ بادشاہت ہے اس لیے تمام معزز لوگوں کو خطاب دیے جاتے ہیں۔

انور کو بھی خطاب ملا ہوا ہے مگر وہ صرف انور کہلانا پسند کرتے تھے۔ لیکن ہم انہیں ان کے خطاب ''یانگ باحرمت'' سے پکارتے تھے۔

انور ابراہیم کے جانے کے بعد سورج ڈوب گیا اور جلدی اندھیرا چھا گیا۔ ہم سب بددل سے بیٹھے تھے کہ انور نسیم نے نعرہ لگایا ''یوریکا۔'' دبلے پتلے لمبے انور نسیم پاکستان واپس جانے سے پہلے کینیڈا میں جینیٹکس میں بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ انہیں ڈرامائی انداز میں باتیں کرنے کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے بالکل تھیٹر کے اداکار کی طرح کہا ''مجھے اصل حل مل گیا۔ بس ہمیں یہ کرنا ہے کہ انور ابراہیم کو کلون کر کے بہت سے انور ابراہیم بنالیں اور ہر ملک کو ایک انور ابراہیم دے دیں۔ تمام مسلم ملکوں میں انور ابراہیموں کی بہتات ہوجائے گی تو ہم آرام سے گہری نیند سو جائیں گے۔'' ہم نے تالیاں بجائیں۔ اگر یہ کام اتنا ہی آسان ہوتا تو ہم کب کے اپنی یہ بہشت حاصل کر چکے ہوتے۔

اب چونکہ انور نسیم نے کلوننگ کی تیکنک پر کام شروع نہیں کیا اس لیے ہم اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ میرل اور منور انیس نے کوالالمپور میں ہی کام کرنا پسند کیا۔ لیکن انور ابرہیم کے اصرار کے باوجود میں نے اپنا صدر مقام لندن کو ہی بنایا۔ میں سال میں چار یا پانچ بار کوالالمپور کے چکر لگاتا۔ اسکول کی چھٹیوں میں میرا سارا خاندان میرے ساتھ ہوتا۔ ہم نے پیشہ ور لوگوں، سرکاری افسروں اور اساتذہ کے چھوٹے چھوٹے گروپوں میں علمی مذاکروں اور مباحث سے کام شروع کیا۔ ہم اسلام اور جدید دور کے مسائل پر گفتگو شروع کرتے۔ جیسے انور نے کہا تھا ہمارا مقصد یہ تھا کہ وہ لوگ خود ہی تخلیقی انداز میں سوچیں۔ بنے بنائے شرعی اصولوں کے بجائے وہ اصول اخلاق پر غور کریں۔ وہ ماضی کے بجائے مستقبل کے بارے میں سوچیں اور مسلمہ افکار کا تنقیدی جائزہ لیں۔ ہم سال میں کئی درجن مذاکرے اور سیمی نار کرتے اور ہر طبقے اور ہر ادارے کو اس میں شامل کرتے۔ آخر یہ بند سیمی نار کھلے اور بڑے ہوتے چلے گئے اور کانفرنسیں شروع ہوگئیں۔ ایک موقع پر تو میرل نے بہت ہی کٹر اور دقیانوسی مولویوں سے خطاب کیا۔ یہ سب جامعہ ازہر کے پڑھے ہوئے تھے۔

ہم وہاں صرف پڑھانے ہی نہیں گئے تھے بلکہ خود پڑھنا بھی چاہتے تھے اور یہ مقصد ہمیں معروف اسکالر سید محمد نجیب العطاس سے حاصل ہوا۔ وہ صحیح معنی میں مفکر اور دانشور تھے۔ اور پورے ملائیشیا میں ان کی بہت عزت کی جاتی تھی۔ ان کو یہ مقام اس وقت حاصل ہوا تھا

جب ۱۹۷۳ء میں انہوں نے ایک پتھر پر کندہ تحریر پڑھی تھی جس سے یہ معلوم ہوا کہ اس علا قے میں مسلمان کب آئے تھے۔ یہ پتھر جسے ''ترنگانو پتھر'' کہا جاتا ہے ایک قبر پر لگا ہوا تھا۔ سید محمد نجیب مالے لینگویج اینڈ لٹریچر انسٹی ٹیوٹ کے پہلے سربراہ تھے۔ انہوں نے اس سے پہلے کی تمام قیاس آرائیوں کو غلط ثابت کر کے بتایا کہ اس پتھر پر ''جمعہ ۴ رجب ۷۰۲ ہجری لکھا ہے جو ۲۲ فروری ۱۳۰۳ عیسوی بنتا ہے۔ انہوں نے مالے زبان کی سب سے قدیم تحریر بھی دریافت کی جو عقائد النسفی کا مالے زبان میں قدیم ترین ترجمہ ہے۔ انہوں نے سب سے اہم کام یہ کیا ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا کے بزرگ صوفی حمزہ فنصوری اور نورالدین رنیری کے ملفوظات کی کئی جلدوں میں تشریح لکھی ہے۔ انہوں نے ملائیشیا کے تقریبا ہر ممتاز شخص کو پڑھایا ہے۔ ان میں انور ابراہیم بھی شامل ہیں۔ سارے ملک میں انہیں صرف پروفیسر کے نام سے ہی جانا جاتا تھا۔ وہ واقعی بہت ہی پڑھے لکھے انسان تھے۔ ایک بار انہوں نے کہا ''میں احمقوں اور کند ذہن لوگوں میں گھرا ہوا ہوں۔ وہ مجھ سے سوال پوچھنے آتے ہیں۔ لیکن احمقانہ سوال کا جواب دینے والا بھی احمق بن جاتا ہے۔ اس لیے میں انہیں بھگا دیتا ہوں۔''

میرا ان سے تعارف تو ایف او ایس آئی ایس کے دنوں میں ہو گیا تھا۔ لیکن اصل میں انہیں میں نے اس وقت جانا جب میں بی بی سی ٹیلی وژن کے پروگرام Encounters with Islam کے لیے انٹرویو کر رہا تھا۔ ہم دونوں کو ہی ہوانا سگار پینے کا بہت شوق تھا اور نئی نئی چیزیں دریافت کرنا بھی ہم دونوں کا مشغلہ تھا۔ ان کی شخصیت بھی ان کی شہرت کی طرح بہت بھاری بھرکم تھی۔ ان کی صاف ستھری سفید داڑھی اور گھنگھریالے بال تھے جس سے ان کی یمنی وراثت کا پتہ چلتا تھا۔ ان کا خاندان حضر موت سے تعلق رکھتا تھا جو صوفیا کا خاندان ہے۔ وہ استاد بننے سے پہلے فوج میں بڑے افسر تھے۔ انہوں نے سینڈھرسٹ سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی لیے ان کے ہاں ادب آداب کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ اسے وہ اسلامی آداب کا حصہ کہا کرتے تھے۔

ہم ملائیشیا جاتے تو جب تک وہاں رہتے تو دو دو کی تعداد میں ہر مہینے ان سے ملنے جاتے۔ اگر پروفیسر اجازت دیتے تو ہم زیادہ تعداد میں بھی چلے جاتے۔ ہمارا طریقہ یہ تھا کہ ہم پیتالنگ جایا میں ان کے گھر رات گیارہ بجے کے قریب پہنچتے۔ ان کا گھر بہت ہی خوبصورت تھا جسے خود پروفیسر نے ڈیزائن کیا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی ایسا لگتا تھا جیسے ہم بارھویں صدی کے اندلس

میں آ گئے ہیں۔ بیچ میں صحن تھا اور اس کے گرد برآمدہ جس میں ساتھ ساتھ کمرے تھے ایک زینہ اوپر کمروں کی طرف جاتا تھا۔ پورا نقشہ اسپین کا تھا۔ حتیٰ کے پروفیسر نے ٹائل، دروازے کھڑکیاں اور باقی آرائش کا سامان بھی اسپین سے منگایا تھا۔ ہم ان کے پھولوں سے بھرے صحن میں بیٹھ جاتے۔ ترکش کافی اور ملائیشیا کی مٹھائی آ جاتی اور پھر پروفیسر ہوانا سگار نکالتے، اسے کاٹتے اور ہم دونوں تازہ تازہ خوشبودار سگار سلگاتے اور باتیں شروع ہو جاتیں۔ ''انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم پورے ادب آداب کے ساتھ گفتگو کریں۔ آج کا سوال کیا ہے؟''

سوال ایک ہی تھا اور اس سوال پر غور کرنے میں پروفیسر نے اپنی ساری زندگی بتا دی تھی۔ ''علم کیا ہے؟'' ہم جب بھی ملتے مختلف انداز میں یہی سوال کرتے۔ علم کی مشکلات کیا ہیں؟ ہم علم کی کیا تعریف کریں؟ اور صحیح علم کیا ہے؟ پروفیسر تھوڑا سا اونچا سنتے تھے اس لیے کان پر آلہ لگاتے تھے۔ جیسے ہی سوال ختم ہوتا وہ آلہ اتار دیتے تاکہ ضمنی سوال نہ کیے جائیں اور وہ اس سوال پر غور کر سکیں۔ ثقل سماعت سے ان کے دماغ کی تیزی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اگر وہ یہ محسوس کرتے کہ ان کی بات غور سے نہیں سنی جا رہی ہے تو فوراً موضوع بدل دیتے اور اس طرح کی باتیں کرنے لگتے کہ سور موتی کی قدر نہیں جانتے یا گدھے اچھے کھانوں کا مزہ نہیں لے سکتے۔ لیکن چونکہ ہم ان کے ایک قسم کے شاگرد ہی بن چکے تھے اس لیے ہمیں ضمنی سوال کرنے کی اجازت تھی لیکن شرط یہ تھی کہ سوال میں ادب اور احترام کا خیال رکھا جائے۔ پروفیسر جب مناسب نتیجہ پر پہنچ جاتے تو گفتگو ختم ہو جاتی۔ اس وقت تک صبح کی اذانیں ہونے والی ہوتیں۔

ہم اس خوبصورت سرزمین کے ماحول میں بہت خوش ہوتے اور بڑے جوش و خروش کے ساتھ ان امکانات کا جائزہ لیتے کہ مسلم اسپین کا ماحول دوبارہ کیسے پیدا کیا جائے۔ ہم دل ہی دل میں یہ سمجھتے تھے کہ ملائیشیا میں یہ ماحول پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ایک اور غرناطہ اور ایک اور مسلم بہشت یہاں کے کھلے اور آزاد معاشرے میں تخلیق کی جا سکتی ہے۔

مسلمان ۷۱۱ء میں اسپین کے ایک چھوٹے سے جزیرہ پر اترے تھے۔ اس جزیرہ کی پہاڑی کا نام طارق بن زیاد کے نام پر جبل الطارق پڑ گیا تھا جسے اب جبرالٹر کہا جاتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آئبیریا کا پورا خطہ مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا تھا۔ وہاں حکومت سنبھالنے کے بعد مسلمانوں نے عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ جس رواداری کا ثبوت دیا اس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ قرآن نے عیسائیوں اور یہودیوں کو اہل کتاب قرار دیا ہے۔ وہ ملت

ابراہیمی کا حصہ ہیں ۔اسلام انہیں مسلمانوں کا بھائی ہی سمجھتا ہے سوائے اس کے کہ وہ گمراہ ہوگئے ہیں ۔اس خیال کی عملی شکل ہمیں مسلم اسپین میں ہی نظر آتی ہے ۔عرب کمانڈر عبدالعزیز اور مرسیا کے وسی گوتھ شہزادہ تھیڈور کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اس کا متن اب تک موجود ہے۔ اس میں عیسائیوں کو اپنے کلیسا اور خانقاہیں اور یہودیوں کو اپنے سنا گاگ برقرار رکھنے کی اجازت تھی ۔یہودی اور عیسائی اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزارتے تھے ۔وسی گاتھ کے ٹیکسوں کا پیچیدہ نظام بدل دیا گیا تھا اور فوجی خدمات انجام نہ دینے پر ایک ہی سادہ سا ٹیکس لگا دیا گیا تھا۔ یہ ٹیکس بھی استطاعت کے مطابق وصول کیا جاتا تھا۔ عورتیں ، بچے ، معذور لوگ ، بیمار ، غلام اور پادری اس ٹیکس سے مستثنٰی تھے ۔اکثر غلام آزاد کردیئے گئے تھے ۔مختلف ذرائع شاہد ہیں کہ اسپین کی مالی حالت بہت اچھی ہوگئی تھی ۔اکثر لوگوں کے حالات زندگی بہت اچھے تھے۔ اسپین پر مسلمانوں نے آٹھ سو سال حکومت کی۔ ۱۴۹۲ء میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ ختم ہوئی۔ عیسائیوں نے وہاں حکومت سنبھالتے ہی تمام یہودیوں کو وہاں سے نکال دیا ۔ بارہ تیرہ سال کے اندر تمام مسلمان جلا وطن کردیئے گئے ۔ مسلمانوں نے جو کثیر نسلی ،کثیر مذہبی اور کثیر ثقافتی معاشرہ قائم کیا تھا اس کی جگہ نسلی اور مذہبی تعصب پر مبنی سماج قائم کر دیا گیا اور مذہب کے نام پر قتل عام شروع ہوگیا۔

اسپین کی طرح ملائیشیا نے بھی اسلامی اثرات کے تحت مختلف نسلوں، مختلف زبانوں اور مذہبوں کی ایک گل کاری پیدا کی ہے ۔قدیم زمانے سے یہ علاقہ تجارت کا مرکز تھا۔ مالے لوگوں نے جہاز سازی میں مہارت حاصل کرلی تھی اور پہلی صدی عیسوی میں ہی وہ مدغاسکر تک کے علاقوں میں جاکر آباد ہوگئے تھے۔ اسی زمانے میں اس علاقے کا تعلق جنوبی ایشیا کی تہذیب سے ہوا اور عرب اور چین تک اس کی تجارت ہونے لگی۔ پندرھویں صدی کے اوائل تک ملائیشیا کا ساحلی شہر ملاکا اس پورے علاقہ کا تجارتی مرکز بن گیا۔ بابا نونیا چینی نسل کے لوگ ابھی تک وہاں جو آباد ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں کثیر نسلی نظام کیسے چلتا تھا۔ بابا کا مطلب ہے بزرگ مرد اور نونیا عورت۔ ملاکا کے ایک علاقہ میں یہی لوگ آباد ہیں ۔ان کے گھر بالکل ملائیشیائی طرز کے ہیں مگر وہ مالے زبان بولتے ہیں ۔ان کا مذہب اور کلچرل چینی ہی ہے لیکن انہوں نے ایک ملی جلی ثقافت اختیار کرلی ہے۔

ہندوستانی تاجر جو وہاں چٹیار کہلاتے ہیں اور مالی لین دین کا کاروبار کرتے ہیں ، انہوں

نے بھی اپنی الگ ایک کمیونٹی بنا رکھی ہے۔ ملاکا کے چائنا ٹاؤن میں ایک بہت ہی قدیم مندر ہے جو مسلمانوں کی مسجد اور ہندوؤں کے مندر کی ملی جلی شکل کا ہے۔ ۱۴۹۲ء میں جو سمندری طوفان آیا تھا اس نے پورے ملائیشیا کو نقصان پہنچایا تھا اس کا اثر اس پر بھی پڑا۔ کولمبس کا ارادہ گرم مسالوں کے جزیروں تک پہنچنے کا تھا تاکہ مسلمانوں نے یورپ کے جو بحری راستے بند کر رکھے ہیں ان کا ازالہ کیا جائے۔ اس کو سب سے بڑا انعام ملاکا کی شکل میں ہی ملا تھا۔ سب سے پہلے ۱۵۱۱ء میں پرتگالیوں نے اس پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد یہاں ولندیزی آگئے پھر انیسویں صدی میں اس پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ اب وہاں جو کلچر ہے اس پر انگریز نوآبادی کا زیادہ اثر ہے۔ انگریزوں نے ٹن کی کانوں میں کام کرنے کے لیے چینی باشندوں کو بلایا جو بعد میں بڑا تاجر طبقہ بن گیا۔ یہ انگریزوں کا ساتھ دیتا تھا۔ ربر کے جنگلوں میں کام کرنے کے لیے جنوبی ہندستان سے تامل بلائے گئے اور پولیس اور فوج میں شمالی ہندوستان سے سکھ بھرتی کیے گئے۔ اس طرح مقامی مالے باشندے زراعت تک ہی محدود ہوگئے۔ انہیں ربر کے چھوٹے کاروبار کی اجازت بھی نہیں تھی۔

انگریزوں کی اس پالیسی نے جو باہمی منافرت پیدا کردی تھی آزادی کے بعد اس نے اپنا رنگ دکھایا اور نسلی ہنگامے شروع ہوگئے۔ لیکن مسلمانوں کی رواداری یہاں بھی کام آئی۔ چینی اور ہندوستانی باشندوں کو مکمل شہری حقوق دے دیے گئے جو انگریزوں نے کبھی نہیں دئے تھے۔ ۱۹۶۹ء کے نسلی فساد کے بعد ایک نیا آئین بنایا گیا۔ ملائیشیا اور مسلم اسپین کو جس بات نے کثیر ثقافتی معاشرہ بنایا وہ یہ ہے کہ تمام نسلوں اور فرقوں کو سیاسی اقتدار میں، عملی طور پر نہیں تو فکری طور پر ضرور برابر کا حصہ ملا اور معاشی ترقی سے بھی سب نے برابر کا فائدہ اٹھایا۔ مسلم اسپین میں کسی شخص کی ترقی کا دارومدار اس کی علمی قابلیت اور ہنرمندی پر ہوتا تھا۔ ملائیشیا میں سیاسی اقتدار میں حصہ اختیارات کی آئینی تقسیم اور مختلف نسلوں کے لیے مخصوص کوٹے کی بنیاد پر ملتا ہے۔ اسلام ریاست کا سرکاری مذہب ہے لیکن باقی تمام مذاہب کو مکمل آزادی کی ضمانت دی گئی ہے۔ آئین میں اس بات کا اہتمام کیا گیا ہے کہ کم ترقی یافتہ طبقوں کو تعلیمی اور معاشی سہولتیں زیادہ فراہم کی جائیں۔

ملائیشیا کے اسلام کو مالے باشندوں کی طرح نرم خو معتدل اور متوازن کہا جاتا ہے اور یہ توازن اور نرمی تصوّف کی وجہ سے آئی ہے۔ ملائیشیا میں اسلام تیرھویں صدی میں آیا جب مشرق

وسطی میں تصوف کا چرچا بہت ہو رہا تھا۔ صوفیاء نے شریعت کے لیے کٹر ملاؤں کی سختی کے خلاف بغاوت کی تھی اور اسلام، یونانی باطنیت اور اجتماعی روحانیات کا امتزاج کیا تھا جو اسلام سے قبل کے مذاہب کی جانب زیادہ رواداری کا رویہ رکھتا تھا۔ انہوں نے قدیم روایات کو برقرار رکھ کر اس علاقے میں اسلام کو فروغ دیا اور یہاں کے باشندوں پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے۔ ماضی کی روایات برقرار رکھنے کا اثر یہاں کی زبان پر بھی نظر آتا ہے۔ اسلام کی مذہبی اصطلاحات کے لیے یہاں مالے اور سنسکرت کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ یہاں مذہب کو اگاما روزہ کو پوسا، جہنم کو نرک اور جنت کو سیورگ (سورگ) کہا جاتا ہے۔ قدیم مالے، ہندو اور اسلامی اثرات کے میل جول کی وجہ سے مالے اسلام ساری مسلم دنیا میں اپنے قسم کا واحد کلچر بن گیا ہے۔ یہاں کے لوگ اپنے ایمان اور عبادات میں کسی سے کم مسلمان نہیں ہیں۔

اسپین کے اسلام پر بھی تصوف کے بہت اثرات تھے۔ اسلام کے سب سے بڑے صوفی ابن عربی ۱۱۶۵ء میں مرسیا میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے بیس سال کی عمر میں یہ مسلک اختیار کیا اور تیس سال کی عمر میں جہاں گردی شروع کردی۔ وہ کھلم کھلا مذہبی علما کو جاہل اور احمق کہتے تھے جس سے ان کے درمیان چپقلش پیدا ہوگئی۔ اس بنا پر ابن عربی کو قید میں جانا پڑا اور ان کے خلاف فتوے بازی کی گئی۔ ان تمام تکالیف کے باوجود ابن عربی نے ۳۵۰ کے قریب کتابیں لکھیں۔ اسلام کے پیغمبروں اور یہودی اور عیسائی مذہب کی تعلیمات کے علاوہ انہوں نے روایات، استدلال اور تصوف کا جو امتزاج پیش کیا ہے وہ ان کا عظیم کارنامہ مانا جاتا ہے۔ ان کے اکثر افکار بہت پیچیدہ ہیں لیکن ان کی کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلم اسپین میں تصوف کا کتنا گہرا اثر تھا۔ ان کتابوں میں اندلس کے ستر کے قریب ممتاز صوفی بزرگوں کے حالات زندگی اور ان کے کاموں کی مثالیں دی گئی ہیں۔

ملائیشیا کا کثیر ثقافتی ماحول مسلم اندلس سے بہت ملتا ہے لیکن اس کا علمی اور فکری کلچر ابھی اندلس سے بہت پیچھے ہے۔ مسلم تاریخ کی چند عظیم شخصیات کا تعلق مسلم اسپین سے ہی تھا۔ لیکن ان کے حالات زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں کتنی اذیتیں اٹھانا پڑیں۔ بارھویں صدی کے طبیب، فلسفی اور ارسطو اور افلاطون کے مفسر اور معقولات کے عظیم مفکر ابن رشد کی زندگی بھی مشکلات میں ہی گزری۔ وہ قرطبہ کے قدیم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ قاضی بھی رہے۔ بعد میں انہوں نے اعلان کیا کہ جو بھی انسانی اعضا کے بارے میں علم حاصل کرلے گا اللہ پر

اس کا ایمان اور راسخ ہو جائے گا۔ وہ الموحد حکمراں یوسف اور یعقوب کے مشیر خاص بھی رہے۔ وہ اپنے زمانے کے بہت بڑے خطیب اور یونانی فلسفے کے شارح مانے جاتے تھے۔ میرے دوست اکمل الدین احسان اوغلو نے ان پر جو تھیس لکھا ہے اس کا عنوان ہے ''مسلم تہذیب کو یورپ کی دین۔'' ٹامس اکیویناس اور دانتے نے یونانی فلسفہ یونانی زبان سے نہیں سیکھا بلکہ ابن رشد کی شرح اور ان کے اضافے سے سیکھا۔ چونکہ وہ معقولات کے فلسفی مانے جاتے ہیں اس لیے کہا جاتا ہے کہ انہیں تصوّف سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ حالانکہ وہ تصوّف سے بہت متاثر تھے۔

ابن رشد کو فقہا سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ ان کا مقصد وحی اور عقل، فلسفہ اور ایمان اور تحقیق اور اقدار کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ فقہاء کے مقابلے میں فلسفیوں کے لیے اس بات کی زیادہ گنجائش ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر کریں کیونکہ وہ سائنس اور فلسفے کی سچائیوں کو زیادہ جانتے ہیں۔ چونکہ حق ایک ہے اس لیے وحی اور سائنس میں اختلاف نہیں ہوسکتا۔ لیکن سائنس اور فلسفہ الٰہیات کی ضد ہوسکتے ہیں کیونکہ وہ کمتر مفکروں کی تشریح اور تفسیر کے سوا اور ہے ہی کیا۔ ابن عربی کی طرح ان پر بھی کفر کا فتوی لگایا گیا اور جلا وطن کر دیا گیا۔ مسلم اسپین کوئی خواب نہیں تھا بلکہ وہ ایک زندہ حقیقت تھا۔ وہ ایک تہذیب تھی جو اردگرد کے خطرات کے درمیان صدیوں قائم رہی یہاں تک کہ اس پر نسلی اور مذہبی امتیاز اور منافرت نے قبضہ کرلیا اور کیتھولک اسپین کی نو آبادیاتی حکومت قائم ہوگئی۔ لیکن پورے عالم اسلام کے سنہری دور کی طرح مسلم اسپین کی بھی اپنی الجھنیں تھیں۔ وہاں بھی حکومت کی طرف سے علماء اور فضلاء کی سرپرستی کی جاتی تھی مگر حکومت اور ان کے درمیان تعلقات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے تھے۔ سلطنتیں اور شاہی خاندان اقتدار کا مرکز ہوتے تھے لیکن وہ اسلامی حوالے سے کی جانے والی تنقید سے مبرا نہیں تھے۔ علما اور فضلا سول سوسائٹی کا حصہ ہی ہوتے تھے لیکن وہ اپنے آپ کو ایک حد تک اس سے الگ بھی رکھتے تھے اور اپنی دانست کے مطابق وہ حکومت کی حمایت بھی کرتے تھے اور جب سمجھتے تھے تو اس کی مخالفت بھی کرتے تھے۔

ابن رشد کے سب سے قریبی دوست بلکہ مربی فلسفی ابن طفیل تھے۔ انھوں نے ایک فلسفیانہ ناول لکھا ہے جس کا انگریزی میں ترجمہ The Living Son of the Awake نام سے کیا گیا ہے۔ یہ ناول میں نے اپنی نوجوانی کے زمانے میں کئی مرتبہ پڑھا ہے۔ اس میں اس امکان پر غور کیا گیا ہے کہ کسی استاد کے بغیر خود ہی نیچرل سائنس، فلسفہ اور مذہب کی تعلیم کیسے

حاصل کی جاسکتی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار حیٔ ایک دور افتادہ جزیرہ میں رہتا ہے اور قدرتی مناظر اور عناصر قدرت کا بغور جائزہ لیتا رہتا ہے۔ وہ سادہ ورق ہے جس پر ابھی کچھ بھی نہیں لکھا گیا ہے۔ وہ اپنے مشاہدے اور فلسفیانہ تفکر کی بنا پر سچائی تک پہنچ جاتا ہے۔ عین اس وقت جب حیٔ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ وہ اس دنیا میں بالکل تنہا ہے تو ایک اور شخص اصل وہاں آتا ہے۔ وہ شخص جو خالص مذہبی ماحول میں پلا بڑھا ہے دنیا سے کنارہ کش ہو کر وہاں آیا ہے۔ حیٔ اور اصل دیکھتے ہیں کہ وہ دونوں فلسفیانہ طور پر ایک ہی نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ اب وہ دونوں دنیا کو اپنا ہم خیال بنانے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن دنیا انہیں قبول نہیں کرتی۔ آخر میں وہ مایوس اور بددل ہو جاتے ہیں۔ انگریز مستشرق ایڈورڈ پولوک نے اس کتاب کا انگریزیمیں ترجمہ کیا تو سترھویں صدی کے یورپ میں حیٔ کا کردار خوب مشہور ہوا۔ عیسائیوں کا کویکر فرقہ اس سے متاثر ہوا اور ڈینیل ڈیفو کے ناول Robinson Crusoe کا ماڈل بھی یہی کہانی بنی۔

اندلس کا گیارھویں صدی کا مفکر ابن حزم میرا پسندیدہ مفکر ہے۔ پرویز منظور کے بقول ابن حزم جیسا انسان دوست مفکر اور کوئی نہیں ہے۔ وہ مصلح تھا اور دینی اور دنیوی حلقوں پر بڑے زور شور سے تنقید کرتا تھا۔ وہ ایسا بے باک لکھنے والا تھا جس سے سب پریشان رہتے تھے۔ اسی لیے اس پر کفر کے فتوے لگائے گئے، اذیتیں دی گئیں، قید میں ڈالا گیا اور بالآخر جلا وطن کر دیا گیا۔ اس کی کتابوں پر پابندی لگائی گئی اور انہیں نذر آتش کیا گیا۔ وہ جس عورت سے محبت کرتا تھا وہ نوجوانی میں ہی مر گئی۔ اس نے انتہائی تکلیف میں زندگی گزاری۔ لیکن اس کے افکار لافانی ہیں۔ اس کے خیال میں شرعی فیصلوں کے لیے جو روایتی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اور جن سے شریعت کی بنیاد بنتی ہے وہ غلط ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تمام فیصلے قرآن کی اساس پر ہونا چاہئیں۔ اس کی نظر میں قرآن رسول اللہؐ کی زندگی کی شرح ہے۔ تمام فانی انسان جن میں صحابہؓ اور خلفا بھی شامل ہیں غلطی کر سکتے ہیں۔ انہوں نے جو کہا یا جو کیا اسے خدائی احکام کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ اس کا بیان ہے کہ علم کا تعلق چار اصولوں عدل، فہم، نجدہ (جرأت) اور جد (سخاوت) سے ہے۔ جو چیز بھی عدم مساوات، بزدلی اور لالچ کی طرف لے جائے وہ جہالت ہے۔ اس کا علم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

لیکن مسلم اسپین کے تمام مفکر مسلمان نہیں تھے۔ مسلم سلطنت سے سب سے زیادہ فائدہ یہودیوں نے اٹھایا۔ فلسطین سے نکالے جانے کے بعد پہلی مرتبہ انہیں اس علاقے میں اپنے علم

وفضل کو جلا دینے کا موقع ملا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور موشے بن میمون تھا۔ وہ ۱۱۳۵ء میں قرطبہ میں پیدا ہوا۔ الموحد سلطنت کی پالیسی کی بنا پر پہلے وہ اپنے خاندان کے ساتھ مراکش گیا پھر قاہرہ چلا گیا۔ وہاں وہ صلاح الدین ایوبی کا ذاتی معالج بنا اور جامعہ قاہرہ میں طب کی تعلیم دیتا رہا۔ اس نے مشنہ تورات اور دوسری کتاب میں یہودی عقائد کے قواعد مرتب کیے۔ یہ کتابیں عربی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ یہودی مذہب میں اس کا درجہ وہی ہے جو ٹامس اکوئناس کا کیتھولک فرقے میں ہے۔ مسلمان میمون کو یہودی عالم نہیں کہتے بلکہ اسے مسلم تہذیب کی وسیع علمی فضا کا ہی حصہ مانتے ہیں۔

اسپین کے مسلمانوں کے تصوّف نے سیفارڈک (عبرانی میں اسپین کو سیفرد کہا جاتا تھا) یہودی علما پر بہت اثر ڈالا۔ ان میں سے ایک گیارھویں صدی کا باہیا ابن پکودا تھا۔ اس کی کتاب فرائض قلب کی کلید کی بھی یہودیمذ ہب میں بہت اہمیت ہے۔ یہ کتاب بھی عربی میں لکھی گئی تھی اور اس پر مسلمانوں کے تصوف کا اثر بہت ہی نمایاں ہے۔ یہ کتاب یہودیوں میں بہت مقبول ہوئی۔ اس کا ہمعصر سالومن بنجوا ابن جیبر ول تھا جو شاعر اور نو فلاطونی فلسفی تھا۔ اس نے تصوّف کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس کی مشہور دعا ''کیتر ملخوت'' (شاہی تاج) یوم کپر کی عبادت میں پڑھی جاتی ہے۔ اس میں گناہوں کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ اس پر ابن عربی کا اثر صاف نظر آتا ہے۔

۱۹۹۱ء کے عالمی حالات نے ہمارے اور پروفیسر کے بحث مباحثے کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ عراق نے کویت پر حملہ کر دیا تھا اور گلف کی جنگ شروع ہوگئی تھی۔ مجھے وہ دن یاد آئے جب ہم پہلے ہی اس وقت کی پیش بینی کرنے لگے تھے۔ یہ ۹ نومبر ۱۹۸۹ء تھا اور رشدی والے تنازع کے بعد ہم اجمالی پہلی بار اکٹھے ہو رہے تھے۔ ہم میرل کے فلیٹ میں جمع ہوئے تھے۔ ہماری روایت کے مطابق اجلاس سے پہلے کھانا ہوتا تھا۔ میرل نے مزیدار کھانا پکایا تھا۔ نوڈل کھاتے ہوئے خبریں سننے کے لیے ہم نے ٹیلی وژن لگایا اور اس کے ساتھ ہی اس دن اور اس رات کا ہمارا ایجنڈا ختم ہوگیا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ہزاروں آدمی برلن کی دیوار کی طرف مارچ کر رہے تھے اور پھر وہ دیوار گرنا شروع ہوگئی۔ مشرقی جرمنی کے گارڈ خود لوگوں کو مغرب کی طرف جانے میں مدد دے رہے تھے۔ وہ دیوار جتنی ٹوٹتی اتنا ہی ہجوم کا جوش اور بھی بڑھتا۔ لوگ ایک دوسرے

کو گلے لگا رہے تھے۔خوب نعرے لگائے جا رہے تھے۔یہی خوشی ہمارے کمرے میں بھی منائی جا رہی تھی۔

پرویز نے نعرہ لگایا" چلو، سرد جنگ کی لعنت تو ختم ہوئی۔"لیکن رات صبح میں بدلی اور صبح نے سورج کو جگہ دی تو ہمارے موڈ نے اور ہی رخ اختیار کرلیا۔ یہ میرل تھی جس نے سب سے پہلے سوال کیا۔" شیطانی سلطنت تو بکھر گئی۔اب کیا یا کون اس کی جگہ لے گا؟" کسی نے اس کا جواب نہیں دیا۔ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا۔پیش گوئی کون کرتا۔آخر میرل نے خود ہی اس کا جواب دیا۔" اب ہماری باری ہے۔اب اسلام کو ہوا بنایا جائے گا۔وہ نئی شیطانی سلطنت بنے گا۔مغرب خاص طور سے اسلحہ سازی کی صنعت اپنی پیداوار برقرار رکھنے کے لیے کوئی دشمن چاہے گی تاکہ وہ اپنا سیاسی اور معاشی تسلط قائم رکھ سکے۔رشدی کا واقعہ تمام پرانے خیالات، تعصبات اور گندی زبان پھیلانے کے سلسلے کا آغاز تھا۔" ہم سب نے تائید میں سر ہلایا۔" ہمارا مظلومیت کا احساس اور بڑھ جائے گا اور مسلمان قرونِ وسطیٰ کی ذہنیت میں پھر پھنس جائیں گے اور ہم سال خوردہ شریعت کو اور زیادہ گلے لگالیں گے۔لوگ اپنے بچاؤ کے لیے مطالبہ کریں گے کہ ہمیں آنحضرتؐ کے خیالی زمانے کی طرف لوٹ جانا چاہیے۔"

ہم خاموش تھے۔ہم مردہ امیدوں پر فاتحہ پڑھ رہے تھے۔

گلف کی جنگ کے زمانے میں میرل اور میں نے لندن اور ملائیشیا کے کئی چکر لگائے۔ ہم جہاں بھی جاتے لوگ یہی سوال کرتے کہ یہ پاگل بے دین صدام حسین مسلمانوں کا ہیرو کیسے بن گیا ہے کہ وہ بیوقوف ملاؤں اور مغرب کے مخالف سیاست دانوں کو اپنی انگلیوں پر نچا رہا ہے اور بغداد میں کانفرنسیں کر رہا ہے۔کوئی اس سوال پر غور نہیں کر رہا تھا کہ مسلمانوں کے عام حالات پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟اس زمانے میں مسلمانوں کو جو عام مرض لاحق ہے اس کا اظہار ہو رہا تھا۔ بزدلی اور بے عملی، جس سے مظلومیت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ادھر ریڈیو اور ٹی وی پر مسلمانوں کے خلاف جذبات بھڑکائے جا رہے تھے اور ان کے مذہبی عقائد کو نشانہ بنایا جا رہا تھا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی اکثریت خاموش ہوگئی تھی۔یا پھر وہ جو کچھ کہہ رہے تھے مغربی میڈیا پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔صدام کی حمایت کون کرے گا؟ کیا وہ وہی جابر اور ظالم آمر مطلق نہیں ہے جسے مغرب پیش کر رہا ہے؟ مسلمانوں کی اکثریت جانتی تھی کہ صدام حسین جدید زمانے میں ایک ایسا مطلق العنان آمر ہے جس کے ساتھ زندہ رہنا ناممکن ہے۔

پھر اس اصول پر بھی عمل کرنا مشکل تھا کہ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔ دنیا کے کسی بھی خطے کے مسلمانوں کے دلوں میں تیل کی دولت سے مالا مال مشرق وسطیٰ کے ملکوں کے لیے سچی محبت کہیں بھی نہیں تھی۔ ان ملکوں کے حکمراں غیر روادار، غیر جمہوری، مغرور اور خود غرض ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک ہی مقصد ہے کہ ہر طرح اپنے اقتدار کو برقرار رکھا جائے۔ کوئی ایسا عالمی فورم بھی نہیں تھا جہاں مل جل کر امہ کے مسائل پر غور کیا جا سکے اور یہ احساس بھی شدید ہوتا جا رہا تھا کہ ہماری بزدلی اور نامردی واقعی ہمیں نفسیاتی طور پر مظلوم بنا دے گی۔ جس رات امریکہ اور مغربی ملکوں کی فوجوں نے عراق پر بمباری کی اس رات ہم نے بہت دیر تک کام کیا۔ خبریں سننے کے لیے بھی ہم نے وقفہ نہیں کیا۔ میرل گھر جانے کے لیے ٹیکسی میں بیٹھی تو اس نے ریڈیو پر بمباری کی خبر سنی۔ گھر پہنچتے ہی اس نے مجھے فون کیا کہ ٹیلی وژن کھولو اور خبریں دیکھو۔ سی این این پر بغداد پر برستے بم دکھائے جا رہے تھے۔

لندن میں تو ہم ایک طرح کی مایوسی کا شکار تھے لیکن ملائیشیا میں مغرب اور سعودی حکومت کے خلاف جذبات بھڑک رہے تھے۔ سرکاری پالیسی تو سعودی حکومت کے حق میں تھی لیکن پابندیوں کا شکار پریس اس کے باوجود سعودی حکومت کے خلاف جذبات کی ترجمانی کر رہا تھا۔ سعودی حکومت کے وفد بار بار کوالالمپور آ رہے تھے اور لوگوں کی رائے تبدیل کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ عبداللہ نصیف بھی ایک وفد لے کر آئے۔ میں ان سے ملنے پین پیسفک ہوٹل پہنچا۔ مجھے یاد ہے ہم نے مسلمانوں کی اس ذہنی کیفیت پر غور کیا جس نے انہیں اس مقام تک پہنچا دیا ہے۔ سعودی سفیر کسی اطلاع کے بغیر ہی وہاں پہنچ گئے۔ ''ہمارے موقف کی حمایت میں ایک بھی مضمون نہیں چھپا۔'' انہوں نے کہا۔ اور پھر میری طرف مڑے۔ ''ہمارے موقف کی وضاحت کے لیے آپ کیوں نہیں لکھتے۔''

میں نے ملائیشیا کے مشہور اخبار New Straits Times میں مضمون لکھا۔ میں نے لکھا کہ مسلمان دو برائیوں کے درمیان گھر گئے ہیں۔ ایک طرف صدام حسین ہے جس کے ظلم اور جبر کی داستانیں سب جانتے ہیں۔ اس نے اپنے پاگل پن میں کویت پر چڑھائی کر کے اس پر قبضہ کر لیا ہے۔ دوسری طرف قرون وسطیٰ کی سعودی سلطنت ہے جہاں غیر ملکی مزدور غلام بنا کر رکھے جاتے ہیں اور جہاں اختلاف رائے پر خوفناک سزائیں دی جاتی ہیں۔ پھر میں نے لکھا کہ درمیان کا راستہ یہ ہے کہ سعودی عرب کی کم برائی کا ساتھ دیا جائے۔ اس کے علاوہ ایک

بات یہ بھی ہے کہ سعودی عرب کی ان علاقوں پر قبضہ کرنے کی نیت بھی نہیں ہے۔ سعودی حکومت تو آگ بگولا ہوگئی۔ سعودی سفیر نے سرکاری طور پر انور ابراہیم سے شکایت کی۔

چند ہفتے بعد نصیف کا فون آیا ''وہ تم سے اور ہمدردی نہیں مانگتے'' انھوں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''مگر وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''آخر کیوں؟'' میں حیران تھا۔

''وہ تمھیں پچاس لاکھ ڈالر دینا چاہتے ہیں۔'' نصیف نے یونہی رواروی میں کہا۔

میں ہکا بکا رہ گیا تھا۔'' آخر معلوم تو ہو کس وجہ سے وہ دے رہے ہیں؟''

''تمہارے علمی کاموں میں مدد دینے کے لیے۔'' جواب ملا۔

''ڈاکٹر صاحب'' میں نے ایک لمبے وقفے کے بعد کہا'' مجھے سوچنے کا موقع دیجے۔''

میں نے خوب سوچا۔ میرل اور دوسرے دوستوں سے بھی مشورہ کیا۔ طے ہوا کہ یہ پیش کش قبول نہ کی جائے۔ میں اس بل سے پہلے بھی ڈسا جا چکا تھا۔ کچھ دن بعد انور ابراہیم نے مجھے بلایا۔ وہ کوالالمپور کے ایک ایسے علاقے میں چلے گئے تھے جہاں وزیر اور بڑے بڑے افسر رہتے تھے۔ ایک رات میں اور میرل ان سے ملے۔

''سعودی بہت اصرار کر رہے ہیں۔'' انور نے کہا۔'' ان کے کئی فون آچکے ہیں۔''

میں نے اور میرل نے ایک دوسرے کو دیکھا'' آپ کا کیا مشورہ ہے؟'' میرل نے ان سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے ان کی نیت صاف ہے اور پھر اس کے ساتھ کوئی شرط بھی نہیں ہے۔'' انور نے جواب دیا۔'' ان کی مدد سے ہمیں علمی اور تحقیقی کاموں کو فروغ دینے کا موقع ملے گا۔

''تو پھر طے ہوگیا۔'' میں بولا'' میں لے لوں گا۔''

ایک ہفتے بعد میں جدہ میں تھا۔ ہم شیخ صلاح کامل کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ انور بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ شیخ کامل کے گھر جاتے ہوئے راستے میں نصیف نے بتایا کہ یہ پیش کش بہت ہی اوپر سے آئی ہے اور شیخ کامل چونکہ ہمارے سب کے دوست ہیں اس لیے یہ رقم وہی ہمیں دیں گے۔ اور بلاشبہ انہیں بھی اس کا اجر ملے گا'' نصیف نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ لمبے چوڑے صوفے پر میں نصیف اور شیخ کے بیچ میں بیٹھا تھا۔ انور ہمارے سامنے اتنے ہی بڑے صوفے پر بیٹھے تھے۔ کافی دیر تو کیا حال ہے، کیا حال ہے اور الحمد للہ الحمد للہ کی گردان ہوتی رہی

پھر شیخ بولے'' مجھے حکم ہوا ہے کہ میں آپ کو پچاس لاکھ ڈالر دے دوں۔''

'' ڈالر؟'' میں نے کہا'' ہم لندن میں رہتے ہیں اور وہاں پاؤنڈ چلتا ہے۔ وہاں کی کرنسی ڈالر نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

شیخ نے پہلے نصیف کو اور پھر انور کو دیکھا۔ تینوں مسکرائے۔

'' مجھے حکم ہوا ہے کہ میں آپ کو پچاس لاکھ پاؤنڈ دے دوں۔'' یہ کہ کر انہوں نے ہمارا ردعمل جاننے کے لیے توقف کیا۔ پھر بولے،'' یہ رقم آپ کے علمی کاموں کے لیے ہے۔ برادر انور کی طرح ہم بھی مسلم دنیا کی نشاۃ ثانیہ چاہتے ہیں۔'' اس کے بعد انہوں نے اشارہ کیا۔ ایک موٹا تازہ مصری باشندہ بھاگا بھاگا آیا اور ان کے ساتھ تپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کے پاس اتنی بڑی چیک بک تھی جو آج تک میں نے نہیں دیکھی۔'' پچاس لاکھ پاؤنڈ کا چیک لکھو۔'' شیخ نے اس شخص سے کہا۔ اس نے سونے کی نب والا فاؤنٹن پن نکالا اور بڑی احتیاط کے ساتھ چیک پر ہندسوں اور الفاظ میں رقم لکھنے لگا۔ جس محنت کے ساتھ وہ لکھ رہا تھا اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ خطاطی کر رہا ہے۔

'' چیک کس کے نام ہوگا؟'' شیخ نے سوال کیا۔

'' ڈاکٹر ضیا کے نام۔'' انور نے جواب دیا۔

'' نہیں'' نصیف نے دخل دیا'' یہ ادارے کے نام پر ہونا چاہیے۔''

اب عبدہ یمانی بھی آ گئے تھے۔ انہوں نے دیر سے آنے پر معذرت کی اور انور کے ساتھ بیٹھ گئے۔

'' یہ چیک برادر ضیا کے نام ہی ہونا چاہیے۔'' یمانی نے کہا'' وہ جو چاہیں ادارہ بنا سکتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ یہ رقم اپنے اوپر خرچ نہیں کریں گے۔'' سب نے قہقہہ لگایا۔ اس کے بعد مصری نے چیک بک دستخط کے لیے شیخ کے سامنے پیش کر دی۔

'' دستخط سے پہلے ڈاکٹر یمانی کچھ کہنا چاہیں گے۔'' شیخ نے کہا۔

'' برادر ضیا۔ ایک شریف دانشور کی حیثیت سے ہم سب آپ کی عزت کرتے ہیں۔ آپ کی اپنی رائے ہے جس کا اظہار کرنے سے آپ کبھی نہیں ڈرتے۔ ہمیں یہ بہت پسند ہے۔'' ابھی میں جی جی کرتے ہوئے سر ہلا ہی رہا تھا کہ ان کی ایک بات پر میرا سر سیدھا ہو گیا'' لیکن قبل اس کے کہ یہ چیک دیا جائے میں ایک چھوٹی سی بات کہنا چاہتا ہوں۔''

میں نے پریشان ہو کر نصیف اور انور کو دیکھا۔ وہ بھی پریشان تھے۔

''دانشوروں کو آزادی کے ساتھ بات کرنا چاہیے۔'' یمانی بول رہے تھے۔ ''لیکن کبھی کبھی، جی ہاں، کبھی کبھی جو وہ سوچتے ہیں اسے زبان پر نہیں بھی لانا چاہیے۔'' وہ ہمارے چہروں کے تاثرات جاننے کے لیے ٹھہرے۔ پھر بولے ''صرف مسلم امہ کی بھلائی کے لیے انہیں کبھی کبھی سننا بھی چاہیے اور حکام جو کہہ رہے ہیں اس پر بھی توجہ دینا چاہیے۔''

میرا چہرہ سرخ ہوگیا۔ انور پریشان نظر آرہے تھے۔ میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ شیخ کے ہاتھ سے چیک چھین لوں اور اس کے پرزے پرزے کر کے ان کے سر پر اچھال دوں۔ مگر میں اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا تھا۔ نصیف نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔

''برادر انور،'' انہوں نے اچانک انور ابراہیم کی طرف مُنھ کیا اور کہا ''میرا خیال ہے آپ نے شیخ کامل کا باغ نہیں دیکھا؟ آیئے میں آپ کو دکھاتا ہوں۔'' وہ کھڑے ہوگئے اور مجھے کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔ انور ہمارے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ میں نے چلتے چلتے دیکھا کہ شیخ کامل اور عبدہ بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ شیخ کامل کے باغ میں فٹ بال کے کئی گراؤنڈ سما سکتے تھے۔ باغ نہایت خوبصورتی کے ساتھ ڈیزائن کیا گیا تھا، لیکن سب سے پہلے جو چیز ہماری توجہ اپنی طرف کھینچتی تھی وہ تین مسجدیں تھیں جو نہایت متوازن طریقے سے باغ میں تعمیر کی گئی تھیں۔ اس سے خوش گوار تاثر پیدا ہوتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جس ماہر تعمیر اور لینڈ اسکیپ آرٹسٹ نے انہیں ڈیزائن کیا ہے ان کے ذہن میں یقیناً غرناط کے باغ ہوں گے۔ نصیف بہت ہی بااخلاق اور ماہر مدبر تھے۔ وہ ہمارا گرم مزاج ٹھنڈا کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے پہلی مسجد کی طرف اشارہ کیا ''یہ مسجد شیخ کامل نے اپنے لیے بنائی ہے۔'' انور نے دور ہٹ کر اس کی خوبصورتی کا نظارہ کرنا شروع کیا۔ ''اور وہ'' اب انہوں نے دوسری مسجد کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ اپنی ماں کے لیے بنائی ہے۔'' انور نے فرماں برداری کے ساتھ اس مسجد کو دیکھا۔ ''اور وہ۔۔۔؟

''۔۔۔وہ اس وقت کے لیے ہے جب وہ نماز نہیں پڑھنا چاہتے۔'' میں نے مذاق کیا۔ ہمارے قہقہے سے پورا باغ گونج اٹھا۔ میں بہت کچھ سیکھ کر اور خالی جیب لے کر جدہ سے روانہ ہوا۔

گلف کی جنگ، جس کی حقیقت ٹی وی اسکرین پر نظر آتی تھی، ختم ہوگئی۔ یہ جنگ بھی

دوسری جنگوں کی طرح ہی ختم ہوئی کہ اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ بلکہ اس نے اور بہت سے سوالوں کو جنم دے دیا۔ عراقی باشندوں کے سوا سب کو علم ہوگیا تھا کہ نارمل زندگی دوبارہ شروع کی جاسکتی ہے۔ لیکن سب سے اہم بات جو معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ اس جنگ نے دنیا کو بدل دیا ہے اور دنیا کا محور تبدیل ہوگیا ہے اور مستقبل کی تاریخ بھی بدل گئی ہے۔ اب ہم ایک اور طوفان کی طرف بڑھ رہے تھے۔

میں اپنا کام جاری رکھنے کے لیے ملائیشیا واپس آگیا۔ میرے لیے ابھی تک وہ بغیر داڑھی والوں کا ملک تھا۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس ملک میں اسلام کے اندر رہتے ہوئے اور بھی تبدیلیوں کی گنجائش ہے۔ میں اپنے اس خیال پر قائم تھا کہ اسی ملک میں مسلم اسپین والا کھلا اور روشن خیال معاشرہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ ایسا معاشرہ جس کی تقلید دوسرے مسلم ملک بھی کریں اور گزشتہ پانچ عشروں کی ترقی سے اندازہ ہوگیا تھا کہ مسلم ملکوں کا ماڈل بننے کے لیے معاشی ترقی نہایت ضروری ہے۔ ہم غریبوں میں کوئی چیز اسی وقت تقسیم کرسکیں گے جب وہ چیز ہمارے پاس ہوگی۔ کھانے کو کچھ ہوگا ہی نہیں تو ہم کھانا تقسیم کہاں سے کریں گے۔ چونکہ ملائیشیا معدنی دولت سے مالا مال ہے اور اس کے پاس ہنرمند انسانوں کی کمی بھی نہیں ہے، اس لیے اس ملک سے ہی اس کی توقع کی جاسکتی ہے اور ہماری امیدیں انور ابراہیم کے ساتھ وابستہ تھیں۔ ان کے ساتھ ہماری ملاقاتیں ہوتی رہتیں۔ ہم نے ان کے سامنے کئی منصوبے رکھے اور ایسے مقالے اور تقریریں ان کے لیے لکھیں جن سے انہیں دلچسپی ہوسکتی تھی۔

مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا ہمارے لیے ملائیشیا کو سمجھنا مشکل ہوتا گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے جیسے وہ پھیل رہا ہے ویسے ویسے ہی وہ پیچھے بھی ہٹ رہا ہے۔ میں نے جب ملائیشیا جانا شروع کیا تھا تو کوالا لمپور مجھے ایک چھوٹا سا شہر معلوم ہوتا تھا۔ لیکن میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک گلوبل پوسٹ ماڈرن شہر بن گیا۔ چاروں طرف اونچی اونچی عمارتیں جسم پر پھوڑوں کی طرح پھیلتی چلی جارہی تھیں۔ زمین کی قیمتیں بڑھ رہی تھیں اور پرانی روایتی عمارتوں کی جگہ نئی عمارتیں لے رہی تھیں۔ ہر سمت قدیم روایت ٹوٹ رہی تھی۔ سکون ختم ہوگیا تھا اور افراتفری کا دور دورہ تھا۔ پانچ سال کے اندر بہت کچھ بدل گیا۔ معاشی ترقی سے لوگوں کا معیار زندگی ہی بلند نہیں ہوا بلکہ ایک ایسا طبقہ بھی پیدا ہوگیا جس کے پاس بہت دولت تھی۔ یہ نو دولتیا طبقہ بی ایم ڈبلیو اور مرسیڈیز کاروں اور نئے نئے فیشن کے قیمتی لباسوں کا شوقین تھا۔ جس چیز کی بھی نج کاری کی

جاسکتی تھی کر دی گئی اور ان لوگوں کے حوالے کر دی گئی جو وزیر اعظم کے قریب تھے۔ اچانک دولت مل جانے سے ذہنیت بھی بدلی۔ اب ہر چیز اوپر کی طرف جارہی تھی۔ اونچی اونچی عمارتیں حتی کہ دنیا کا سب سے اونچا ٹاور بھی بنالیا گیا۔ صرف یہ شوق تھا کہ گنیس بک آف ورلڈ ریکارڈ میں نام لکھوالیا جائے۔ ہر طرف امریکی کلچر تھا۔ ہر جگہ میڈونا اور مائیکل جیکسن نظر آتے تھے۔ ہر آدمی اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔ ملائیشیا کے لوگ براہ راست بات نہیں کرتے۔ مثلاً وہ یہ نہیں کہیں گے کہ آپ کا کیا حال ہے؟ بلکہ وہ کہیں گے آپ نے چاول کھائے ہیں؟ ایک دوسرے کی غیبت کرنا اور لطیفے سنانا ان کا مشغلہ ہے۔ وہ چیزوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے بھی ماہر ہیں۔ وہ یہ نہیں کہیں گے کہ حالات خراب ہو رہے ہیں بلکہ کہیں گے بالکل ہی تباہی آ گئی ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا ''ہمارے لیے تنگ ہوتی جارہی ہے۔'' میں سمجھا وہ زمین کی تنگی کی بات کررہے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ان کا اپنا کلچر ختم ہوتا جارہا ہے اور مغربی کلچر اس پر چھا رہا ہے۔ وہ گلوبلائزیشن کی شکایت کررہے تھے جس کی وجہ سے مقامی کلچر تباہ ہورہے ہیں۔ وہ بیک وقت اپنے گھر میں بھی تھے اور بے گھر بھی۔

''کیا یہاں ایسی کوئی جگہ ہے جس پر گلوبلائزیشن کا اثر نہ ہوا ہو؟'' میں نے ایک دوست سے سوال کیا۔

''ہاں ہے'' اس نے جواب دیا۔ ''وہ سراوک کے جنگلوں کے قلب میں ہے۔'' چنانچہ میں ایک دن صبح ہی صبح ہوائی جہاز سے سراوک کے دارالحکومت کوچنگ روانہ ہوگیا۔ میں کوئی رومانٹک آدمی نہیں ہوں پھر بھی میں ایک تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ ملایا کی دنیا بارانی جنگلوں میں گھری ہوئی ہے۔ یہاں کے لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ان جنگلوں میں بھوت پریت بھی ہوتے ہیں۔ ان جنگلوں کا کیا کیا جائے؟ گلوبلائزیشن والی اس دنیا میں یہ بھی ایک سوال کیا جارہا ہے۔

میں سویرے سویرے بونو دریا کے کنارے کنار بیورنیو کے گھنے جنگل میں ابان ہاؤس کی طرف روانہ ہوا۔ سکرانگ دریا کا راستہ پانچ گھنٹے کا تھا۔ جو پتھریلی سڑک پر کیا گیا۔ کہیں تو سرے سے سڑک ہی نہیں تھی۔ میرے ساتھ دو مالے دوست تھے۔ سکرانگ دریا میں ہم نے کشتی پر سفر کیا۔ ایک جگہ ہمیں کشتی کو گھسیٹنا بھی پڑا۔ بونو دریا کے کناروں پر ایک دوسرے سے چند کلو میٹر کے فاصلے پر ابان لوگ رہتے ہیں۔

ابان لوگ آج بھی اسی طرح رہتے ہیں جیسے صدیوں سے رہتے چلے آرہے ہیں۔ وہ

بہت ہی خوش اخلاق اور مہمان نواز ہیں۔ وہ اپنی معیشت میں خود کفیل ہیں۔ وہ دھان کاشت کرتے ہیں اور بانس اور بید سے اپنی ضرورت کی ہر چیز بنا لیتے ہیں۔ ان کے لیے وقت کا پیمانہ سمندر کا مدو جزر ہے یا ان کے اپنے علاقے میں کسی کی موت یا پیدائش۔ ان کی زبان کا کوئی رسم الخط نہیں ہے اور وہ اپنے گانوں میں ہی تاریخ کو یاد رکھتے ہیں۔ یہ گانے نسل در نسل چلے آرہے ہیں۔ مرد اور عورتیں دونوں اوپر کے دھڑ سے ننگے رہتے ہیں۔ مرد ایک چھوٹے سے کپڑے سے اپنا نچلا دھڑ ڈھانپ لیتے ہیں اور عورتیں ایک چادر یا سارانگ لپیٹ لیتی ہیں۔ ایک ایک گھر میں کئی کئی خاندان رہتے ہیں۔ میں جس گھر یا لانگ ہاؤس میں ٹھہرا تھا اس میں بیالیس خاندان رہتے تھے۔ ہر آدمی مصروف تھا۔ کوئی چٹائیاں بنانے کا سامان تیار کر رہا تھا تو کوئی چٹائیاں بن رہا تھا۔ کوئی مچھلی پکڑنے کا جال بن رہا تھا تو کوئی ٹوکریاں یا تنکوں کے ہیٹ بنا رہا تھا۔

میرا استقبال ایک چوپال میں کیا گیا۔ میرا خیر مقدم کرنے والا ستر سال کا لاٹو تھا۔ وہ کوئی ایک سو چالیس سینٹی میٹر لمبا ہوگا۔ اس کے بازو گدے ہوئے تھے اور کانوں میں بڑے بڑے چھید تھے۔ اس نے مجھے بیڑی پینے کو دی۔ بیڑی کے لیے تمباکو وہیں کاشت کی جاتی ہے۔ ہم کئی گھنٹے وہاں بیٹھے بیڑی پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ شام ہونے لگی تو ٹھنڈ کا احساس ہوا۔ اس وقت تک اور بھی لوگ وہاں جمع ہو گئے تھے، اور ٹھنڈ سے بچنے کے لیے ایک دوسرے سے جڑے بیٹھے تھے۔ ان میں نوجوان بھی تھے۔ تین نوجوانوں نے جو کھانے کے بعد وہاں آئے تھے وہاں بیٹھی لڑکیوں کے ساتھ کچھ کھسر پھسر کی۔ وہ خوشی سے کھل اٹھیں۔ ایک لڑکی اٹھی اور اس نے لاٹو کے کان میں کچھ کہا۔ لاٹو نے اس کی بات پسند نہیں کی۔ لیکن پھر ایک اور لڑکی بھی اس کے پاس پہنچ گئی اور تینوں میں باتیں شروع ہو گئیں۔ آخر لاٹو مان گیا۔

میں خاموش بیٹھا دیکھ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

اچانک گھر گھر کی آواز آنے لگی جیسے باہر بہت سی موٹریں چلنا شروع ہو گئی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اس گھر کے دوسرے باسی بھی وہاں جمع ہونے لگے۔ اب دو لڑکیاں آئیں اور انہوں نے نہایت احترام کے ساتھ دو کالے بکس سب کے سامنے رکھ دیے۔ پھر وہ ایسے قدموں سے واپس گئیں جیسے رقص کر رہی ہوں۔ وہ سامنے سے ہٹیں تو سامنے ایک ٹیلی وژن اور ایک ویڈیو پلیئر نظر آیا۔ ایک نوجوان نے اٹھ کر بانس پر ایک پوسٹر لگا دیا۔ لاٹو مجھے دیکھ کر مسکرایا اور آرام سے

بیٹھ گیا۔ میں نے پوسٹر دیکھا۔ ایک آدمی چمڑے کی جیکٹ پہنے اور سیاہ چشمہ لگائے موٹر سائیکل پر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں شاٹ گن تھی۔ پوسٹر پر لکھا Terminator 2: Jugement Day کسی نے جنریٹر چلایا اور ٹی وی میں کیسٹ ڈالا اور ہم امریکی فلم دیکھنے لگے۔

آپ گلوبلائزیشن سے بھاگ تو سکتے ہیں لیکن اس سے چھپ نہیں سکتے۔ اس کے مسائل اوراس کے اثرات ہر جگہ آپ کا پیچھا کریں گے چاہے آپ شہروں سے دور گھنے جنگل میں ہی کیوں نہ ہوں۔ ہر طرف پھیلتی جدید آبادیوں کے باوجود آپ ملائیشیا میں ایک اور غرناطہ بنانے کا خواب تو دیکھ سکتے ہیں۔ البتہ ان خوابوں پر اعتبار کرنا آپ کے لیے مشکل سے مشکل تر ہوتا جارہا ہے۔ اس بارانی جنگل میں آپ کے قدم جتنا آگے بڑھتے جائیں گے اتنا ہی جنگل کی بڑی بڑی تتلیاں پیچھے اور پیچھے اڑتی اور بھاگتی چلی جائیں گی۔

دور بھاگتی تتلیوں کے پھڑ پھڑاتے پر ہوا میں طوفان مچا رہے ہیں۔ کوالالمپور کی فضا تاریک ہوتی جارہی ہے۔ زہریلی گرد اور دھواں سار ہر طرف پھیل رہا ہے۔ صبح کو میرل اپنے بنگلے کی کھڑکیاں کھولتی ہے تو بدبودار دھول سی اندر آجاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی جلنے کی بو آتی ہے اور ہر چیز پر راکھ سی جم جاتی ہے۔ سیاسی فضا بھی اسی طرح مسموم ہورہی تھی۔ ملائیشیا کے تنہا لیڈر مہاتیر محمد کو انور ابراہیم سے خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ ان کی جگہ لے لیں گے۔ بہت جلد معلوم ہوگیا کہ ''ایشیا کا معاشی معجزہ'' غبار آلود ہوا سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ کئی قسم کے مالی اسکنڈل سامنے آگئے۔ معاشی ماہرین نے سوال کرنا شروع کیے کہ یہ مادر پدر مالی اور معاشی آزادی ہمیں کہاں لے جائے گی۔

۱۹۹۲ء میں وزیر خزانہ بننے کے بعد انور ابراہیم نے بار بار تنبیہ کی تھی کہ کاروبار میں ذمہ داری کا ثبوت دیا جائے اور بد دیانتی اور سستی و کاہلی سے گریز کیا جائے۔ انور ابرہیم اینٹی کرپشن ایجنسی کے انچارج بھی تھے۔ انہوں نے اپنا کام دیانت داری کے ساتھ کیا تو بہت سے بڑے لوگ ان سے ناراض ہوگئے۔ ان میں مہاتیر اور ان کے قریبی ساتھی بھی شامل تھے۔ ۱۹۹۷ء میں تھائی لینڈ، کوریا اور انڈونیشیا کے ساتھ ملائیشیا کی معیشت بھی ایک دم بیٹھ گئی۔ ان کی کرنسی اور اسٹاک مارکیٹ کو بہت نقصان پہنچا۔

اس معاشی تباہی کے بعد مہاتیر اور انور ابراہیم کے تعلقات بالکل ہی خراب ہوگئے۔ یہ جھگڑا صرف اس وقت کی سیاست کا ہی نہیں تھا بلکہ یہ ملائیشیا کے مستقبل کا جھگڑا تھا۔ مہاتیر کی

پالیسی یہ تھی کہ کسی طرح پہلے انور ابراہیم کے اختیارات کم کیے جائیں پھر انہیں برطرف کر دیا جائے۔ چنانچہ امریکی صدر بل کلنٹن کی طرح ان کا جنسی اسکنڈل اختراع کیا گیا۔ اگر عام جنسی اسکنڈل بنایا جاتا تو شاید اس کا کوئی اثر نہ ہوتا کیونکہ ملائیشیا میں ایسے واقعات نئے نہیں ہیں۔ لیکن ان پر ہم جنسی کا الزام لگایا گیا اور یہ الزام ایسا تھا جو انور کے دیہاتی حامیوں کو متاثر کر سکتا تھا۔ ان پر جو مقدمہ بنایا گیا اس میں ان کے ڈرائیور، ان کے مُنھ بولے بھائی اور جو بھی مل سکتا تھا اسے ملوث کر لیا گیا۔

مہاتیر محمد نے ملائیشیا کی معیشت کی تباہی کا ذمہ دار غیر ملکی سازش کو قرار دیا۔ انہوں نے غیر ملکی کرنسی کے امریکی تاجر جارج سوروس، غیر ملکی پریس اور آئی ایم ایف کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ اس عرصے میں کئی بڑی بڑی فرمیں تباہ ہو گئیں۔ حالات خراب ہوئے تو لوگوں نے مہاتیر محمد کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ آخر ۲ ستمبر ۱۹۹۸ء کو طوفان پھٹ پڑا۔ کابینہ کے اجلاس میں مہاتیر نے انور سے کہا کہ وہ استعفیٰ دے دیں ورنہ انہیں برطرف کر دیا جائے گا۔ انور نے برطرف ہونا قبول کیا۔ دوسرے دن اخبار انور کے خلاف الزاموں سے بھرے پڑے تھے۔ ایک ہفتے کے اندر مہاتیر نے انور کو حکم راں پارٹی سے بھی نکال دیا۔ انور نے اعلان کیا کہ اعلیٰ سطح پر ان کے خلاف سازشیں کی جارہی ہیں۔

حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ ایک ہفتے کے اندر انور کا مُنھ بولا بھائی سکما درماون اور انور کی تقریریں لکھنے والا ہمارا اجمالی ساتھی منور انیس احمد بھی پکڑے گئے۔ میرل دوڑ بھاگ کرتی رہی۔ وہ منور کی بیوی کا خیال بھی رکھ رہی تھی اور قانونی امداد کے لیے بھی کوششیں کر رہی تھی۔ منور کا پتہ نہیں تھا کہ اسے کہاں رکھا گیا ہے۔ ہفتہ ختم ہونے سے پہلے ہی منور اور سکما کو عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ انہیں ایسے وکیل دئے گئے تھے جنہیں وہ جانتے تک نہیں تھے۔ منور کو اس کی بیوی بھی نہیں پہچان سکی۔ اس کا سر مونڈھ دیا گیا تھا اور وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ظاہر تھا کہ ان دونوں پر تشدد کیا گیا تھا۔ ان دونوں کو سزا ہو گئی۔

کامن ویلتھ گیمز ختم ہونے پر جب تقریب منعقد ہوئی تو مہاتیر کے خلاف نعرے لگائے گئے۔ ادھر کوالا لمپور کے وسط میں اسی وقت ایک جلسہ عام ہو رہا تھا جس میں انور ابراہیم خطاب کر رہے تھے۔ اسی شام ان کے گھر پر چھاپہ مارا گیا اور انہیں گرفتار کر کے سیکیورٹی ایکٹ کے تحت بکتی امان جیل میں ڈال دیا گیا۔ شہر میں مظاہرے شروع ہو گئے تھے۔ مظاہرین مہاتیر محمد

کے گھر کی طرف جانا چاہتے تھے۔ ان پر پانی کے گولے پھینکے گئے اور ان کا راستہ روکا گیا۔ صبح ہونے تک سارے شہر میں پولیس فوج اور ٹینک گشت کر رہے تھے۔

انور کی ہدایت پر میں ان کی گرفتاری سے چند ہفتے پہلے ہی لندن چلا آیا تھا۔ ان کی گرفتاری کے بعد ان کے تمام قریبی ساتھی بھی گرفتار کر لیے گئے تھے۔ میں نے میرل کو بار بار فون کیا کہ وہ کوالالمپور چھوڑ دے۔ آخر میرل بھی اپنا سامان باندھ کر سنگاپور چلی گئی۔ میں یورپ اور امریکہ میں انور کے با اثر دوستوں سے درخواست کر رہا تھا کہ وہ اپنا اثر ورسوخ استعمال کریں اور انور کو بچائیں۔ انور پر جو تشدد کیا گیا تھا اس کا ثبوت یہ تھا کہ انور جب عدالت میں پیش ہوئے تھے تو ان کی ایک آنکھ نیلی تھی۔ ان پر خود پولیس کے افسر اعلیٰ نے تشدد کیا تھا۔ مجھے منوّر انیس کی بھی بہت فکر تھی۔ وہ بھی جب عدالت میں آئے تھے تو انہیں بھی کوئی پہچان نہیں سکا تھا۔ میں ہر وقت سی این این اور دوسرے ٹی وی چینلز پر خبریں دیکھتا رہتا تھا۔

یہ گویا ۱۴۹۲ء تھا اور ہم اسپین سے نکالے جا رہے تھے۔ مجھے بار بار ابن حزم یاد آ رہے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ آپ کتنے ہی روشن دماغ اور سمجھ دار ہوں مطلق العنانی کسی نہ کسی طرح ضرور در آئے گی۔ کثرت پسندی اور مطلق العنانی کے درمیان ہمیشہ تصادم رہتا ہے۔ ابن حزم نے کہا کہ آپ صدیوں میں جو بہشت بناتے ہیں کوئی بھی پاگل انسان اسے ایک دن میں تباہ کر دیتا ہے۔ مسلم اسپین اسی طرح تباہ ہو جائے گا۔ یہ بات ابن حزم نے کہی تھی اور یہی حال ملائیشیا کا ہو رہا تھا۔

خلاصہ کلام

نیچے جا رہے ہیں یا اوپر

ملائیشیا کے ناکام تجربہ کے بعد میں اپنا وقت اپنے گھر کے باغیچے میں بسر کرنے لگا۔ ہم جب اس گھر میں آئے تھے تو اس باغیچے میں اونچی اونچی گھاس کھڑی تھی جس میں بچے دوڑتے پھرتے تھے۔ ایک طرف بچوں کے لیے جھولا ڈال دیا گیا تھا۔ ایک چھوٹا سا حوض تھا جس میں میری بیٹی نہانے کا کالا لباس پہن کر نہاتی تھی۔ اب میں ایک مشہور دانشور بن چکا تھا اور بچے بھی بڑے ہو گئے تھے تو میں نے گھر کی از سر نو تعمیر شروع کی اور باغیچے کی طرف بھی توجہ کی۔ میں نے مشہور اسلامی جیومیٹرک طرز پر باغیچہ ڈیزائن کیا۔ باغوں کے اسلامی طرز میں شہری زندگی اور فطرت کے درمیان ہم آہنگی پیدا کی جاتی ہے۔ میں نے سوچا کہ باغ ہشت پہلو ہونا چاہیے جس کے بیچ میں فوارہ ہو اور وہاں سے دوسرے تکونی طرز کے ڈیزائن نکلیں جو پھولوں کی کیاریاں ہوں۔ لیکن جس باغبان نے وہ باغ بنایا اس کا خیال کچھ اور ہی تھا۔ اس نے اپنا بوجھ کم کرنے کے لیے ایک اور ہی ڈیزائن بنایا۔ باغبان کا نام تھا اسٹیو اور شاید اس کا اپنی گرل فرینڈ سے جھگڑا ہو گیا تھا کہ باغ کا کام مکمل کرنے میں اس نے کئی برس لگا دیے۔ میں نے سوچا اپنی جنت بنانے کے یہی مسئلے ہیں۔

ایک سہ پہر جب دھوپ نکلی ہوئی تھی اور میں اپنے باغیچے میں بیٹھا تھا تو مجھے اوانا کلب یاد آ گیا جہاں انور ابراہیم سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ وہاں کوئی کانفرنس ہو رہی تھی جہاں اجمالی دوست جمع تھے۔ ایک صبح میں جلدی جاگ گیا۔ اس دن ہم فارغ تھے۔ میں کیبل

کار کے ذریعہ وہاں سے گینٹنگ ہائی لینڈ ریزارٹ چلا گیا جو سطح سمندر سے کوئی دو ہزار فٹ بلند پہاڑ پر ہے۔ میں نے کلب سے جو کتابچہ اٹھایا تھا اس میں لکھا تھا کہ آپ وہاں ملائیشیا کی زندگی کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ وہاں تھیٹر ریستوراں میں آپ ڈرامے دیکھ سکتے ہیں۔ کتابچے سے لگتا تھا جیسے وہاں ارب پتی لوگوں کی تفریح کا سامان ہے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وہ عام سا کسینو تھا جس میں بیزار چہرے لیے چینی گھوم رہے تھے۔ اصل میں جوا کھیلنے والے تمام لوگ ہی افسردہ ہوتے ہیں۔

وہاں سے واپس آیا تو لندن کی طرح کے کہر اور غبار نے میرا استقبال کیا۔ اس وقت تک چند اجمالی دوست کھانے کے لیے اکٹھے ہو چکے تھے۔ ریستوراں خالص ملائیشیائی انداز میں بنایا گیا تھا۔ اونچی اونچی چھتیں اور کھڑکیوں سے اردگرد کی پہاڑیاں نظر آتی ہوئی۔ دیواروں کے بجائے چھتیں ستونوں پر کھڑی تھیں جس کی وجہ سے ہم چاروں جانب دیکھ سکتے ہیں۔ ہم ہال کے بیچ میں بیٹھے سامنے اٹھتا طوفان دیکھ رہے تھے۔ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی۔ زور سے بجلی چمکتی تھی اور اس کے بعد بادل گرجتے تھے۔ چاروں طرف ایسا کھلا ہوا تھا کہ لگتا تھا جیسے ریستوراں کے اندر ہی بارش ہو رہی ہے۔ موسم کی طرح ہمارا مزاج بھی خراب تھا۔ ہم نے مشکل سے ہی کوئی بات کی ہوگی۔ کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ کانفرنس بالکل ہی ناکام تھی۔ مقرر پر مقرر ہمیں سمجھا رہا تھا کہ اسلام کے پاس ہر سوال کا جواب موجود ہے۔ ہمارے علماء نے کیسے تمام مسائل حل کر دیئے ہیں اور اگر ہم ''جنت کی کلید'' یعنی کلمہ پڑھ لیں تو سیدھے جنت میں جائیں گے۔ یہی وہ باتیں تھیں جو میں کئی سال پہلے تبلیغی جماعت والوں سے سن چکا تھا۔ ہم وہاں بیٹھے اپنے حالات پر ماتم کرتے رہتے تھے کہ نئے زمانے کے مسلمانوں کی ان حماقتوں نے انہیں ناکارہ بنا دیا ہے۔

مایوسی اور بے بسی اکثر ہمیں ماضی کی طرف لے جاتی ہے۔ ہمیں ماضی کی یاد ستانے لگتی ہے۔ ''وہ کیا چیز تھی جس نے اندلس کو ایک طویل عرصے تک کامیاب بنائے رکھا اور اس کے نہایت روشن نتائج برآمد ہوئے؟'' میرل نے سوال کیا۔

''وہاں رواداری کا ماحول تھا'' گلزار حیدر نے جواب دیا۔ ''وہاں لسانی، علاقائی اور مذہبی رواداری تھی اور علم اور ثقافت کی پیاس تھی مصوری، شاعری، موسیقی اور فلسفہ کے علوم عام تھے اور کوئی بھی انہیں غیر اسلامی نہیں کہتا تھا اور آج ہم اس رواداری سے عاری ہیں۔''

''بالکل صحیح کہا'' میں نے کہا۔

''اسلام میں ان سب کی گنجائش موجود ہے۔ پہلے بھی یہ علوم ہمارے پاس تھے اور اب بھی ہمارے ہوسکتے ہیں۔ ہم تو کہہ سکتے ہیں کہ اسلام میں علم حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔'' میرل نے کہا۔

''کس اسلام کی بات کررہے ہیں آپ۔'' پرویز بولے ''زمین کو چپٹی ماننے والوں کا اسلام؟ دینی علماء کا اسلام؟ ایرانی انقلابیوں کا اسلام؟ یا سعودی وہابیوں کا اسلام؟ یا پھر حکمرانی کے خواب دیکھنے والے اخوان المسلمون اور جماعت اسلامی کا اسلام؟ یا سادہ لوح تبلیغی جماعت والوں کا اسلام۔'' اسے احساس نہیں تھا کہ وہ چیخ چیخ کر باتیں کررہا ہے۔

''چیخ کیوں رہے ہو؟'' میں نے کہا۔

''آیت اللہ صاحب'' وہ پھر چیخا ''ہم ناکام ہوچکے ہیں اور بری طرح ناکام ہوچکے ہیں۔ ہم نے جو مباحث شروع کیے تھے وہ سر کے بل زمین پر آرہے ہیں۔ آپ اسلامی سائنس کسے کہتے ہیں؟''

میں نے اس سوال کو نظر انداز کردیا۔

''بولو نا آیت اللہ صاحب،'' پرویز نے طنزیہ انداز میں کہا ''ہمارے علم میں کچھ تو اضافہ کرو۔''

''ٹھیک ہے'' میں نے جھنجھلا کر کہا۔ میں نے سمجھایا کہ ہم نے اسلامی سائنس کا جو تصور دیا ہے اس سے مسلم معاشروں کی بنیاد علم پر رکھی جائے گی۔ ان معاشروں میں مقامی مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے ریسرچ اور تحقیق و جستجو کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ بعض مسائل کا تعلق صرف مسلمان ملکوں سے ہی ہے۔ اس ریسرچ میں ان مسائل کو ترجیح دی جائے گی۔ ذرا سوچئے دنیا میں تین چوتھائی سیاسی پناہ گزیں مسلمان ہیں۔ ان کے لیے ایسے مراکز قائم کیے جاسکتے ہیں جن میں جلدی بننے والے سستے مکانوں کے لیے عمارتی سامان، صاف پانی فراہم کرنے کے سستے طریقے اور صحت وصفائی کا بہترین نظام وضع کیا جاسکتا ہے۔ ان تمام کاموں کے لیے بہتر تیکنیک بنائی جاسکتی ہے۔ میرا خیال ہے اس طرح ہماری دیسی طب اور دوسرے مقامی علوم کو فروغ حاصل ہوگا۔ دیسی طب، حفظان صحت اور زراعت وغیرہ پر نئے سرے سے ریسرچ کی جاسکتی ہے۔ بعض فلسفیانہ مسائل پر بھی از سر نو غور ہوسکتا ہے۔ اگر فطرت، وقت،

کائنات، منطق اور انسانی فطرت کے بارے میں بنیادی مابعد الطبیعیاتی تصوّر بدل کر اسلامی تصور رائج کیا جائے تو جدید سائنس کا کیا بنے گا ؟ مثال کے طور پر فطرت کو ایسی چیز نہ سمجھا جائے جسے ہم اپنے مقاصد کے لیے استعمال کریں بلکہ اسے قدرت کی دی ہوئی امانت مانا جائے اور اس کی نگہداشت اور پرورش کی جائے ۔ طبیعیات کے بنیادی طریق کار یعنی تجربات کے لیے چیڑ پھاڑ کی جگہ کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا ؟ اگر ہم انسانی اقدار اخلاق اور اخلاقی اصولوں کو سائنس اور سائنسی عمل کا لازمی جزو بنالیں تو اس سے خود سائنس کتنی تبدیل ہو جائے گی۔ یہ وہ باتیں ہیں جو میں سوچتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ ایسا ہو جائے۔''

''اور اگر بنیاد پرستوں نے اسلامی سائنس کے بارے میں تمہارے تصوّر کو اغوا کر لیا تو پھر کیا ہوگا؟'' پرویز چیخا۔ ''بنیاد پرست قرآن میں سائنسی معجزے تلاشش کر رہے ہیں ۔ انہوں نے تو اضافیت سے لے کر کوانٹم میکینکس، بگ بینگ تھیوری اور ایمبر یالوجی تک ہر چیز قرآن میں تلاش کر لی ہے ۔ اب تو وہ پاکستان میں جنات کو قابو کرنے کے لیے تحقیق کر رہے ہیں ۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔ ''صوفیاء نے تو اس بحث کو ذات مطلق کی جستجو تک ہی محدود کر دیا ہے۔ ہر چیز کو مقدس بنا دیا گیا ہے اور علم کا کوئی بھی سماجی مقصد نہیں رہا۔ آپ جو سوچتے ہیں اور عملاً جو ہو رہا ہے اس کے درمیان کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔''

پرویز نے اپنے اردگرد پھیلی افسردگی کا جائزہ لیا۔ لیکن کوئی بھی نہیں بولا۔

''اسلام کے مستقبل کے بارے میں آپ کے سوچنے کا انداز کیا ہوگا؟ اور اسلامی تہذیب کے روشن اور تابناک مستقبل کے بارے میں جو آپ کا تصور ہے اس کے بارے میں کیا خیال ہے ؟ اور اسلامی علوم کی جدید درجہ بندی کے سلسلے میں آپ جو کوشش کر رہے ہیں اور علوم کے نئے شعبے وضع کرنے کے لیے جو تجاویز دے رہے ہیں کیا وہ عام مسلمانوں کی امیدوں اور امنگوں کے مطابق ہیں۔''

اب بھی کسی نے جواب نہیں دیا۔ پرویز غصے میں کھڑا ہو گیا۔ ''امہ اس قابل ہی نہیں ہے۔ ان لوگوں سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' وہ طیش میں کھولتا ہوا ریستوراں سے باہر جانے لگا۔ ''میں سبکدوش ہو رہا ہوں اس امہ سے۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

میں نے انور نسیم کے سامنے رکھے ٭ کو دیکھا۔ نہایت نزاکت کے ساتھ کٹی ہوئی کئی قاشیں ان کی پلیٹ میں رکھی تھیں۔ میں نے ایک قاش اٹھا کر منھ میں رکھ لی ۔ لیکن یہ کام

کرتے ہوئے مجھے ایسا لگا جیسے میں کوئی بہت ہی محنت کا کام کر رہا ہوں۔ میں جسمانی اور جذباتی طور پر تھکن محسوس کر رہا تھا۔ میں نے انور نسیم کو دیکھا اور تھکی ہوئی آواز میں کہا ''پرویز سچ کہتا ہے۔ ہم بری طرح ناکام ہو چکے ہیں۔ اگر اسلام کے وہ تمام عقائد اور فرقے جو چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اتنے ہی کٹے پھٹے اور مطلق العنان ہیں تو پھر ہم جیسے مسلم دانشوروں کے لیے کوئی امید ہی کہاں رہ جاتی ہے؟''

انور نسیم گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ انہوں نے سر ہلایا ''میں دانشور نہیں ہوں۔'' انہوں نے کہا'' اور مجھے تمہارے اوپر بھی شک ہے۔'' اس پر قہقہہ پڑا اور اس کے ساتھ ہی ہم ڈرائنگ روم سے باہر آ گئے۔ لفٹ کے پاس کھڑے کھڑے میں نے کہا'' واقعی اگر اسلام کے یہ تمام مسلک ایسے ہی کٹے پھٹے ہیں تو ہم اس صورت حال کو کیسے بہتر بنا سکتے ہیں۔ خاص طور پر ایسے وقت جب تمام طاقت انسانی جذبات سے عاری داڑھی والوں کے ہاتھ میں ہے؟''

ٹنگ کی آواز کے ساتھ لفٹ آ گئی۔'' مجھے اپنی چابیاں لینا ہیں۔'' کسی نے کہا۔ ہم زیادہ تعداد میں تھے۔ سب نے اپنے آپ کو سکیڑا تاکہ ایک موٹی تازی عورت باہر آ سکے۔'' میں صرف سگریٹ لینے جا۔۔۔'' اس کے باقی الفاظ نہیں سنے جا سکے کیونکہ لفٹ کا دروازہ بند ہو گیا تھا۔ ایک دوسرے سے چپٹے ہوئے لوگوں میں سے ایک ہاتھ دروازہ کھولنے والے بٹن کی طرف بڑھا۔ ہم باہر آ گئے۔ گلزار نے ہمیں روکا۔ اور اپنے کمرے کی چابیاں گھماتے ہوئے ہمیں پھر لفٹ میں داخل کر دیا۔'' ٹھہرو ٹھہرو میرل بھی آ رہی ہے۔'' کسی نے کہا۔ پھر دروازہ کھلا۔ کوئی اور تو نہیں رہ گیا؟ میرل نے کہا اور اب ظفر اور منور بھی آ گئے۔

پرویز کی باتیں جاری تھیں۔ لیکن ہم سن نہیں رہے تھے کیونکہ سب اپنی سانسیں درست کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لفٹ کا دروازہ کئی مرتبہ کھلا تھا اور پھر بند ہوا تھا۔ پرویز بول رہا تھا اور وہاں سوال جواب ہو رہے تھے'' کس فلور پر جائیں گے؟'' نہیں یہ دروازہ کا بٹن ہے'' نہیں نہیں، پہلے دروازہ تو بند کرو۔'' پہلے کس کا فلور آئے گا؟'' یہ آخری سوال بے کار نہیں تھا۔ اوانا کلب عجیب و غریب طریقے سے بنایا گیا ہے۔ ریسپشن اور پبلک روم تو توقع کے مطابق گراؤنڈ فلور پر ہی ہیں۔ لیکن مہمانوں کے تمام سویٹ ریسپشن سے بھی نیچے ایک پہاڑی کی اوٹ میں بنائے گئے ہیں۔ اس لیے اپنے سویٹ تک پہنچنے کے لیے اوپر نیچے نمبر تلاش کرنا پڑتے ہیں۔ اب یہ سوچا جا رہا تھا کہ کس کمرے میں چائے پی جائے۔ اسی لیے سوال ہو رہا تھا

کہ کہ کس فلور پر اترا جائے۔ ''ہمیں ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔'' پرویز نے اس شور میں زور سے کہا۔اب ہماری لفٹ نیچے کی طرف جارہی تھی۔

''عقل سے کام لو،'' انورنسیم بولے'' اگر مسلم دانشوروں کا ایک گروپ اپنی لفٹ صحیح نہیں چلاسکتا تو طاقت ور گروہ کا مقابلہ کیسے کرسکتا ہے۔'' اس پر پھر قہقہہ بلند ہوا۔آخر ہم بری حالت میں جنت اور جہنم کے درمیان کہیں اتر گئے۔ہنس ہنس کر ہمارا برا حال ہو رہا تھا۔قہقہے تھمے تو نسیم بولے'' مجھے وہ مارکسسٹ یاد آ گیا جو اپنے قریب المرگ باپ کے لیے دوا لینے کیمسٹ کے پاس گیا تھا۔ واپسی میں اسے غریب لوگوں کا ہجوم نظر آیا تو اس نے تقریر شروع کر دی اور کہنے لگا کہ تمہیں منظم ہو کر بورژوازی کا مقابلہ کرنا چاہیے۔تمہیں طبقاتی نظام ختم کرنا چاہیے اور حکم رانوں کے مقابلے میں کھڑا ہو جانا چاہیے۔'' وہ مسلسل تقریر کیے جا رہا تھا کہ اتنے میں اس کا بھائی اس کے قریب آیا اور بولا'' یہاں تم جدلیاتی مادیت کے نکات سمجھا رہے ہو اور وہاں ہمارے باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔''

انورنسیم تھوڑی دیر خاموش ہوئے پھر بولے'' بھائیو، اس وقت پاور اسٹرکچر کا مقابلہ کرنا خودکشی ہوگا۔چاروں طرف وہ لوگ عوام کو اسلام کے لیے جان دینے پر آمادہ کر رہے ہیں اور انہیں اکسا رہے ہیں کہ طاقت کے خلاف سینہ سپر ہو جاؤ۔اس سے صرف ایک ہی کام ہوا ہے کہ لاشوں کی تعداد بڑھ گئی ہے۔آپ یقیناً انہیں شہید اور اسلام کے لیے قربانیاں دینے والے کہہ سکتے ہیں لیکن اس سے فرق کوئی نہیں پڑ رہا ہے۔کوئی تبدیلی نہیں آرہی ہے۔''

''بالکل صحیح کہا''میں نے زور سے کہا۔'' اب وقت آ گیا ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ کھڑے ہوں اور اسلام کے لیے زندہ رہنے کا مطالبہ کریں، حالانکہ یہ فیشن کے خلاف بات ہوگی۔شہادت کا اپنا درجہ ہے لیکن اس وقت اسلام کے لیے زندہ رہنا بڑی جرات اور محنت کا کام ہے۔اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنے کے لیے آپ کو سوچنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔مگر اللہ کے لیے زندہ رہنا ایک ایسا کام ہے جس کے لیے آپ کو ایسی باتیں سوچنا پڑیں گی جن کے بارے میں آپ نے پہلے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا اور اس کے لیے آپ کو مغرب اور باقی دنیا کی بری بھلی باتیں بھی سننا پڑیں گی۔''

ہم اپنے کمرے میں چلے گئے۔اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ اجمالیوں کا یہ آخری اجلاس ہوگا۔ہمارا گروپ انتہائی مایوسی اور افسردگی کے ساتھ منتشر ہوا اور پھر اس کا کوئی اجلاس نہیں ہوا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں بالکنی میں نکل گیا اور سامنے نہایت دلکش مناظر دیکھنے لگا۔ سامنے کالے کالے بادل تیر رہے تھے۔ اندھیرے میں ان بادلوں پر مجھے کچھ لکھا ہوا نظر آیا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ لکھا تھا:

''مایوسی گناہ ہے۔ نامردی کا علاج ہوسکتا ہے۔''

میری تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میری دلی کیفیت بادلوں نے کیسے پہچان لی۔ پھر میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ دواؤں کی کسی کمپنی کا اشتہاری بینر تھا جو ہوا میں تیر رہا تھا۔ میں کرسی پر گر گیا اور خلا میں گھورنے لگا۔ کاش ہم مسلمانوں کو ڈروتھی پارکر کے اس تجربے کا قائل کر سکتے جو اس نے خودکشی کے بارے میں کیا تھا۔ یعنی ''تم زندہ بھی رہ سکتے ہو۔''

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو یہ تلخ حقیقت واضح ہوئی کہ مسلم تہذیب کو استعارہ اور طریقہ کار دونوں انداز میں ہی خودکشی کا سامنا ہے۔ وہ منگل کا دن تھا اور دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ صبح کو مجھے اپنے بھانجے کا خط ملا جو اسٹاک بروکر کی ٹریننگ لے رہا تھا۔ ''یہ وہ عمارت ہے جہاں میں کام کرتا ہوں۔'' کارڈ کے پیچھے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تصویر تھی۔ رات کے وقت وہ عمارت روشنیوں میں جگمگا رہی تھی اور اردگرد مین ہٹن کی چھوٹی عمارتوں میں وہ سب سے اونچی نظر آ رہی تھی۔

سہ پہر کو میں نے یونیورسٹی کالج لندن میں قانون کے فارغ ہونے والے طلبہ کی گریجویشن کی تقریب میں شرکت کی۔ بعد میں ہم سب اس فوٹو گراف کے لیے جمع ہوئے جو اس موقع پر لیے جاتے ہیں۔ میری بیٹی اپنے ہاتھ میں قانون کی ڈگری لیے بڑے فخر کے ساتھ کھڑی تھی۔ ابھی ہم وہاں کھڑے ہی تھے کہ ہمارے اردگرد کچھ کھسر پھسر شروع ہوگئی۔ کوئی رو بھی رہا تھا۔ ہمارے پیچھے ایک امریکی طالبہ ہاتھ میں موبائل اٹھائے اس طرح کھڑی تھی جیسے وہ دستی بم یا بیمار چوہا ہو۔ وہ رو رہی تھی اور اس کا سارا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ''کیا بات ہے؟'' کسی لڑکی کی ماں نے اس سے پوچھا۔ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے خبر سنائی۔ ''اوہو'' ہم سب ایک ساتھ چیخ پڑے۔ ہمارے دل بیٹھ گئے۔

ہم سب اپنے اپنے گھروں کو بھاگے اور ٹیلی وژن کھول کر بیٹھ گئے۔ بار بار ایک ہی منظر دکھایا جا رہا تھا۔ ہوائی جہاز جس طرح قوس بنا کر ٹوئن ٹاور کی دوسری عمارت کے ساتھ ٹکرا

رہا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے جس طرح وہ عمارت آگ کا گولا اور مٹی کا ڈھیر بن رہی تھی وہ نظارہ ہمیشہ کے لیے میرے دماغ میں نقش ہو گیا۔

''عاطف عاطف، حنا حنا'' میری والدہ بھی رو رہی تھیں۔ وہ پوسٹ کارڈ جو صبح آیا تھا اسے کسی نے بھی اتنی توجہ سے نہیں پڑھا تھا جتنا اس لڑکے کی نانی نے پڑھا تھا۔ عاطف میرا بھانجا تھا جس نے وہ کارڈ بھیجا تھا اور حنا اس کی چھوٹی بہن تھی۔ میں نے اپنی بہن کو زبردستی راضی کیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے لیے نیویارک یونی ورسٹی بھیج دیں۔ ڈاؤن ٹاؤن مین ہٹن ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے صرف دو بلاک دور تھا۔ ہم پریشانی میں ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگے اور پھر ہم نے ٹیلی فون کرنا شروع کیے۔ ہم بار بار عاطف، حنا اور اپنی بہن کے نمبر ملا رہے تھے مگر وہاں سے عجیب و غریب آوازیں آ رہی تھیں۔ کوئی نمبر نہیں مل رہا تھا۔ میری والدہ کا برا حال تھا۔ وہ روئے جا رہی تھیں اور قرآن کی آیتیں پڑھ رہی تھیں۔ ہم سب کسی بھی بری خبر کا انتظار کر رہے تھے۔ ہم میں سے کسی کو بھی نیند نہیں آئی۔

آخر طویل انتظار کے بعد بدھ کی صبح کو ہمیں خبر ملی۔ میرا بھانجا پیر کے دن ہی نیویارک سے چلا گیا تھا۔ کتنا مبارک پیر تھا وہ۔ وہ اپنی ماں سے ملنے سان فرانسسکو چلا گیا تھا۔ اس کی بہن اپنی اپارٹمنٹ بلڈنگ کی اکتیسویں منزل پر سوئی ہوئی تھی۔ پہلے دھماکے سے ہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور پہلا ٹاور گرنے سے پہلے ہی وہ باہر نکل گئی تھی۔ گرد و غبار کا طوفان اس کے اپارٹمنٹ کی طرف بڑھ رہا تھا اور قریب تھا کہ وہ اس میں پھنس جاتی کہ ایک فائر مین نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے نیویارک کے پناہ گزیں کیمپ میں لے گیا۔

میں وہ منظر بار بار دیکھ رہا تھا اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ دہشت گرد بالعموم اور خودکش بمبار بالخصوص بہت ہی خاص قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ عام لوگوں سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔ یہ کسی دلیل، کسی منطق اور کسی عقلی توجیہ سے ماورا ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو دوسروں سے زیادہ پاک باز سمجھتے ہیں اور مذہب کی غلط تعبیر و تشریح سے اپنے طیش اور اپنے عمل کا جواز تلاش کرتے ہیں۔ ان کی باتیں اور ان کے وعظ میری سمجھ سے بالا ہیں۔ اور مسلمانوں کی اکثریت بھی ان سے اتفاق نہیں کرتی۔ لیکن بہر حال مسلم برداری بھی کسی نہ کسی حد تک اس کی ذمہ دار ہے۔ میں نے سعودی عرب، ایران اور پاکستان میں وہ تیاریاں دیکھی ہیں جنھوں نے اس پاگل پن کے یہ بیج بوئے جن کے یہ پھل نکلے ہیں اور اپنی

آنکھوں سے اسلامی تحریک کے وہ نام نہاد چیمپئن بھی دیکھے ہیں جو یہ نام نہاد جہادی پیدا کر رہے ہیں اور مسلم دنیا پر اسلام کے انہی چیمپئن کا قبضہ ہے۔

لفظی اور لغوی معانی کا تتبع، تمثیل کو واقعاتی اور لفظی معانی دینا۔ جب استعارہ کو حقیقت اور واقعہ مان لیا جائے تو ظاہر ہے کہ اس سے پاگل پن ہی پیدا ہوگا۔ میرے لیے اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں تھی کہ اس سب کے پیچھے اسامہ بن لادن ہے۔ کئی سال پہلے پشاور میں مجاہدین کے ایک گروپ سے جمیری ملاقات ہوئی تھی تو میں نے اسامہ کی آنکھوں میں جو چمک دیکھی تھی وہ اب تک اُسی طرح برقرار تھی۔ اس ملاقات میں بار بار ایک لفظ کہا جا رہا تھا ''ناممکن۔'' کسی مسئلے پر بھی بات نہیں ہوسکتی۔ ہر بات ناممکن ہے۔ کسی لفظ کو گوشت پوست کی شکل دینے کے لیے انسان میں الوہی طاقت ہونا چاہیے۔ ان لوگوں نے یہ طاقت حاصل کر رکھی تھی۔ انہوں نے اس قسم کے بنیادی سوال پر غور کرنا ترک کر دیا تھا؟؟ ہم کون ہیں؟'' ہم کیوں ہیں؟'' ''ہم کہاں جارہے ہیں؟'' بنی نوع انسان کا مقصد کیا ہے؟'' ان لوگوں کے پاس ان سوالوں کے بنے بنائے جواب تھے۔ اس کے سوا اور کچھ وہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔

۹ مارچ ۲۰۰۲ء میں ایک فلسطینی خودکش بمبار نے مغربی یروشلم کے ایک پر ہجوم کیفے میں اپنے آپ کو دھماکے سے اڑا لیا۔ اس سے بارہ آدمی ہلاک اور باون زخمی ہوگئے۔ دوسرے دن دنیا بھر کے ٹی وی چینلز نے اس کی ویڈیو دکھائی۔ ایک باریش نوجوان ہاتھ میں کلاشنکوف لیے سبز پرچم کے سامنے کھڑا ہے۔ پرچم پر اللہ اکبر لکھا ہوا ہے اور وہ کہہ رہا ہے ''اللہ کے فضل سے میں زندہ شہید ہوں۔ میں عزالدین قاسم کے جتھہ کا بیٹا ہوں۔ میرا نام محمد بکری فرحت ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالی میری یہ قربانی قبول کرلے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے میرے شہید بھائیوں سے ملا دے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالی مجھے جنت الفردوس میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت سے سرفراز فرمائے۔'' ویڈیو دیکھ کر میں تھر تھر کانپنے لگا۔ اس دن بہت سردی پڑ رہی تھی مگر پھر بھی میں باہر نکل گیا۔

کئی سال پہلے میری ماں نے بتایا تھا کہ قرآن میں جنت کا ذکر تمثیل کے طور پر کیا گیا ہے۔ خود قرآن جنت کی تفصیل تشبیہات اور استعاروں میں بیان کرتا ہے جس سے ہمارے تخیل کو جلا ملتی ہے۔ جنت کی جن حوروں کا ذکر آتا ہے اور جنہیں غلطی سے کنواری تسلیم کرلیا گیا ہے ان کا نام ہرن کی آنکھ سے لیا گیا ہے جس کی بڑی سی کالی پتلی اور سفیدی میں بہت واضح فرق ہوتا

ہے۔ وہ خوبصورتی اور معصومیت کی علامت ہیں۔ ان آنکھوں نے کبھی کسی گناہ پر نظر نہیں ڈالی۔ کلاسیکی عربی فارسی اور اردو شاعری میں حور کو اکثر چاند یا سورج کی علامت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یعنی دو سماوی آنکھیں جن میں سے ایک روشنی لیتی ہے اور دوسری وہ روشنی منعکس کرتی ہے اور یہ آنکھیں دنیا کے فانی انسانوں پر نگراں ہوتی ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ جنت کے باغوں میں بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں ہوں گی جو بیکار باتیں نہیں سنتیں اور جو گناہ پر آمادہ نہیں کرتیں، صرف ''سکون سکون'' پکارتی ہیں۔ چنانچہ کرۂ ارض پر معصومیت، حسن اور امن کا بول بالا ہونا چاہیے۔ میں نے اپنی ماں سے سیکھا کہ مرکزی استعارہ باغ بہشت ہے جس کا ذکر قرآن میں ایک سو تیس مرتبہ آیا ہے۔ لیکن جنت ہماری طرح کا باغ بھی نہیں ہے کیونکہ اس میں فوارے اچھل رہے ہیں۔ پانی بہہ رہا ہے اور دودھ اور شہد کی نہریں بہہ رہی ہیں۔ وہاں شراب طہور اور مصفا شہد کے دریا بھی ہیں۔ اس باغ میں ہر قسم کے پھل بھی ہیں۔ وہ ایسی جگہ ہے جہاں جوانی کو زوال نہیں آتا۔ وہ جسمانی خواہشات سے آزادی کی دنیا ہے۔ وہ امتزاج اور تنوع کی دنیا ہے (وہاں انسانوں کے علاوہ فرشتے، جن اور حوریں بھی ہوں گی۔ اس کے علاوہ ہر قسم کے پھل پھول بھی ہوں گے)۔ قرآن کے لفظ جنت کا مطلب ہے ''چادر ڈالنا اور ڈھانک لینا۔'' جس طرح باغ ہمیں اردگرد کی گرمی اور آلودگی سے بچاتا ہے اسی طرح جنت بھی جہنم کی گرمی سے محفوظ رکھتی ہے۔

جنت کے قرآنی تصور میں احادیث کی دلچسپ صراحت کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ یہاں بھی استعارے ہی استعارے ہیں۔ ایک حدیث میں جنت کے ایک پیڑ کا ذکر ہے جو اتنا وسیع و عریض ہے کہ اس کے سائے میں صدیوں چلتے رہیں تب بھی ااس کے آخری سرے تک نہ پہنچ سکیں۔ ایک اور حدیث میں مبارک شیریں مشک کا ذکر ہے۔ ایک حدیث میں چاندی کی اینٹوں والے باغ کا تذکرہ ہے۔ یہ اینٹیں خوشبودار مسالے سے جڑی ہوئی ہیں۔ آنحضرتؐ نے یہ جانتے ہوئے کہ ہم اپنی محدود عقل اور دنیوی بصارت کے مطابق ہی ان باتوں کو سمجھ سکتے ہیں، اس دنیا اور انسانی جسم کی تمثیل ہی استعمال کی ہے اور مزید تفصیل بیان نہیں کی کیونکہ تمثیل بہر حال تمثیل ہی ہوتی ہے اور کوئی بھی استعارہ اصل کی جگہ نہیں لے سکتا۔ اس طرح وہ بتاتے ہیں کہ وہاں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو دنیا میں موجود ہو، سوائے ناموں کے۔ اس باغ میں جو چیزیں ہیں انہیں اس سے پہلے کسی آنکھ نے نہیں دیکھا، کسی کان نے نہیں سنا کسی ناک نے نہیں

سونگھا، کسی جسم نے اس کا تجربہ نہیں کیا اور کسی دماغ نے ان کا ادراک نہیں کیا۔ اس سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ ہماری زبان و بیان کی ناکامی ہے۔ گویا آخرت کی جس دنیا کا ذکر کیا جارہا ہے ہمارے حواس خمسہ اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

جنت کو سمجھنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اسے جہنم کے برعکس یا جہنم کے متضاد کہا جائے۔ قرآن نے جہنم کو اس کے مخالف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ یہاں آگ جہنم کا بنیادی استعارہ ہے۔ جنت ٹھنڈی ہے جہنم گرم۔ جنت پانی ہے اور جہنم وہ جگہ ہے جہاں پیاس ہی پیاس ہے۔ جہنم بھوک ہے اور جنت وہ مقام ہے جہاں ہر قسم کے پھل ہیں، جنت قلب مطمئنہ ہے اور جہنم دائمی پچھتاوا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ جہنم خدا سے الگ ہے اور جنت اس کی قربت۔

جنت اور جہنم ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ یہ ہے اسلام میں آخرت کا تصور۔ آخرت میں بیماری، مشقت، اذیت، محبت، خوشی اور غم، موت اور زمانہ نیز تبدیلی اور تغیر کی پریشانیوں کا خاتمہ ہوجائے گا۔ خوشی اور غم اپنے اپنے راستے پر چلے جائیں گے۔ خوشی جنت میں اور غم جہنم میں۔ اس دنیا اور آخرت کے درمیان کا جو زمانہ ہے وہ روز محشر ہوگا جب ہر شخص اپنے اعمال کی جزا یا سزا پائے گا۔

ہماری دنیاوی زندگی کے جو اعمال ہیں اس دن ان کا امتحان ہوگا۔ انہیں عبادات، خدمت خلق، انکساری، رواداری اور علم و عدل کی جستجو کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا۔ مسلمان عجز و انکساری کے ساتھ نماز کے لیے خدا کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو اس کے سامنے یہی تصور ہوتا ہے۔ نماز پڑھنے کے لیے مسجدوں میں جو قالین ڈالے جاتے ہیں یا گھروں میں جو جائے نماز ہوتی ہیں انہیں آسمانی تمثیلوں سے مزین کیا جاتا ہے۔ ایک بار میں امریکی ریاست نیوہیمشر کے شہر ہینوور میں ڈارمتھ کالج کے ہوڈ میوزیم آف آرٹ میں ایک نمائش دیکھنے گیا تھا۔ اس نمائش کا عنوان تھا ''اسلامی آرٹ میں جنت کی تماثیل۔'' وہاں قالین اور جائے نماز رکھے گئے تھے۔ ان سب میں یہی استعارے اور تماثیل تھیں۔ وہاں سب سے اہم قالین چہار باغ ڈیزائن کا تھا۔ وہ قالین فردوس (یا چار دیواری میں بند باغ) کی تصویر پیش کر رہا تھا۔ ایران، ترکی اور مغل ہندوستان کے جو دوسرے قالین اور جائے نماز تھیں ان میں محرابیں پیڑ، پودے اور پھول اس طرح وافر انداز میں تھے جیسے نماز پڑھنے والے کو جنت کی سیر کرائی جارہی ہے۔ بعض اشیا ایسی بھی تھیں جن میں استعاروں کی متنوع جہات پیش کی گئی تھیں۔ لیکن وہ ایسی تھیں جو پہلی ہی نظر

میں واضح ہو جاتی تھیں۔ مثال کے طور پر مسجد کا ایک قندیل صرف روشنی کے لیے ہی نہیں تھا کہ وہ شیشہ کا بنا ہوا تھا، درمیان سے گول، اوپر کی جانب پھیلتا ہوا اور چھوٹا سا گول پیندا۔ لیکن جس انداز سے اسے بنایا گیا تھا وہ الوہی نور اور ہر جگہ خدا کی موجودگی ظاہر کر رہا تھا۔ اس پر جو قرآن کی آیات لکھی تھیں وہ اسے اور بھی واضح کر رہی تھیں۔

اللہ تعالیٰ نور (ہدایت) ہے آسمانوں اور زمین کا
اس کے نور (ہدایت) کی حالت ایسی ہے جیسے (فرض کرو) ایک طاق ہے
اور اس میں ایک چراغ رکھا ہے اور وہ چراغ ایک قندیل میں رکھا ہے
اور وہ قندیل ایک طاق میں رکھا ہے
اور وہ قندیل ایسا صاف شفاف ہے جیسے ایک چمک دار ستارہ ہو
اور وہ چراغ ایک مفید درخت (کے تیل) سے روشن کیا جاتا ہے
کہ وہ درخت زیتون کا ہے، جو نہ پورب رخ ہے اور نہ پچھم رخ
اس کا تیل اس قدر صاف اور سلگنے والا ہے کہ اگر اس کو آگ بھی نہ چھوئے
تب بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بخود جل اٹھے گا
اور جب آگ بھی لگ گئی تب تو نور علی نور ہے
اللہ تعالیٰ اپنے اس نور (ہدایت) تک جس کو چاہتا ہے راہ دے دیتا ہے
اور اللہ لوگوں کی ہدایت کے لیے یہ مثالیں بیان فرماتا ہے۔
اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے

(۳۵:۲۴) ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی

تمثیل اور استعاروں کا یہ کھیل ہم ہر اسلامی فن پارے میں دیکھ سکتے ہیں چاہے وہ ظروف سازی ہو، یا پینٹنگ، کتابوں کی جلد سازی ہو یا دھات کے برتن، مٹی کی ٹائلز ہوں یا فن تعمیر اور خطاطی ہو یا کپڑے کی بنائی، سب میں یہ تمثیلیں جا بجا بکھری نظر آئیں گی۔ البتہ آج کے مسلمان یہ استعارے نہیں پڑھ سکتے۔ اسی لیے بہت سے لوگوں نے اب آرٹ کو ہی حرام قرار دے دیا ہے۔ یہ استعارے پڑھنے کی اہلیت سے محروم ہونے کی بھی تاریخی اسباب ہیں۔

ہوڈ میوزیم میں جو فن پارے رکھے گئے تھے ان میں مجھے سب سے زیادہ جس فن

پارے نے متاثر کیا وہ ایک منی ایچر تھا جس کا عنوان تھا ''دنیاوی اور آسمانی بدمستی کی تمثیل۔'' یہ دیوان حافظ کا قلمی خاکہ تھا جو سولھویں صدی میں بنایا گیا تھا۔تصویر میں شراب کے نشے میں مست شاعر ایک ہاتھ میں کتاب لیے شہ نشیں میں بیٹھا نیچے خوشیاں منانے والے لوگوں کو دیکھ رہا ہے۔ مذہبی علمائکا ایک گروہ، موسیقاروں کا طائفہ، بھیانک شکلوں والے فقیروں کی ٹولی اور بہت سے دوسرے لوگ ناچ گانے میں مست ہیں اور نشے میں ایک دوسرے پر گر رہے ہیں۔ ادھر چھت پر پانچ فرشتے بیٹھے شراب نوشی میں مصروف ہیں۔تصویر پر حافظ کا شعر بھی لکھا ہے۔

متصوّفانہ شاعری میں شراب ایک مستقل استعارہ ہے۔لیکن جنت میں اچھا وقت گزارنا ایسا نہیں ہے جیسے دنیا میں اچھا وقت گزارنا۔ دنیا میں شراب کی مستی کو بالکل ہی مختلف انداز میں دیکھا جاتا ہے۔صوفی خدا کی محبت میں سرشار ہوتا ہے۔البتہ مصوّر نے شاعر کے متصوّفانہ مقصد کو مسخ کر دیا ہے۔ اس کے نزدیک فقیروں کے بھیانک چہروں پر پھیلی یک سطحی بدمستی اس دنیاوی بدمستی سے مختلف نہیں ہے جس کے لیے کٹر مذہبی علما نے قاعدے قانون بنا رکھے ہیں۔ ان کے چہروں پر جو بدمستی کے تاثرات ہیں وہ بہت کچھ کہہ رہے ہیں۔ ارضی جنت کی تلاش کا راستہ کٹر مذہبی عقائد کی طرف جاتا ہے اور نہ صوفیاء کے حلقوں کی طرف۔ میں آرٹسٹ کے ساتھ ہوں۔ اس کی مصورانہ تمثیل اور میری تلاش ایک ہی راستے کی نشان دہی کرتے ہیں۔ہمیں کسی اور طرف دیکھنا چاہیے۔

لیکن آج کی مسلم دنیا پر پیروں فقیروں اور دقیانوسی فکر رکھنے والے مختلف فرقوں اور گروہوں کا قبضہ ہے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ مسلم صوفیاء کی دنیا بہت ہی خود غرض دنیا ہے۔ (تصوّف بالآخر انا کا سفر ہی تو ہے) ظاہر دار (صوفی نہایت ہی آمرانہ مزاج کا مالک ہوتا ہے) ایک ایسا سایہ، ایک ایسا ہیولہ جو صرف اندھیرے میں ہی دیکھا جا سکتا ہے اور جو ہم بھی بن سکتے ہیں۔ لفظ پرستوں کی دنیا خشک، ہولناک اور بالکل بے جان ہے۔ ایک اپنی انا میں گم ہے تو دوسرا قرون وسطیٰ کی ذہنیت کا شکار ہے۔ دونوں ہی غلطی پر ہیں اور خطرناک حد تک نشے میں دھت ہیں۔

سماوی اور دنیاوی بدمستی کی تمثیل ہمیں دوسری ہی دنیا دکھاتی ہے۔استعاروں کی متوازن دنیا، شاندار، بالغ اور بامعنی دنیا۔ یہ متنوّع جہات کی دُنیا ہے۔ تمثیل کا دو جہاتی مظہر کئی سطح پر اپنا اظہار کرتا ہے۔ایک ایسی دنیا جہاں دنیاوی اقدار خیال کی آزادی کے ساتھ مل کر حسن اور تخلیقی

صلاحیت کو جنم دیتی ہیں اور جہاں اسلام ایک ایسے کھلے نظام کے طور پر سامنے آتا ہے جس میں تنوع اور رنگا رنگی ہے۔ یہ اس فردوس بریں کا تصور ہے میں جس کی تلاش میں نکلا تھا۔

اور مجھے جو ملا وہ بالکل ہی مختلف تھا۔ اکثر مسلمان سمجھتے ہیں کہ جنت ایک ایسا زمین کا ٹکڑا ہے جسے وہ نیک اعمال کی دولت جمع کر کے خرید سکتے ہیں اور نیک اعمال یہ ہیں کہ شریعت کا دقیانوسی تصور رائج کیا جائے، فنون لطیفہ، ادب اور کلچر پر پابندی لگا دی جائے اور اسلام کے نام پر دوسروں کو قتل کیا جائے یا خود قتل ہو جائیں۔ اس مفروضہ دولت کا حصول ہی زندگی کا مقصد بن گیا ہے۔ چنانچہ فردوس کا قرآنی تصور دنیاوی جہنم کا تصوّر بن کر رہ گیا ہے۔ یہ جہنم قتل و خوں ریزی، ریاکاری، سختی، سنسر شپ اور یبوست زدگی کا مقام بن گیا ہے۔ شر انہی مقامات پر پنپتا ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ ''یہاں شر کا قلع قمع کر دیا گیا ہے۔'' اس سے زیادہ قرآن کی روح کے خلاف اور کوئی بات نہیں ہو سکتی۔

میری جستجو اور میرے سفر نے مجھے اس نتیجے پر پہنچایا کہ مسلمانوں کی جنت کوئی ایسا مقام یا منزل نہیں ہے جہاں ہم پہنچتے ہیں بلکہ وہ سفر کرنے کا طریقہ اور انداز ہے۔ جس طرح ہم زندہ رہنا ترک نہیں کر سکتے اسی طرح ہم اپنی جنت کی تلاش بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ لیکن یہ تلاش اپنے آپ کو از سر نو تخلیق کرنے کا مسلسل عمل ہے۔ میں نے جو ناکام جنتیں دیکھیں وہ سب منزل پر پہنچنے کے عقیدے پر قائم تھیں۔ اس لیے لوگوں کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ کسی بات پر شک نہ کریں اور آنکھیں بند کر کے ہر بات مان لیں۔ لیکن سفر اور تلاش و جستجو مستقل توجہ، گہرے مشاہدے اور شک کا تقاضہ کرتی ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ہر لمحہ بدلتے منظر اور ماحول میں جو راستہ اختیار کیا گیا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں۔ اسی لیے راستے کے نقشے میں برابر ترمیم کی جاتی رہتی ہے۔ اسے حالات کے مطابق ڈھالا جاتا رہتا ہے پہلے جن کونوں کھدروں کی طرف توجہ نہیں کی گئی تھی ان پر توجہ دی جاتی ہے۔ قرآن کے طاقت ور استعاروں نے میرے سفر میں رہنمائی کی۔ انہوں نے ایسے پیکر اور ایسے خیالات فراہم کیے جن کی روشنی میں میں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ اس کے مطابق میں نے عمل کیا۔ ایسے استعارے جن کے دائرے میں میں نے غور و خوض کیا، ایسی تمثیلیں جنہیں میں نے سمجھنے اور ان سے معانی اخذ کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے مجھے نئی دنیا تخلیق کرنے کی بصیرت عطا کی۔ انہوں نے مجھے خبردار کیا ان چیزوں سے جو ہو سکتی ہیں اور اس کی امید دلائی کہ کیا ہوگا اور اگرچہ میں ناکام ہو گیا ہوں لیکن میرا سفر جاری ہے۔

ناکامی ہی ہمیں انسان بناتی ہے۔ اگر آپ کو یہ احساس ہوجائے کہ آپ نے غلطی کی ہے اور آپ ناکام ہوگئے ہیں تو یہ احساس ہی نئی دنیا تخلیق کرنے کی بنیاد بن جائے گا۔
۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے المیہ کے بعد مجھے FOSIS کے ایک پرانے دوست غیاث الدین صدیقی کا ٹیلی فون آیا۔ قریب بیس سال سے ہماری بات نہیں ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ غیاث الدین کلیم صدیقی کے ساتھ مسلم انسٹی ٹیوٹ میں ڈپٹی ڈائریکٹر کی حیثیت سے شامل ہوگیا تھا۔ دونوں صدیقی ایرانی انقلاب کے زبردست حامی تھے۔ جب کلیم صدیقی نے مجھ سے کہا تھا کہ تم ایران جا کر جمہوریت کے لیے کام کرو اور میرے انکار پر یہ کہہ کر مجھے انسٹی ٹیوٹ سے نکال دیا تھا کہ اگر پھر تم نے یہاں قدم رکھا تو تمہاری ٹانگیں توڑ دی جائیں گی تو غیاث الدین خاموشی سے کھڑا تماشہ دیکھتا رہا تھا۔ ۱۹۹۶ء میں کلیم صدیقی کے انتقال کے بعد غیاث مسلم انسٹی ٹیوٹ کا ڈائریکٹر بن گیا تھا۔
''سنو'' اس نے کہا۔ ''پہلے ہمارے اختلافات تھے۔ مگر اب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم غلطی پر تھے۔ ہم سے بہت بڑی غلطی ہوئی۔'' پہلے غیاث الدین مجھے جھجکنے اور ہچکچانے والا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ کوئی بھی بات کرنے سے پہلے وہ ہچکچاتا تھا۔ مگر اب مجھے اس کے اندر جھجک معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ اس دن وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ ''ہم نے اپنے آپ کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ہماری لفظ پرست، بنیاد پرست اور انقلابی تشریحات حق اور یقین کے برخود غلط اور متکبرانہ تصور پر قائم تھیں۔'' اس نے اعتراف کیا۔ اس کے بعد وہ کافی دیر خاموش رہا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا مگر سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہوں۔ ''سنو'' غیاث الدین پھر بولا ''تم صحیح تھے۔ ہم اپنی اخلاقی برتری کے بہت دعوے کرتے تھے لیکن ہم غلط تھے۔ مسلم انسٹی ٹیوٹ میں تمہارے ساتھ جو ہوا اس کے لیے میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔'' اس طرح برسوں کا جھگڑا ختم ہوگیا۔
غیاث الدین بدل چکا تھا۔ کٹر پن، عدم رواداری اور اپنی اخلاقی برتری کا احساس جا چکا تھا۔ اب وہ مسکراتا بھی تھا اور ہنستا بھی خوب تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں دوستی کی حرارت اور انکساری تھی۔ یہ احساس موجود تھا کہ ہم سے شدید غلطی ہوئی ہے۔ غیاث الدین دوبارہ انسان بن گیا تھا۔ میں نے سوچا اگر آدھا موقع بھی ملے تو انسانیت دوبارہ اپنا آپ منواتی ہے۔ ہم لندن میں مسلم ہیری ٹیج سنٹر کینسنگٹن میں ایک ہفتے کی شام کو بیٹھے تھے۔ غیاث الدین نے کہا ''ہم مسلم امت کی رکنیت سے استعفیٰ نہیں دے سکتے۔ ہم ہمیشہ مسلم

برداری کا حصہ رہیں گے ۔ ہم اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچانے کی فکر میں دنیا کے جلنے کا تماشہ نہیں دیکھ سکتے ۔ مسلم مفکر اور دانشور کی حیثیت سے ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم مستقبل کی مسلم تہذیب کی تخلیق کے لیے اپنی کوششیں تیز کردیں ۔ایک قرآنی جنت، امتزاج اور تنوع، حسن تخیل، سبزہ زار اور آزادی جس کا بنیادی نظام ہو۔'' اس نے مجھے رضامند کرلیا کہ میں مسلمانوں کے اس سرکل میں شامل ہوجاؤں جس کے ہر مہینے اجلاس ہوں گے اور جہاں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں غور وفکر کیا جائے گا۔

مختلف لوگوں کے اس گروپ میں بہت سے پرانے دوست بھی تھے اور کچھ نوجوان دانشور اور اسکالر بھی تھے جو میرے دوست بن گئے ۔ہم دقیانوسی خیالات اور نعرہ بازی کے خلاف تھے۔ ہم سب میں انسان دوستی کا جذبہ مشترک تھا۔اس تصوّر کی بنیادیں اسلامی تاریخ اور روایات میں گڑی ہوئی تھیں جہاں ادبی، فنی، سائنسی اور اخلاقی فکر کا سرچشمہ باغ اور جنت کا مرکزی استعارہ تھا۔ ہم موجودہ زمانے کے حالات کی روشنی میں قرآن کی نئی تفسیر اور تعبیر کرنا چاہتے تھے۔ ہر مہینے اس موضوع پر گرما گرم بحث ہوتی کہ قرآن نے جنت کا جو تصور پیش کیا ہے اس کی بنیاد پر نئی مسلم تہذیب کی تشکیل کیسے کی جاسکتی ہے ۔اس تہذیب میں نظام حکومت کیا ہوگا؟ ثقافتی رنگا رنگی اور لسانی اور علاقائی خود مختاری کی ضمانت کیسے دی جائے گی؟اس فردوس نما تہذیب میں صحیح معنی میں آزادئ فکر کو فروغ دیا جائے گا ۔ اس تہذیب میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا اسٹائل اور مواد کیا ہوگا؟ اس وقت جب مسلم دنیا آمریت اور فکری انتشار میں گھری ہوئی ہے ہم یہاں سے وہاں کیسے جائیں گے جہاں مستند ثقافتی اور نامیاتی کثرت پسندی موجود ہوگی۔ہم عبوری دور سے کیسے گزریں گے؟ یہ نئے سوالات نہیں تھے صرف ان پر غور کرنے کا انداز نیا تھا۔

پچھلی گرمیوں میں ایک اتوار کو حسب عادت میں اخباروں کے مطالعے میں مصروف تھا کہ میری نظر تہران یونیورسٹی میں تاریخ کے لیکچرر ہاشم آغا جری کی خبر پر پڑی۔ وہ عراق ایران جنگ میں اپنی ایک ٹانگ گنوا چکے تھے ۔ انہوں نے ایک تقریر میں کہا کہ آنکھیں بند کرکے ملاؤں کی تقلید کرنے کے بجائے ہر نسل کو اسلام کی اپنی تشریح کرنی چاہیے۔ یہ وہ دلیل تھی جو میں نے پچیس سال پہلے اپنی کتاب The Future of Mislim Civilisation میں پیش کی تھی ۔آغا جری کے اس بیان کی بنا پر ان پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا تھا اور انہیں موت کی سزا سنائی گئی

تھی۔ ایک اور خبر یہ تھی کہ نائجیریا کی ریاست کتسینا میں شرعی عدالت نے ایک مسلمان عورت صفیہ حسینی کو سنگ سار کرنے کی سزا کے خلاف اپیل منظور کر لی تھی۔ اسے ایک اور عدالت نے بدکاری کے جرم میں سنگ سار کرنے کی سزا سنائی تھی۔ وہ سزا اس لیے منسوخ کردی گئی کہ مبینہ جرم نائجیریا میں شرعی قانون نافذ ہونے سے پہلے سرزد ہوا تھا۔ لیکن ایک اور شرعی عدالت نے ایک عورت امینہ لاوال کو اس وجہ سے سنگ سار کرنے کی سزا سنائی کہ اس نے اقرار کرلیا تھا کہ اس کا بچہ طلاق کے بعد پیدا ہوا۔

میں نے مطالعہ کے کمرے میں گھومنا شروع کردیا۔ میں ان پریشان کن خبروں سے توجہ ہٹانا چاہتا تھا۔ ایک الماری میں مجھے The Best of Dorothy Parker کتاب نظر آئی۔ کتاب میں ہیلن اسمتھسن کی خوبصورت ڈرائنگز تھیں۔ اس کا سلور کلر کا سرورق بہت ہی دلکش تھا جس میں مین ہٹن کے آسمان کا سایہ سا تھا اور اس آسمان میں بہت چیزیں اڑ رہی تھیں۔ کہیں ٹوپی اور ہیٹ اڑ رہے تھے تو کہیں آرام کرسی۔ کہیں دستانے اڑ رہے تھے تو کہیں نازک سے جوتے۔ ایک چائے دانی بھی اڑ رہی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی اس میں دو نشستوں والا دوسری جنگ عظیم میں کام آنے والا ہوائی جہاز بھی تھا جو سیدھا ایک اسکائی اسکریپر کی طرف جارہا تھا۔ میں باغیچے میں گیا اور ایک مضمون A Telephone Call پڑھنے لگا۔ اسی وقت میرل کا فون آیا اور اس دن کا پہلا سوال کیا ''اب ہم کیا کریں گے؟''

میں نے جواب دیا ''ہم وہی کریں گے جو اب تک کرتے رہے ہیں۔ ہنسو اور جد وجہد کرتے رہو اور حسب معمول ہماری جنگ کتابوں کے ذریعہ ہی ہوگی۔''

میرل نے کہا ''اور میرا خیال ہے ہمیں داڑھی منڈھے لوگوں کا ایک اور گروہ تلاش کرنا پڑے گا۔'' میں جواب دینے ہی والا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔

میں نے دروازہ کھولا تو دو نوجوان کھڑے تھے۔ ایک تو داڑھی کے بغیر تھا دوسرے کے داڑھی تھی مگر وہ بھی غور سے دیکھنے پر ہی نظر آتی تھی۔ سلام علیکم انہوں نے کہا۔ میں انہیں باغیچے میں لے گیا۔ میں انہیں جانتا تھا۔ دبلا پتلا خوبصورت سا احسان مسعود جو میں پینتیس سال کا ہوگا میری طرح کچھ عرصے صحافی رہا تھا۔ جن دنوں وہ برطانوی مسلم نوجوانوں کے اخبار کیو نیوز کا نیوز ایڈیٹر تھا اس وقت اس سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد وہ رسالہ نیچر میں سائنس رپورٹر بن گیا تھا۔ اس کے بعد وہ نیو سائنٹسٹ رسالے میں چلا گیا تھا۔ اس

کے ساتھ جو صاحب آئے تھے وہ تھے شمیم میاں۔ بھاری بھرکم شمیم میاں کے قہقہے زبردست ہوتے تھے۔ جون ۲۰۰۲ء میں جو نسلی فسادات پھوٹ پڑے تھے ان دنوں اولڈہم کی سڑکوں پر ان سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اولڈہم کالج میں سوشیالوجی پڑھاتے تھے اور ڈاکٹریٹ کی تیاری بھی کررہے تھے۔ ہم تینوں باغیچے میں بیٹھے چائے اور سموسوں کے مزے لیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔

''ضیا بھائی'' جب ہماری گپ شپ لمبی ہوگئی تو شمیم بولے ''ہم آپ سے مدد لینے آئے ہیں۔''

''مدد؟ کیسی مدد؟'' میں نے ظاہر کیا جیسے مجھے اس پر حیرت ہوئی ہے۔

''مسلمانوں کو بدلنے کے لیے۔'' احسان فوراً بول پڑا۔

میں نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر ان کے چہروں کو دیکھا۔ وہاں وہی جذبہ کی شدّت، ایثار، تفکر، الجھن اور وہ تمام توقعات نظر آرہی تھیں جو میں اپنی جوانی میں اپنے دل میں لیے پھرتا تھا۔

گویا اب پھر سفر شروع ہوگیا؟ میں نے سوچا۔ میں اپنے استعاروں کے سہارے زندہ رہنے کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتا اور ایک بار پھر نئے اور پرانے دوستوں کے ساتھ میں نئے سفر پر روانہ ہوگیا۔

مگر یہ ایک اور کہانی ہے۔

تقریباً سب مذاہب نے انسان کو جنت کا تصور دیا ہے، یعنی اس دنیا کے بعد ایک ایسی جگہ کا تصور جہاں اسے ہر طرح کا عیش و آرام میسر ہوگا اور اس دنیا کے سارے دکھ اور کلفتیں پیچھے رہ جائیں گی۔ اسلام نے جنت کا جو تصور قرآن میں پیش کیا ہے وہ ایک تو بہت مفصل ہے دوسرے وہ بہت تکرار کے ساتھ پڑھنے والے کے سامنے آتا ہے۔ چنانچہ ہر مسلمان کے دل میں عمر بھر یہ خواہش رہی رہتی ہے کہ مرنے کے بعد اسے جنت نصیب ہو۔ ایک روایت سے اس امر کا اشارہ ملتا ہے کہ ایک مسلمان چاہے اس نے زندگی میں برے کام ہی زیادہ کیے ہوں، کچھ عرصہ سزا بھگتنے کے بعد بالآخر جنت میں لے جایا جائے گا۔

ضیاء الدین سردار جنت کی تلاش کے سلسلے میں کئی ممالک میں گئے اور ان کے [illegible] خصوصیت سے وہاں کے اسلام کی کارگزاریوں کا بہت قریب سے مطالعہ کیا اور اپنے تجربے سے یہ دیکھا کہ مسلم ارباب اختیار اپنے رویوں میں کتنے ہلاک، کتنے بے حس اور ایذا پسند ہو سکتے ہیں۔ وہ اپنے کار منصبی کے چلانے میں کتنی سستی، کتنی بے پروائی اور کتنی نالائقی کا ثبوت دے سکتے ہیں۔

یہ ضیاء الدین سردار کی انگریزی کتاب Desperately Seeking Paradise کا اردو ترجمہ ہے جو تین سال ہوئے لندن سے شائع ہوئی۔ ضیاء الدین سردار (پیدائش ۱۹۵۱) لندن میں مقیم ایک اسکالر ہیں جو اسلام کے مستقبل نیز اسلامی سائنس اور ٹیکنالوجی سے متعلق موضوعات پر لکھتے رہتے ہیں۔ ان کے کالم اتوار کو شائع ہونے والے برطانوی اخبار The Observer میں، نیز ایک دوسرے ہفت روزہ New Statesman میں چھپتے ہیں۔ اس وقت وہ سٹی یونیورسٹی لندن میں ایک وزٹنگ پروفیسر ہیں اور اسلام، سائنسی پالیسی، ثقافتی امور اور ان سے وابستہ موضوعات پر چالیس سے زیادہ کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ انہیں ۲۰۰۵ء میں یونیورسٹی آف ایسٹ لندن سے ڈاکٹر آف لیٹرز کی اعزازی ڈگری بھی دی گئی۔ وہ رسالے Futures کے مدیر ہیں اور ایک اور رسالے Third Text میں بھی وہ دوسروں کے ساتھ مل کر ادارت کا کام کرتے ہیں۔

ISBN: 978-969-568-024-7

Pak Rs: 240/-